

شری کانت

ناول

PDFBOOKSFREE.PK



طارق اسمعیل ساگر

شری کانت

.....ناول.....

طارق اسماعیل ساگر



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

سیونہ سکائی پبلی کیشنز

غزنی سٹریٹ، الحمد مارکیٹ، 40- اردو بازار، لاہور فون: 7223584

پیش لفظ

”شری کانت“ بنگالی ادب کا شاہکار ناول ہے۔ جسے معروف بنگالی ناول نگار، فلسفی، سیاح اور ماہر نفسیات شرٹ بابو نے لکھا تھا جس کا ترجمہ دنیا کی ہر قابل ذکر زبان میں ہو چکا ہے۔ آج سے شاید پچپن سال پہلے مئی رام دیوانہ نے اس ناول کا ترجمہ اردو زبان میں کیا تھا جس کے چند اوراق مجھے کہیں ملے اور ناول بڑھنے کی جستجو ہوئی تو میں نے اس کا انگریزی اور گورکھی ترجمہ دیکھا۔ اس ناول کا بلاشبہ دنیا کے بہترین ناولوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ شاید اس نوعیت کا سفر نامہ بہت کم زبانوں میں لکھا گیا ہوگا۔ میں نے بیشتر ترجمہ مئی رام دیوانہ کا ہی استعمال کیا ہے صرف وہ حصہ جو نایاب ہے اسے انگریزی اور گورکھی سے اردو میں منتقل کر دیا ہے اور کوشش کی ہے کہ ترجمے کی زبان بھی وہی رہے جو عموماً ہندوستان میں تب بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

شری کانت، شرٹ بابو کی تمام تصانیف کی کنجی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح نیگور کے ناولوں میں گورا۔ یہ دونوں ہی ناول اپنے اپنے خیالات کے آئینہ دار ہیں۔ شرٹ بابو کے جذبات کا مکمل سلسلہ اور ان کے تمام کردار شری کانت میں ہیں۔ اور شاید کچھ قارئین کے لیے یہ بات تعجب خیز ہوگی کہ شرٹ نے جو کچھ بھی لکھا اور مختلف تصانیف میں جو خیالات دنیا کے سامنے پیش کیے یا اپنے ادب میں جن کرداروں کی تخلیق کی وہ کسی نہ کسی شکل میں شری کانت میں آپ کو ملیں گے شری کانت شرٹ بابو کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ شری کانت لکھتے وقت وہ خود اس ادبی دور میں کھڑے تھے جس میں سنسنی خیز واقعات کے بغیر ناول، ناول ہی نہیں سمجھے جاتے تھے جس کا اثر یہ ہوا کہ شری کانت کا آغاز انہوں نے نہایت سنسنی خیز کیا ہے۔ شروع سے ہی یکے بعد دیگرے دل دہلا دینے والے واقعات کا گھٹا ٹوپ ہے اور انہیں واقعات کے ساتھ یہ ناول آگے بڑھتا ہے۔

تاہم شرٹ بابو بلاشبہ اس خصوصیت کے علم بردار تسلیم کئے جاسکتے ہیں کہ جاسوسی۔ طلسمی اور بے بنیاد سنسنی خیز ناولوں کی مقبولیت کے دور میں بھی انہوں نے انسانی زندگی کی حقیقی حیرت اور سنسنی کو پیش کر کے با مذاق حضرات کے ادبی ذوق کو ٹھوس بنایا۔

شری کانت ان تمام سیاسی اور مجلسی الجھنوں، ضروریات اور زاویہ ہے نظر کا مجموعہ ہے جو اس

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	شری کانت
مصنف	طارق اعلیٰ ساگر
ناشر	مسعود مفتی۔ یاسر
مطبع	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
سن اشاعت	ستمبر 2006ء
قیمت	200/- روپے

اس کتاب کے کسی بھی حصے کی اشاعت، ترجمہ یا ذرائع ابلاغ کے لیے کسی بھی صورت میں استعمال کی سخت ممانعت ہے کتاب سے متعلق تبصرہ یا حوالہ کے لیے مصنف کی اجازت ضروری ہے۔ بصورت دیگر غیر قانونی حرکت کے مرتکب فرد یا ادارے کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ ہے۔

☆..... ملنے کا پتہ.....☆

سیونٹھ سکائی پبلی کیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔ اردو بازار، لاہور

فون: 7223584، موبائل 0300-4125230

علم و عرفان پبلشرز

34۔ اردو بازار، لاہور فون: 042-7352332-7232336

تمدنی ہے پریم چند کا عام طور پر سیاسی۔

شرت نے جس زمانہ میں اپنے ناولوں کا آغاز کیا اس وقت تک سماج کا سوال سیاسی بن کر نہیں آیا تھا۔ سیاسی پیمانے پر اس نے گاندھی دور میں ہی وسعت اختیار کی اس سے پیشتر مجلسی سوال ہی تھا۔ لیکن اب ایک بات ضرورت تھی کہ برصغیر سیاسی اصلاحات حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا مگر مجلسی اصلاحات کا کام خالص سماجی پیمانے پر ہو رہا تھا۔ دیانند (آریہ سماج) اور کیشپ چندر سین (برہم سماج) کی کوششوں نے ایک بیداری پیدا کر دی تھی۔ فشی پریم چند بھی اسی نئی بیداری کی طرف بڑھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بازار حسن میں ہم ان کی آریہ سماجی بیداری کا نمونہ دیکھتے ہیں۔ ان کی انہیں مجلسی سرگرمیوں نے آگے چل کر انہیں سیاسی مصنف بنادیا اور ہندو سوسائٹی کی بجائے ہندوستانی سوسائٹی ان کے پیش نظر رہی۔ اور اس طرح اخلاق اور قوم کے لئے انہوں نے اپنے قلم کا تمام زور صرف کر دیا۔ پریم چند کے متعلق ایک بات ہمیں ہمیشہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ ان کا نقطہ نظر سیاسی تو بن گیا لیکن سماج کے اخلاق کے متعلق ان کا نظریہ وہی قدیم رہا۔ اس کے برعکس شرت کا منہجائے مقصود ہندو تہذیب و تمدن سے معمور ولبریز تو ہے لیکن ان کا اخلاقی نظریہ قدیم نہیں کہا جاسکتا۔ وہ نئی الجھنوں کو نئے نظریہ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ شرت لکیر کے فقیر نہیں تھے اور نہ ہی ان کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستانی گھرانوں کی پرانی تہذیب کے تمام نشانات مٹا کر کوئی ایسا راستہ قائم کیا جائے جس سے زندگی کی تمام خوبصورتی تباہ ہو جائے۔ شرت وسطی زمانہ کے اوسط ہندو گھرانوں کے ناولسٹ ہیں ان کا ذاتی تجربہ ہی ان کے جذبات کا محرک رہا۔ وہ اس سوسائٹی کے فرد تھے جس کے متعلق انہوں نے اپنی تمام زندگی ایمانداری سے صرف کی۔ ان کی تنقید کسی غیر کا طعنہ نہیں بلکہ اپنی قوم کا دکھڑا ہے۔ وہ اسی سطح پر آ کر ہی انہیں اوپر اٹھانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی امکان بھر کوشش کی ہے کہ سوسائٹی میں آج جو خرابی واقع ہو چکی ہے وہ ہماری تہذیب کی خرابی نہیں بلکہ محروم تیز قد امت پسندی ہی اس کے لیے ذمہ دار ہے۔ لہذا ضرورت مجلسی اصلاح کی ہے نہ کہ تہذیب سے بیزاری کی۔ جو سماج قدمات پسندی اور اندھے اعتقاد سے موتیابند کا مریض بن چکا ہے اس میں انسانی فطرت کے جذبہ کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ نہایت سرعت سے تبدیل ہوتی ہوئی اس دنیا میں پیش آنے والے حالات کے لیے وہ اتنے زیادہ وسیع پیمانے پر تیار ہو سکے کہ پامال، مظلوم اور خارج شدہ افراد بھی اس سماج میں زندگی حاصل کر سکیں۔ شری کانت میں ابھی کہتی ہے..... ”دنیا کے تمام مرد و عورت ایک سانچے میں ڈھلے نہیں ہوتے ان کی کامیابی کی راہ بھی زندگی میں ایک نہیں ہوتی۔ ان کی تربیت، ان کی فطرت اور ان کے دل کی رفتار ایک ہی طرف چل کر انہیں کامیاب نہیں بنا سکتی۔ اس لیے سوسائٹی میں ان کا کوئی معقول انتظام ہونا چاہئے۔“

شرت یہی چاہتے تھے کہ غلطی سے جن لوگوں کو ہم نے ٹھکرا رکھا ہے ان کے رہنے کے لیے

میں دور میں جب یہ ناول لکھا گیا دکھائی پڑتے ہیں۔ گرم سدھار، اچھوت ادھار، ویشیاؤں کے متعلق ہمدردی، آزادی کی تڑپ، اپنی تہذیب کی حفاظت وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ سیاسی مسائل ہیں جنہیں سودیشی تحریک کی بیداری میں بنگال نے پایا تھا۔

شری کانت کا بنگالی نام ہے۔ (شری کانت بھرمین کہانی) اس ایک نام سے ہی اس ناول کا نقشہ سا آنکھوں کے سامنے کھج جاتا ہے۔ سیر و سیاحت کی کہانی کی شکل میں یہ ایک غیر معمولی آہنی ارادہ کردار کی داستان حیات ہے جس نے جوانی کی ابتدائی منزل میں ہی بیخوبی اور عزم بالجزم کا زرہ بکتر پہن کر زندگی کے ساتھ کھیل کھیلا ہے۔ راہنسن کرو سو، جس اضطراب اور فنی کاوشوں کا شکار ہو کر سیلانی بن گیا تھا۔ وہی جذبہ شری کانت میں بھی کام کر رہا ہے۔ لیکن راہنسن کرو سو کا عرصہ حیات شری کانت سے بالکل مختلف ہے۔ راہنسن کرو سو نے جنگل میں منگل منایا اور اپنے دماغ کی غیر معمولی قابلیت اور ذہن رساروشن طبع سے گھوم پھر کر پھر اسی سوسائٹی میں قیام پذیر ہوا جہاں سے وہ چلا تھا۔ وہ تو ایک سیلانی تھا۔ اس کے دل میں جغرافیائی تحقیق کی پیاس تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑوں نے، سمندروں نے، غاروں نے اس کی جرأت اور اس کے حوصلے کی آزمائشیں کی۔ لیکن ہمارا شری کانت سیلانی نہیں ہے۔ وہ تو ایک مسافر ہے۔ منزل حیات کا مسافر۔ جوش میں انڈی ندی۔ خوفناک شمشان، گہری تاریکی، دکھ درد، غم و آلام۔ ظلم و ستم۔ آزار اور امراض یہ سب اس منزل حیات کے راہی کی سرنگ کی دیواریں اور چھت ہیں۔ ان کے سب کے اندر ہی وہ مجلسی سطح پر گھوم پھر رہا ہے۔ اس سفر میں اسے مختلف ساتھی ملتے جا رہے ہیں ہر ایک کے سکھ دکھ کی کہانیاں اس کی زندگی کی کڑیاں بن کر جڑتی جا رہی ہیں۔

ان ہی چھوٹی بڑی کہانیوں کا مجموعہ یہ شری کانت ہے۔ گویا ایک ایسا ہار ہے جس کے لیے جگہ جگہ سے پھول حاصل کئے گئے ہیں۔ مختلف انسانوں کے درد و غم سے اس ہار کو پرویا گیا ہے۔ اس ہار میں اتنا درد اور اتنی کسک ہے کہ دل لرز اٹھتا ہے روح چیخ اٹھتی ہے۔ یہ ناول آج کی فضول اور جھوٹی مجلسی تفریق اور اس کے پاؤں تلے روندے ہوئے نزم و نازک غنچوں، ان کی پامال آرزوؤں، چکی اور ٹھکرائی ہوئی انسانیت کا ایک بھی کھاتا ہے۔ شرت بابو نے جس سیاہی سے اسے لکھا ہے اس میں کئی رنگوں کی آمیزش ہے۔ ہیئت۔ سنسنی۔ مزاح۔ طنز۔ رومان اور درد۔

شرت کی مضطرب روح نے دیکھا کہ ہماری مجلسی زندگی میں کم سنسنی نہیں۔ آئے دن جو واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں وہ صرف اخبارات کی وقتی کشش کا مضمون نہیں بلکہ ازل سے انسان کی ازلی ہمدردی اور توجہ کے مستحق ہیں۔ اسی مجلسی زندگی کے زیر اثر شرت ہندوستان کے اخلاق کو اور پریم چند..... ہندوستان کی اقتصادی بد حالی کو اپنی تصانیف میں پیش کرنے پر مجبور ہوئے۔ شرت کی مشکلات مجلسی خرابیوں سے پیدا ہوتی ہیں پریم چند کی اقتصادی بد حالیوں سے۔ اسی لیے شرت کا نقطہ نظر خالص

دیکھتے ہیں انسان کے اصلی جوہر یعنی انسانیت کے ارتقاء کو جس کو ایک مکالمے میں عورت کے چال چلن کے متعلق یوں کہا ہے۔ ستی پن کو میں حقیر نہیں سمجھتا لیکن صرف اسی کو عورت کی زندگی کا معراج اور نجات دہندہ فرض کر لینے کو بھی میں ایک غلط عقیدہ ہی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ انسانیت کو حاصل کرنا انسان کا قدرتی فرض اور پیدا کنشی حق ہے۔ ان سب کو بالائے طاق رکھ کر جو بھی، صرف ایک پہلو کو بڑا بنانے کی کوشش کرے گا وہ خود بھی دھوکہ میں رہے گا اور دوسروں کو بھی ایک فریب میں مبتلا کرے گا۔ وہ دوسرے انسان کو انسان بننے نہیں دیتا۔ وہ خود بھی اپنی لاعلمی میں انسانیت کو پیچ و پوچ بنا ڈالتا ہے۔“

شرت بابو نے زندگی کا سرچشمہ ہر زمانہ میں یا مال اور روندی ہوئی عورت کے دل میں ہی بہتا ہوا دیکھا ہے۔ ایک دن مرد نے پتھر کی الہیا کی نجات کی تھی لیکن آج خود مرد ہی محروم حیات پتھر بن چکا ہے کیونکہ مرد نے اپنا تزکیہ کرنا چھوڑ دیا لیکن عورت دھرم (مذہب) کی پابند ہو کر اپنی ریاضت میں مصروف رہی۔ وہ سماج کے بنیادی اصولوں کو اپنا ایمان سمجھ کر چلتی رہی۔ اور مرد نے اس میں حیات تازہ لانے کی بجائے اپنے ظلم و ستم سے اسے ناکارہ اور بے جان بنا دیا۔ شرت کی عورت زندگی کے عقائد کو پاکیزہ امانت سمجھ کر زندہ ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے سماج اس کا جائز استعمال کرے۔ صدیوں سے عورت سنگ دل مرد کے ذرے ذرے کو اپنی آنکھوں کے آنسوؤں سے پیچ رہی ہے کاش کبھی تو اس پتھر میں زندگی کے آثار پیدا ہوں کبھی تو اس میں جان آ جائے۔

شرت نے شری کانت میں عورت کی عالم گیر طاقت کو بالترتیب ان داہجی، راج، لکشی اور ابھیا کے اضطراب، پیار اور پریشانی میں روشن کیا ہے۔ یہ تینوں اپنی انفرادی حیثیت میں سرسوتی لکشی اور درگاہ ہیں۔ اپنی زندگی کا نصب العین حاصل کرنے کے لیے ان تینوں کے راستے الگ الگ ہیں۔ لیکن سماج میں جب ظلم و ستم حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو ابھیا کی مانند بے خوف ہو کر اس کے خلاف بغاوت کئے بغیر صنف نازک کی نجات نہیں۔ اسی لیے شرت نے عورت کے آدرش کو کسی ایک مرکز میں تنگ نہ بنا کر حسب موقعہ اسے وسعت اختیار کرنے کا حق بھی دیا ہے۔

شرت کے نادلوں میں نفرت اور برائی کی کچھ شکلیں بھی ازواجی زندگی کے راحت و آرام اور اطمینان کا خاتمہ کرنے کی کوشش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لیکن انسانیت کی فضیلت اور بزرگی ہی ان سب پر فتح حاصل کرتی ہے۔ شری کانت میں وہ خود کہتے ہیں۔ ”عقل کے بل بوتے پر میں کہتا ہوں اعتراضات کیوں نہ کروں۔ دنیا میں کیا بد اخلاق عورتیں نہیں ہیں۔ اگر نہیں تو راہ گھاٹ میں گناہ کی اتنی شکلیں کن کی نظر آتی ہیں؟ سب اندر تاحہ کی بیجی (ان داہجی) ہیں تو اتنی قسم کے دکھوں کے چشمے کون بہاتی رہتی ہیں۔ پھر بھی نامعلوم دل میں کیوں آتا ہے کہ یہ سب ان کے بیرونی پردے ہیں جن کو وہ جب چاہیں دور پھینک کر بالکل انہیں (ان داہجی) کی مانند ہی با آسانی ستی کی مسند پر جلوہ افروز ہو سکتی ہیں۔“ ایک جگہ اور بھی کہتے ہیں۔

سوسائٹی میں جگہ ہونی چاہئے اس کے بغیر ان پر کوری تنقید کرنا محض ایک مستقل آزار ہے۔ اس لئے شرت ان پر طعن و تشنیع اور لعنت ملامت کی بوچھاڑ کرنے کی بجائے ان کے لئے ہمدردی پیدا کرنے میں مصروف تھے۔ ایک بات اور بھی قابل غور ہے کہ نام نہاد بد اخلاقوں کا مسئلہ صرف مجلسی نہیں روحانی بھی ہے۔ سوسائٹی میں جگہ مل جانے پر بھی ان کی روح کو اطمینان نہیں ملتا۔ کیونکہ وہ کوئی اتہنی کل نہیں بلکہ انسان ہیں۔ معیاری سماج ان کو دھتکار کر ٹھکرانے کی غلطی نہ کرے بلکہ اپنی ہمدردی اور دلی پیار سے ان میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کرے۔ یہی شرت کا نعرہ ہے۔ شری کانت میں ایک جگہ وہ کہتے ہیں:-

”ایک انسان کے دل کی بات اگر دوسرا جان سکتا ہے تو صرف ہمدردی اور پیار سے۔ عمر اور عقل سے نہیں۔ دنیا میں جس نے جتنی زیادہ محبت کی ہے۔ دوسرے کے دل کی بات اس کے سامنے اتنی ہی زیادہ صاف ہو اٹھی ہے۔ یہ نہایت مشکل باریک بینی صرف محبت کے زور سے ہی حاصل کی جاسکتی ہے اور کسی طرح نہیں۔“

یہی ایک پہلو ہے جو ابھنوں کو ایک سلجھا دیتا ہے اور پڑھنے والوں کے سمجھنے کے لیے ایک لطیف انڈر لائن چھوڑ جاتا ہے وہ چاہتے ہیں کہ انسان کے اخلاق کو پرکھنے کے لیے انسانی فطرت کی کمزوریوں کا کنٹریکشن ملنا چاہئے کیونکہ ان کی نگاہ میں انسان سنگ مرمر کا دیوتا نہیں گوشت پوست کا مجموعہ بھی ہے۔

شرت کے نادلوں میں عورت کے دل کے پیار، درد، کرب، متا اور ایثار کا غلبہ ہے اور اپنی اسی خصوصیت سے وہ ظالم اور جابر کرداروں تک کو اپنے پیار میں با آسانی باندھ لیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے نادلوں میں عورت کے دل کو ہی اپنا معراج تسلیم کر کے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شرت کا اپنی رنج و راحت سے ملی جلی طویل زندگی میں نسوانی دل کے عظیم درد اور اس کی بے مثل متا کا احساس ہی زیادہ ہوا ہے۔ ان ہی کی محبت کے آب حیات کو تقسیم کر کے وہ پامال انسانوں کی ٹھکرائی ہوئی جماعت کو خوب تندرست و توانا بنا گئے ہیں اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی تمام مجلسی ابھنوں کا سلجھاؤ نسوانی زندگی کے مسئلہ کو حل کرنے میں ہے اور اس کے لیے ہی وہ سرگرم عمل رہے ہیں اس سلسلہ میں ایک جگہ ان کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

”میں نے اپنی حیات کا بیشتر حصہ Sociology کے مطالعہ میں ہی صرف کیا ہے۔ ملک کی تمام قوموں کی نہایت قریب سے دیکھنے کا موقع بھی مجھے ملا ہے۔ مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس حساب سے جس نے صنف نازک کا حق تباہ کیا ہے۔ بالکل اسی حساب سے وہ مجلسی، اقتصادی اور اخلاقی طور پر تباہ ہوا ہے۔“

شرت نے جس طرح رسوا اور بدنام لوگوں کو خاص نظر سے دیکھا ہے اسی طرح عورت کے اخلاق کو بھی۔ مرد ہو یا عورت کسی کے چال چلن کو وہ سوسائٹی کے قدیم اور مردہ نظر سے نہیں دیکھتے وہ تو

میری تمام زندگی گھومنے میں ہی کٹی ہے۔ اس سیلانی زندگی کے دو پہر ختم کر چکنے کے بعد تیسرے پہر میں کھڑے ہو کر اس کے ایک باب کو سناتے ہوئے آج مجھے نامعلوم کتنی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ یوں تو گھومتے پھرتے ہی میں بچے سے بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اپنے پرانے ہر ایک سے اپنے متعلق محض ”جھی، جھی“ سنتے سنتے میں اپنی زندگی کو ایک بڑی بھاری جھی جھی، کے علاوہ کچھ بھی نہیں سوچ سکا۔ تاہم بہت طویل عرصہ بعد آج جب میں اس کچھ یاد اور کچھ بھولی بسری کہانی کس سلسلہ جوڑنے کے لئے تیار ہوا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ زندگی کی اس صبح میں ہی ”جھی، جھی“ کی وہ تمہید کس لیے باندھی گئی تھی۔ تو یکا یک مجھے یہ شبہ ہوتا ہے کہ تمام لوگ اسی ”جھی، جھی“ کو اپنی نظر کے دھوکے سے جتنا بڑا کر کے دیکھتے تھے۔ اتنی بڑی یہ شاید ہرگز نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید بھگوان، جسے اپنی دنیا میں جبراً اٹھکیل دیتے ہیں۔ اس کو ہونہار لڑکا کہلا کر امتحان پاس کرنے کی سہولت عطا نہیں فرماتے اور نہ اسے گاڑی گھوڑے، پالکی پر لاؤ لشکر کے ساتھ سیر کرنے کی داستان شائع کرنے کا مادہ اس میں ودیعت کرتے ہیں۔ اس کو عقل و تمیز تو شاید وہ کچھ دیتے ہیں لیکن دنیا دار لوگ اسے عقلمند نہیں کہتے۔ اس لیے اس کی طبیعت ایسی لاابالی اور ایسی نرالی ہوتی ہے اور اس میں مشاہدہ کی چیزیں اور ان کی ماہیت معلوم کرنے کا چاؤ عموماً ایسا لاٹانی ہوتا ہے کہ اگر اس کا ذکر کیا جائے تو شاید اپنے آپ عقلمند کہلانے والے لوگ ہنستے ہنستے مرجائیں۔ اس کے بعد وہ لاٹا، نامعلوم کس طرح لا پرواہی، بے توجہی اور بے عزتی کی وجہ سے بروں کی صحبت میں اور بھی برا ہو کر، دھکے اور ٹھوکریں کھاتا ہوا، درپردہ آخر کار کسی دن بدنامی کی جھولی کندھے پر ڈال کر کہیں چل دیتا ہے اور بہت مدت تک اس کا کوئی پتہ ہی نہیں چلتا۔

اس لیے آج ان سب باتوں کو رہنے دوں تو اچھا ہے جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہی عرض کروں گا۔ مگر کہنے سے تو کہنے کی غرض و غایت پوری نہیں ہوتی۔ گھومنا ایک بات ہے اور اس کا ذکر کرنا دوسری بات۔ جس کسی کے بھی دو پاؤں ہیں وہ گھوم پھر سکتا ہے۔ لیکن دو ہاتھ ہونے سے ہی تو ہر ایک سے لکھا

”عورت کے کلنک کی بات پر میں باآسانی یقین نہیں کر سکتا۔ مجھے نیچی (ان دا) یاد آ جاتی ہیں..... سوچتا ہوں کہ لاعلمی میں عورت کے کلنک کی بات پر انکار کر کے ٹھکا جانا بہتر ہے۔ لیکن یقین کر کے گناہ کا حقدار بننا اچھا نہیں۔“

شرت بابو کہتے ہیں:-

”کسی طرح نکلے رہنا۔ یا اپنی ہستی کو قائم رکھنا ہی کیا زندگی کا حقیقی معیار ہے۔ اس قسم کو تو بہت سی قومیں اپنی ہستی کو قائم رکھے ہوئے موجود ہیں۔ کور کو ہیں۔ کول بھیل سنھال ہیں۔ جزائر غرب الہند میں بے شمار چھوٹی چھوٹی قومیں انسانی دنیا کے آغاز سے ابھی تک دیسی ہی بنی ہوئی ہیں۔ افریقہ میں ہیں۔ امریکہ میں ہیں۔ ان قوموں میں بھی اسی طرح کے تمام سخت آئین قانون موجود ہیں۔ جنہیں سن کر جسم کا خون پانی ہو جاتا ہے۔ قدامت کے لحاظ سے وہ قومیں یورپ کے کئی قوموں سے بھی قدیم ہیں۔ اور شاید ہم سے بھی قدیم۔ لیکن اس لیے وہ قومیں ہماری نسبت تہذیب و تمدن میں اخلاق اور چال چلن میں ہم سے زیادہ افضل ہیں۔ ایسا عجیب و غریب وہم میں سمجھتا ہوں کہ کسی کے دل میں بھی نہ اٹھتا ہوگا۔“

میری یہ کتاب ادارہ سیونٹھ سکائی پبلی کیشنز سے شائع ہو رہی ہے جس کے بعد اُمید ہے کہ آپ کی وہ شکایات جو آپ میری کتابوں کے لئے استعمال ہونے والے کاغذ، جربندی اور پروف ریڈنگ سے متعلق کیا کرتے ہیں جس طرح یہ قاری کی خواہش ہوتی ہے کہ کتاب معنوی ہی نہیں، صوری طور پر بھی خوبصورت دکھائی دے۔ مصنف بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کی تخلیق جب پیکر میں ڈھلے تو اتنی ہی خوبصورت دکھائی دے جیسا کہ اس نے سوچا اور لکھا۔

ہمارے ہاں بد قسمتی سے حکومت کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ قاری اور کتاب کا رشتہ ختم ہو جائے اس کے لئے بہترین ہتھیار کاغذ کی گرانی ہے جسے ہر حکومت نے کلباڑے کی طرح استعمال کیا ہے۔ دنیا کے جاہل ترین معاشروں میں بھی کتاب کے لئے استعمال ہونے والے کاغذ پر حکومتیں رعایت دیتی ہیں ہمارے ہاں الٹی لنگاہتی ہے اور زمانے بھر کے ٹیکس کاغذ پر تھوپ کر اسے اتنا مہنگا اور نایاب کر دیا جاتا ہے کہ خدا کی پناہ۔

ان حالات میں جو پبلشرز کتاب خوبصورت انداز میں آپ تک پہنچاتے ہیں بلاشبہ وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سیونٹھ سکائی پبلی کیشنز بھی ان میں شامل ہے میری تمام پرانی کتابیں اسی ادارے سے ملیں گی اور جلد ہی انشاء اللہ نئی کتابیں بھی۔

آپ سے درخواست ہے کہ میری کتابیں طلب کرتے ہوئے ادارہ سیونٹھ سکائی پبلی کیشنز کا نام ضرور دیکھ لیا کریں تاکہ آپ تک معیاری کتاب پہنچے۔

طارق اسماعیل ساگر

نہیں جاسکتا۔ لکھنا تو بڑا مشکل ہے اور اس کے علاوہ ایک بڑی بھاری مشکل یہ ہے کہ بھگوان نے میرے دل میں شاعرانہ تخیل کی ایک بوند بھی نہیں ڈالی۔ ان بدقسمت آنکھوں سے جو کچھ دیکھتا ہوں، بالکل وہی دیکھتا ہوں۔ درختوں کو بالکل درخت ہی دیکھتا ہوں۔ اور پہاڑ پر بتوں کو پہاڑ پر بت۔ پانی کی طرف دیکھنے سے وہ پانی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس طرح بھگوان نے ہی جس کا مزاج ایسا بنا دیا ہو۔ اس سے شاعرانہ تخیل کی دنیا کس طرح آباد ہو سکتی ہے۔ اگر ہو سکتی ہے تو یہی کہ وہ سچ کچ بات سیدھی طرح سے کہہ دے۔ اسی لئے میں بھی یہی کروں گا۔

مگر وہ گھمکو (سیلانی) کیوں بن گیا؟ یہ بتانے سے پیشتر اس ہستی کا کچھ تعارف کر دینا نہایت ضروری ہے۔ جس نے میری زندگی کی صبح میں ہی مجھے اس نشہ میں مخمور کر دیا تھا۔ اس کا نام تھا اندر ناتھ۔ ہم دونوں کی پہلی ملاقات ایک فٹ بال میچ میں ہوئی۔ میرے لیے یہ کہہ دینا کہ وہ آج بھی زندہ ہے ممکن نہیں۔ کیونکہ سالہا سال پیشتر ایک دن علی الصبح اٹھ کر گھر والوں کو چھوڑ کر صرف ایک دھوٹی لے کر وہ چلا گیا اور پھر لوٹ کر نہ آیا۔ وہ دن آج کس طرح یاد ہے۔

سکول کے احاطہ میں بنگالی اور مسلمان طالب علموں میں فٹ بال میچ تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ محو ہو کر میں دیکھ رہا تھا۔ مسرت کی انتہا نہ تھی۔ معا..... ارے یہ کیا۔ تڑا تڑا، تڑو تڑو اور مارو سالے کو، پکڑو سالے ہو کر میں دیکھ رہا تھا۔ مسرت کی انتہا نہ تھی۔ بس اتنے ہی میں کون کہاں غائب ہو گیا۔ اس کا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ پتہ چلاتا جب میری پیٹھ پر آ کر چھتری کا پورا ہنڈل تڑاک سے ٹوٹ گیا اور بھی دو تین ہنڈل سر اور پیٹھ پر چلنے کو کمر بستہ دیکھے۔ دیکھا پانچ سات بنگالی چھو کروں نے میرے گرد گھیر ڈال رکھا ہے اور بھاگ نکلنے کے لئے ذرا سارا ستہ بھی نہیں چھوڑا۔

اور بھی ایک ہنڈل..... اور بھی ایک، عین اسی وقت جو انسان برق کی سی رفتار سے اس گھیرے کو توڑ کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا وہی تھا اندر ناتھ۔

اس کا رنگ کالا تھا۔ ناک بانسری کی طرح پیشانی کشادہ اور سڈول، چہرے پر چپک کے دو چار داغ۔ قدم میرے برابر ہی تھا۔ لیکن عمر مجھ سے کچھ زیادہ تھی۔ کہنے لگا۔ ”ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے تم میرے پیچھے پیچھے نکل آؤ۔“

اس لڑکے کے دل میں جو جرات استقلال اور دلیری تھی وہ کم یاب ہوتے ہوئے بھی غیر معمولی نہ تھی۔ لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ اس کے دونوں ہاتھ غیر معمولی تھے۔ یہی نہیں کہ وہ بہت طاقتور تھے۔ بلکہ لمبائی میں بھی گھنٹوں تک پہنچتے تھے۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی سہولت تھی کہ جو اسے جانتا نہ ہو۔ اس کے دل میں یہ گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کسی جھگڑے کے وقت یہ حضرت اچانک اپنا تین

ہاتھ لمبا ہاتھ باہر نکال کر میری ناک پر یکا یک اس انداز کا گھونسا مار سکے گا۔ وہ گھونسا کیا تھا اسے شیر کا پنجہ ہی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

دو ہی منٹ میں میں اس کی پشت سے لگا ہوا باہر آ گیا اور پھر اندر نے بغیر کسی بناوٹ اور تھق کے کہا۔ ”بھو بھو گنا شروع کر کے میں نے پوچھا.....“

”اور تم.....؟“

اس نے روکھائی سے کہا..... ”ارے تو تو بھاگ۔ گدھے کہیں گے۔“

گدھا ہوں..... یا جو کچھ بھی ہوں۔ مجھے خود یاد ہے۔ میں نے فوراً ڈٹ کر اور کھڑے ہو کر کہا۔ ”نہیں میں نہیں بھاگوں گا۔“ بچپن میں مار پیٹ کس نے نہ کی ہوگی؟ لیکن میں تھا گاؤں کا لڑکا۔ دو تین مہینے پیشتر ہی لکھنے پڑھنے کے لیے شہر میں ابو جی کے یہاں آیا تھا..... اس سے پہلے گروہ بنا کر یا پارٹی بنا کر نہ تو میں نے مار پیٹ ہی کی تھی اور نہ کسی دن اس طرح چھتری کے دو ہنڈل ہی میری پیٹھ پر ٹوٹے تھے۔ پھر بھی میں اکیلا بھاگ نہ سکا۔ اندر نے ایک بار میرے منہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”نہیں بھاگے گا تو کیا کھڑے کھڑے مار کھایا گا؟ دیکھ اس طرف سے وہ لوگ آرہے ہیں۔ اچھا تو چل خوب کس کر دوڑیں۔“

یہ کام تو میں خوب کر سکتا تھا۔ دوڑتے دوڑتے جب ہم بڑی سڑک پر پہنچ گئے تو شام ہو گئی تھی۔ دکانوں میں روشنی تھی اور رستے پر میوہیل کے کیروسین کے لیمپ، لوہے کے کھبوں پر ایک یہاں اور دوسرا وہاں جل رہے تھے۔ آنکھوں میں زور ہونے پر یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کے پاس کھڑے ہو کر دوسرا دکھائی نہ دے۔ ان بد معاشوں کا اب کوئی خطرہ نہ تھا۔ اندر اپنے حسب معمول قدرتی لہجہ میں بات کر رہا تھا۔ میرا گلہ خنک ہو رہا تھا۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ اندر ہانپ نہیں رہا تھا۔ گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا نہ مارا نہ مار کھائی ہوا اور نہ دوڑا ہی ہو..... جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اس ڈھنگ سے اس نے پوچھا..... ”تیرا نام کیا ہے؟“

”شری کانت؟ اچھا“ کہہ کر اس نے اپنے جیب سے مٹھی بھر خشک پتی نکالی اس میں سے کچھ تو اس نے کھالی اور کچھ میرے ہاتھ میں دے کر کہا۔ ”آج خوب خبر لی ان سالوں کی۔ لے کھا۔“

”کیا ہے یہ؟“

”بوٹی۔“

میں نے حیرانہ کر کہا..... ”بھنگ، یہ میں نہیں کھاتا۔“

اس نے مجھ سے زیادہ حیران ہو کر کہا..... ”کھاتا نہیں، کہاں کا گدھا ہے رہے۔ خوب نشہ ہو

ایسی مہیب تاریکی میں اس خوفناک جنگل کا تصور کر کے بواول میں لڑا انھیں اور خوفزدہ لہجہ میں انہوں نے دریافت کیا۔ ”اس کی ماں بھی کیا اسے نہیں روکتی؟ گوسائیں کے باغ میں تو نہ جانے کتنے لوگ سانپ کے کانٹے سے مر گئے ہیں۔ اس جنگل میں اتنی رات کو وہ لڑکا آیا ہی کیوں؟“

بڑے بھیا کچھ ہنس کر بولے۔ ”اس لئے کہ اس محلے سے اس محلے تک آنے کا وہی سیدھا راستہ ہے۔ جسے ذرا نہیں ہے۔ جان کی کچھ پروا نہیں وہ کیوں بڑے راستے سے چکر کاٹ کر آئے گا، اسے تو جلدی آنے سے سروکار ہے؟ پھر خواہ اس راستے میں ندی نالے ہوں۔ خواہ سانپ بچھو اور شیر بھالو ہوں!“

”سلام ہے رے لڑکے تجھے۔“ کہہ کر بوا ایک آدھ کر چپ ہو رہیں۔ بانسری کا لہجہ صاف ہوتا گیا اور پھر آہستہ آہستہ وہ ہلکا ہوتا ہوا اور جا کر ناپید ہو گیا۔

بیکہ تھا وہ اندر تھام، اس دن تو میں یہ سوچتا رہا تھا کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر اتنی زیادہ طاقت مجھ میں بھی ہوتی اور میں بھی اسی طرح مار پیٹ کر سکتا اور آج رات جب تک سو نہ گیا تو یہ آرزو کرتا رہا کہ اگر کسی طرح ایسی بانسی بجا سکتا۔

لیکن اس سے راہ و رسم کس طرح پیدا کروں۔ وہ تو مجھ سے بہت بلندی پر ہے۔ اس وقت وہ سکول میں بھی نہ پڑھتا تھا۔ سنا تھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ظلم کر کے جونہی اس کے سر پر گدھے کی ٹوپی لگانے کا انتظام کیا تو وہ متاثر ہو کر فوراً ہیڈ ماسٹر کی پیٹھ پر ایک تھپڑ جما کر اور نفرت کا اظہار کر کے سکول کی ریلنگ پھانسا ہوا گھر بھاگ آیا اور پھر گیا ہی نہیں۔ بہت دنوں بعد اسی کے منہ سے سنا تھا کہ وہ ایک جرم تھا۔ ہندوستانی پنڈت جی کو جماعت کے وقت ہی نیند آنے لگی تھی۔ ایک بار جب وہ نیند لے رہے تھے تو ان کی گاتھ بندھی چوٹی کو اس نے قینچی سے کاٹ کر ڈرا سا چھوٹا کر دیا تھا اور اس سے ان کا کچھ خاص نقصان بھی نہ ہوا تھا۔ کیونکہ پنڈت جی جب گھر پہنچے تو ان کو اپنی چوٹی اپنی اچکن کی جیب میں ہی پڑی ہوئی مل گئی۔ وہ کہیں کھوئی نہیں تھی۔ پھر بھی پنڈت جی کا غصہ فرد کیوں نہ ہو سکا۔ اور کیوں وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس شکایت کرنے گئے۔ یہ بات آج تک بھی اندر کی سمجھ میں نہ آئی۔ لیکن پھر بھی یہ بات وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ سکول سے ریلنگ پھانسا کر گھر آنے کا راستہ تیار ہو جانے پر پھر پھانک میں سے واپس جانے کا راستہ تقریباً کھلا نہیں رہ جاتا۔ اور پھانک کا راستہ کھلا رہا نہیں رہا۔ یہ دیکھنے کی پروا بھی اسے بالکل نہ رہی۔ حتیٰ کہ سر پر دس بیس سر پرستوں کا بوجھ ہونے پر بھی ان میں سے کوئی بھی اس کا منہ کسی طرح بھی پھر سکول کی طرف پھیر نہ سکا۔ اندر نے قلم پھینک کر ناک کا ڈانڈ ہاتھ میں لیا۔ اب یہی اس کا شغل تھا۔

گا۔ کھانچا کر نگل جا۔“
نٹے کی شے کا لطف اس وقت تک معلوم نہ تھا اس لیے سر ہلا کر میں نے اسے واپس کر دیا۔ وہ اسے بھی چبا کر نگل گیا۔

”اچھا تو پھر سگریٹ پی۔“ یہ کہہ اس نے جیب سے دو سگریٹ اور دیا سلائی باہر نکالی۔ ایک تو اس نے میرے ہاتھ میں دے دی اور دوسری اپنے ہاتھ میں رکھی۔ اس کے بعد وہ اپنی دونوں ہتھیلیوں کو ایک عجیب طرح سے ملا کر اس سگریٹ کو چلم بنا کر زور سے کھینچنے لگا۔ باپ رے، کیسے زور سے اس نے دم کھینچا کہ ایک ہی دم سگریٹ کی آگ سرے سے چل کر نیچے اتر گئی۔ لوگ چاروں طرف کھڑے تھے۔ میں بہت ہی ڈر گیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”پیتے ہوئے اگر کوئی دیکھ لو تو؟“

”دیکھ لے تو کیا؟ سبھی جانتے ہیں۔“ یہ کہہ کر آزادی سے سگریٹ پیتا ہوا وہ چوراہے پر مڑا اور میرے دل پر ایک گہرا نقش قائم کر کے ایک طرف چل دیا۔

آج اس دن کی بہت سی باتیں یاد آتی ہیں۔ صرف اتنا ہی یاد نہیں آتا کہ اس عجیب و غریب لڑکے کے متعلق میرے دل میں محبت کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ یا یوں کہلے عام بھگے اور تبا کو کو پینے کی وجہ سے دل ہی دل میں نفرت۔

اس واقعہ کے بعد تقریباً ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک دن رات جتنی گرم تھی اتنی ہی تاریک تھی۔ کہیں بھی ایک پتہ نہ تھا۔ سب لوگ چھت پر سوئے ہوئے تھے۔ بارہ بج چکے تھے۔ لیکن کسی کی بھی آنکھوں میں نیند کا نام نہ تھا۔ دفعۃً بانسری کی نہایت دلکش تان کو نوں میں آنے لگی۔ عام ”رام پر سادی“ تان بھی۔ کتنی ہی مرتبہ تو سن چکا تھا۔ مگر بانسری اس طرح محو کر سکتی ہے یہ میں نہیں جانتا تھا۔ ہمارے مکان کے جنوب مشرق میں آم اور کٹھنل کا ایک بڑا بھاری باغ تھا۔ کئی حصے داروں کی ملکیت ہونے کے باعث کوئی اس کی پرہیز نہیں کرتا تھا اس لیے تمام باغ ویران ہو کر جنگل بننا گیا۔ گائے بیلوں کی آمد و رفت سے اس باغ کے بچوں سچ ایک پتلی سی پگڈنڈی بن گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ گویا اسی جنگلی راستہ سے بانسری کا لہجہ رفتہ رفتہ قریب سے قریب تر ہوا آ رہا ہے۔ بوا اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے بڑے لڑکے کو مخاطب کر کے بولی۔ ”ہاں رے نوین، یہ بانسری رائے خاندان کا اندر ہی بجا رہا ہے نا؟“ تو میں نے سمجھا کہ اس بانسری والے کو سب جانتے ہیں۔ بڑے بھیا نے کہا۔ ”اس بد نصیب کو چھوڑ کر ایسی بانسری کون بجائے گا اور اس جنگل میں اور کون ہے جو گھومے گا۔“

”کیا کہتا ہے رے؟ وہ کیا گوسائیں کے باغچے میں آ رہا ہے؟“

بڑے بھیا بولے۔ ”ہاں؟“

ایک دن اسی طرح جب وہ بغیر کسی مقصد کے اپنی کشتی بہائے جا رہا تھا تو اس کے ساتھ ملاپ کی گانٹھ کو مضبوط بنانے کا مجھے موقع ملا۔ اس وقت میری صرف یہی ایک تمنّا تھی کہ اس سے کسی نہ کسی طرح دوستانہ تعلقات استوار کئے جائیں اور یہی بتانے کے لیے میں نے یہ سب کچھ عرض کیا ہے۔

لیکن جو لوگ مجھے جانتے ہیں وہ تو کہیں گے کہ یہ تو تمہیں اچھا نہیں لگتا، تم ٹھہرے غریب کے لڑکے اور پھر پڑھنا لکھنا سیکھنے کے لیے اپنا گاؤں چھوڑ کر پرانے گھر آ کر رہے ہو۔ پھر تم اس سے ملے ہی کیوں؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج تم۔

ٹھہرو، ٹھہرو زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات ہزاروں لوگوں نے لاکھوں بار مجھ سے کہی ہے۔ خود میں نے بھی یہ سوال اپنے آپ سے کروڑوں مرتبہ پوچھا ہے۔ لیکن سب بیکار ہے۔ فضول ہے وہ کون تھا؟ اس کا جواب تم میں سے کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ اور پھر اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تم میں کیا ہو جاتا۔ اس سوال کا حل بھی تم میں سے کوئی نہیں کر سکتا۔ جو سب کچھ جانتے ہیں صرف وہ (بھگوان) ہی بتا سکتے ہیں کہ کیوں اتنے انسانوں کو چھوڑ کر صرف اسی بد نصیب کی طرف میرا دل کشش کرنے لگا۔ اور کیوں اس سے ملنے کے لیے میرے جسم کا ہر ذرہ بے قرار ہوا تھا۔

وہ دن مجھے خوب یاد ہے۔ تمام دن بارش ہوتے رہنے کے باوجود بھی بادل ابھی تک برس رہے تھے۔ ساون کا آسمان گھنے بادلوں سے محیط تھا۔ شام ہوتے ہوتے چار طرف تاریکی پھیل گئی تھی۔ جلدی جلدی کھا کر ہم کئی بھائی حسب معمول باہر بیٹھک میں بیچھے ہوئے بستر پر انڈی کے تیل کا چراغ جلا کر کتاب کھول کر بیٹھ گئے۔ باہر کے برآمدے میں ایک طرف پھوپھا جی کی نوں کی کھاٹ پر لیٹے ہوئے شام کی نیند سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اور دوسری طرف بوڑھے رام مکمل بھٹا چار یہ افیون کھا کر اندھیرے میں آنکھیں بند کئے تھے گڑگڑا رہے تھے۔ ڈیوڑھی پر ہندوستانی دربان کا ”تلسی داسی“ لہجہ سنائی دے رہا تھا۔ اور اندر ہم تینوں بھائی منجھلے بھیا کر کڑی نگرانی میں چپ چاپ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ چھوٹے بھیا جیتن اور میں تیسری اور چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے۔ اور سنجیدہ مزاج منجھلے بھیا دو مرتبہ انٹرنس فیل ہو کر تیسری بار تیاری کر رہے تھے۔ ان کے سخت گیرانہ نظام میں کسی کو ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ ہم لوگوں کے پڑھنے کا وقت ساڑھے سات سے نو بجے تک تھا۔ اس وقت میں ہم باپ چیت کر کے ان کے ”پاس ہونے“ کے مطالعہ میں خلل انداز نہ ہوں۔ اس لیے وہ ہر روز قنچی سے کاٹ کر کاغذ کے پچیس نکٹ کی مانند ٹکڑے رکھ چھوڑتے۔ ان میں سے کسی میں لکھا ہوتا۔ ”باہر جانا ہے۔“ وغیرہ وغیرہ۔ جیتن بھیا نے ایک ناک صاف کرنے کا نکٹ، منجھلے بھیا کے سامنے پیش کیا۔ منجھلے بھیا نے اس پر اپنے ہاتھ سے لکھ دیا آٹھ بج کر تیس منٹ سے لے کر آٹھ بج کر ساڑھے تینتیس

منٹ تک یعنی اتنے وقت کے لئے وہ ناک صاف کرنے کے لئے جاسکتے تھے۔ اجازت حاصل کر کے نکٹ ہاتھ میں لے کر وہ گئے ہی تھے کہ چھوڑے بھیا نے تھوکنے جانے کا نکٹ پیش کر دیا۔ منجھلے بھیا نے اس پر ”نہیں“ لکھ دیا۔ دو منٹ تک چھوٹے بھیا منہ پھلائے بیٹھے رہے اور اس کے بعد انہوں نے ”پانی پینے“ کی عرضی داخل کر دی۔ اس بار وہ منظور ہو گئی۔ منجھلے بھیا نے اس کے لیے لکھ دیا ہاں آٹھ بج کر ایک لیس منٹ لے لے کر آٹھ بج کر ستر لیس منٹ تک۔ پروانہ لے کر چھوٹے بھائی جونہی ہنستے ہوئے باہر گئے جیتن بھیا نے لوٹ کر ہاتھ کا نکٹ واپس دے دیا منجھلے بھیا نے گھڑی دیکھ کر اور وقت ملا کر ایک رجسٹر باہر نکالا۔ اور اس میں وہ نکٹ گوند سے چپکا دیا۔ یہ سب سامان اس کے ہاتھ کی رسائی تک ہی رکھا جاتا تھا۔ ہفتہ ختم ہونے پر ان سب نکٹوں کو سامنے رکھ کر کیفیت دریافت کی جاتی۔ کہ فلاں دن تم نے اجازت سے زیادہ وقت کیوں لگا دیا تھا۔

اس طرح منجھلے بھیا کی نہایت محتاط اور باقاعدہ نگرانی میں اور ہمارا اور خود ان کا کسی کا بھی وقت ضائع نہ ہوتا تھا۔ اور ہر روز دیر گھنٹہ خوب پڑھ لینے کے بعد جب ہم لوگ رات کے نو بجے گھر میں سونے کے لیے جاتے تھے۔ تو یقیناً ہی سرسوتی ماتا (علم کی دیوی) ہمیں گھر کی چوکھٹ تک پہنچا جاتی تھی اور دوسرے دن سکول کی جماعت میں جو قدر اور خوش قسمتی حاصل کر کے ہم گھر ٹوٹے تھے۔ وہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ لیکن منجھلے بھیا کی بد بختی کہ ان کے بیوقوف ممتحن انہیں کبھی پہچان نہ سکے۔

وہ اپنی اور دوسروں کی تعلیم و تربیت کے متعلق اتنا زبردست خیال اور وقت کی قدر و قیمت کے متعلق اپنی ذمہ داری کا اتنا احساس رکھتے تھے۔ پھر بھی وہ انہیں متواتر فیل ہی کرتے گئے۔ اسی کو تو کہتے ہیں غیب کا اندھا انصاف۔ خیر جانے دو..... اب اس کے لیے افسوس کرنے سے کیا فائدہ؟

اس رات کو بھی گھر کے باہر گہری تاریکی، برآمدے میں مخواب وہی دونوں بوڑھے اور اندر چراغ کی مدد سے روشنی میں سنجیدہ مطالعہ میں مہتمک ہم چاروں بھائی تھے۔

چھوٹے بھیا کے لوٹ آتے ہی پیاس کے مارے میری چھاتی یک بارگی پھٹنے لگی۔ اس لئے نکٹ پیش کر کے میں اجازت کی راہ دیکھنے لگا۔ منجھلے بھیا اس نکٹ والے رجسٹر پر جھک اندازہ کرنے لگے کہ میرا پانی پینے کے لئے جانا تو اعد کے مطابق بھی ہے یا نہیں۔ یعنی کل پرسوں میں نے کسی وقت پانی پیا تھا۔

دفعۃ میرے عین پیچھے سے ایک ہوم، آواز ساتھ ہی چھوٹے بھیا اور جیتن بھیا کی چیخ نکلی۔ ”ارے باپ رے! مار ڈالارے، کاٹلک شگاف شور و غل سنائی پڑا۔ انہیں کس نے مار ڈالا۔ گردن گھا کر یہ دیکھنے کے پیشتر ہی منجھلے بھیا نے منہ اٹھا کر عجیب آواز نکالی اور بجلی کی سی رفتار سے سامنے پاؤں پھینکا۔

میں ایک بڑا جانور بیٹھا ہے۔ وہ بھڑبھڑیے کی طرح ہی معلوم ہوتا تھا۔ چشم زدن میں تمام برآمدہ خالی ہو گیا اور بیٹھک کھچا کچھ ہر گئی۔ برآمدے میں ایک بھی انسان نہ رہا۔ گھر کے اس نجوم میں سے پھوپھو جی کا پر جوش لہجہ سنائی دینے لگا۔ ”برجھی لاؤ..... ہندوق لاؤ“ ہمارے مکان کے پڑوس میں گنگن بابو کے ہاں ایک مونگیری ہندوق تھی۔ ان کا اشارہ اسی کی طرف تھا۔

لاؤ تو بجا لیکن لائے کو؟ انار کا درخت دروازے کے نزدیک ہی تھا۔ پھر اس پر بیٹھا تھا بیھڑیا۔ ہندوستانی شیشٹا تک نہیں اور جو لوگ تماشا دیکھنے آئے تھے وہ بھی سن ہو کر رہ گئے۔

اس مصیبت کے وقت نامعلوم کہاں سے اندر آ حاضر ہوا۔ شاید وہ مقابل کے راستہ سے کہیں جا رہا تھا۔ اور شورغل سن کر اندر گھس آیا تھا۔ پل بھر میں سینکڑوں گلے ایک ساتھ پکارا اٹھے۔ ”ارے رے، بھیڑیا ہے بھیڑیا۔ بھاگ جا۔ بھاگ جا۔ بھاگ جا۔“

پہلے تو وہ ہڑا کر اندر دوڑ آیا۔ لیکن پھر دم بعد ہی سب حال سن کر اور بے خوف ہو صحن میں اتر کر لالٹین اٹھا کر دیکھنے لگا۔

دومنزلے کی کھڑکیوں میں سے عورتیں دم روک کر اس جرأت مند لڑکے کی طرف دیکھ دیکھ کر ”دوگا“ نام چنے لگیں۔ نیچے بھینڑ میں کھڑے ہندوستانی سپاہی اس کی ہمت بندھانے لگے۔ اور اسے حوصلہ دینے لگے کہ ایک آدھ ہتھیار ملنے پر وہ بھی آنے کو تیار ہیں۔

اچھی طرح دیکھ کر اندر نے کہا..... ”دوار کا بابو! یہ تو بھڑیا معلوم نہیں ہوتا“..... اس کی بات ختم ہونے سے پیشتر ہی وہ ”رائل بنگال ٹائیگر“ دونوں ہاتھ باندھ کر انسانی لہجہ میں روپڑا اور بولا..... ”

نہیں بابو جی، نہیں میں رچھ بھیریا نہیں ہوں۔ شری ناتھ بہر ویہا ہوں۔“ اندر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ بھٹا چاریہ مہاشہ کھڑاؤں ہاتھ میں لئے سب سے آگے دوڑ پڑے۔.....“ حرامزادے تجھے ڈرانے کے لیے اور کوئی جگہ نہ لی؟“ پھوپھا جی نے نہایت غصہ کے عالم میں حکم دیا۔“ سائلے کوکان سے پکڑ کر لاؤ۔“

کشور تنگہ نے اسے سب سے پہلے دیکھا تھا۔ اس لیے اس کا دعویٰ سب سے مضبوط تھا۔ وہ گیا اور اس کے کان پکڑ کر گھسیٹا ہوا لے آیا۔ بھٹا چار یہ اس کی پیٹھ پر زور زور سے کھڑاؤں مارنے لگے۔ اور غصے کے جوش میں دتا دن ہندی بولنے لگے۔

”اسی حرا مزادے، بدذات کی وجہ سے میری ہڈی پٹلی چور ہو گئی ہے سالے پوریوں نے گھونے مار مار کر میرا کچھ مر نکال دیا۔“

شری ناتھ کا گھر بار است میں تھا۔ وہ ہر سال انہیں دنوں ایک مرتبہ اپنا کاروبار کرنے کیلئے آیا کرتا تھا۔ کل بھی وہ اس گھر میں نارو بنکو گانا گانا تھا۔

کئے بغیر گوسائیں باغ کے اس مہیب جنگلی راستہ کے سامنے آنکلا اور اندر کا پیچھا کرتا ہوا سحر خوردہ کی مانند اس کو طے کر کے گنگا کے ساحل پر جا پہنچا۔

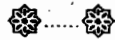
کنکر پتھروں کا کھڑا کنارہ تھا۔ سر کے اوپر ایک نہایت ہی قدیم برگد کا درخت مجسم تاریکی بن کر سامنے کھڑا تھا۔ اور اسی کے قریب تیس ہاتھ نیچے انتہائی تاریک سطح میں برسات کا جوشیلا بہاؤ چٹانوں سے ٹکرا کر بخور بنانا ہوا کافی تیزی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ دیکھا کہ اس جگہ پر اندر کی چھوٹی سی ناؤ بندھی ہوئی ہے۔ اوپر سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوا گویا اس خوب تیز بہاؤ کے منبع پر کیلے کے پھول کا ایک چھوٹا سا چھلکا لگا تا نکر اٹلڑا کر اپنی ہستی کھو رہا ہے۔

میں خود بھی ڈر پوک نہ تھا مگر اندرنے جب اوپر نیچے تک لٹکتا ہوا ایک رسہ دکھا کر کہا۔.....
 ”ناؤ کے اس رسہ کو پکڑ کر چپ چاپ نیچے اتر جا۔ ذرا احتیاط سے اترنا۔ پھسل گیا تو پھر دھوئند نے پر بھی
 تیرا نشان نہ ملے گا۔“ تو فی الحقیقت میری چھاتی دھڑک اٹھی۔ معلوم ہوا کہ یہ ناممکن ہے پھر بھی میرے
 لئے تو رسے کا سہارا ہے۔ ”لیکن تم کیا کرو گے؟“

اس نے کہا۔ ”تیرے نیچے اترتے ہی میں رسہ کھول دوں گا اور پھر نیچے اتروں گا۔ ڈرنے کی بات نہیں۔ میرے اترنے کے لیے بہت گھاس اور جڑیں موجود ہیں۔“

اور کچھ نہ کہہ کر میں رے کے سہارے نہایت احتیاط کے ساتھ بمشکل تمام نیچے اتر کر کتبی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس نے رے رکھول دیا اور جھول گیا۔ وہ کسی شے کے سہارے نیچے اترنے لگا۔ اس بات کو میں آج تک بھی نہیں جانتا۔ ڈر کے مارے میرے چھاتی اتنے زور سے دھڑکنے لگی تھی کہ اس کی طرف میں دیکھ بھی نہ سکا۔ دو تین منٹ تک کافی تیز بہاؤ کی پرشور گرج کے سوا کوئی بھی آواز سنائی نہ دی۔

ایک ایک ایک ہلکی سی ہنسی کی آواز سے منہ گھمایا تو دیکھتا ہوں کہ اندر نے دونوں ہاتھوں سے ناؤ کو زور سے دھکا دے کر ٹھیل دیا ہے اور خود کو در اس پر چڑھ بیٹھا۔ بیچاری ناؤ ایک پکڑ سا کھا کر تیزی سے بہنے لگی۔



وہ کبھی ہٹھا چار یہ کے اور کبھی پھوپھو پھانجی کے پاؤں پڑنے لگا بولا..... لڑکوں نے اتنا زیادہ شور و
غل مچا دیا کہ میں خود بھی ڈر کے مارے اس درخت کی آڑ میں چھپ گیا۔ سوچا تھا کہ کچھ سکون ہونے پر
باہر آ کر اپنا سوا لنگ دکھا کر چلا جاؤں گا مگر معاملہ اس قدر پیچیدہ ہوتا گیا کہ میری پھر ہمت ہی نہ ہوئی۔“
شری ناتھ منت ساجت کرنے لگا، لیکن پھوپھو پھانجی کا غصہ کم ہوا ہی نہیں ہوا جی خود اوپر سے
بولیں۔ ”تمہاری قسمت اچھی تھی جو کچ مچ کا بیھڑیا نہیں نکلا۔ ورنہ جیسے بہادر تم اور تمہارے دربان
ہیں..... چھوڑ دو بیچارے کو، اور دور کر دو دیوڑھی کے ان پوربی دربانوں کو..... ایک ذرا سے لڑ کے میں جو
ہمت ہے وہ گھر بھر کے تمام آدمیوں میں مل کر بھی نہیں ہے۔“

پھوپھا جی نے کوئی بات نہ سنی بلکہ انہوں نے بواجی کے اس الزام پر آنکھیں گھا کر ایسا ظاہر کیا گویا خواہش کرتے ہی وہ ان سب باتوں کا کافی اور صحیح صحیح جواب دے سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ عورتوں کی باتوں کا جواب دینے کی کوشش کرنا بھی مردوں کی توہین ہے اس لیے اور بھی گرم ہو کر حکم دیا..... ”اس کی دم کاٹ ڈالو۔“ پھر اس کی رنگین کپڑے سے لپٹی ہوئی اور گھاس کی بنی ہوئی لمبی دم کاٹ ڈالی گئی اور اس کو بھگا دیا گیا۔ بواجی اوپر سے غصہ سے بولیں۔ ”دم کو رکھ چھوڑو کسی دقت کام آئیگی۔“

اندر نے میری طرف دیکھ کر کہا..... ”معلوم ہوتا ہے تم اسی مکان میں رہتے ہو شری کانت!“
میں نے کہا..... ہاں، تم اتنی رات کو کہاں جا رہے تھے؟“
اندر ہنس کر بولا..... ”رات کہاں ہے رے، ابھی تو شام ہوئی ہے۔ میں جاتا ہوں اپنی کشتی پر
پچھلی پکنے چلنا ہے؟“

میں نے ڈر کر پوچھا..... ”اتنی زبردست تاریکی میں ناؤ پر چڑھو گے؟“
وہ پھر ہنسا..... بولا..... ”ڈر کیا ہے رے۔ اسی میں تو لطف ہے۔ اس کے علاوہ اندھیرا
ہوتے بغیر مچھلیاں ملتی کہاں ہیں؟ تیرنا جانتا ہے تو؟“

”خوب جانتا ہوں۔“
 ”تو پھر چل بھائی!“ یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: ”میں تنہا اتنے بہاؤ میں اس طرف کونا د نہیں لے جا سکتا..... ایسے ہی کسی تلاش میں تھا جو ڈرے نہ۔“

میں نے پھر کچھ نہ کہا..... اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے چپ چاپ راستے پر آ پہنچا۔ پہلے تو مجھ خود اپنے آپ پر ہی یقین نہ ہوا کہ کچ کچ ہی اس رات میں ناؤ چلانے جا رہا ہوں۔ کیونکہ جس دعوت کی کشش سے اس سنٹان اور ڈراؤنی رات میں گھر کے تمام انتظامات اور نگرانی کو بیچ سمجھ کر تنہا باہر چلا آیا۔ وہ کتنی زبردست کشش تھی۔ اس بات پر غور کرنا اس وقت میرے لیے ممکن نہ تھا۔ کچھ زیادہ وقت صرف

مہم سی تھی۔ لیکن جوں جوں ناؤ بڑھنے لگی وہ آواز صاف اور زیادہ زوردار ہونے لگی۔ گویا لوگوں کا بہت دور سے آتا ہوا بلاوا ہو۔ گویا کتنی ہی مشکلات اور تکالیف کو پار کر کے، ہٹا کر وہ ہمارے کانوں تک پہنچا ہو۔ وہ بلاوا تھکا ماندہ تھا۔ پھر بھی اسی میں وقفہ تھا نہ اختلاف ہی، گویا ان کا غصہ نہ تو کم ہوتا تھا اور نہ زیادہ ہی اور نہ تھنا ہی چاہتا تھا۔ بیچ بیچ میں ایک آدھ دفعہ جھپ جھپ آواز بھی ہوتی تھی۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ”اندر یہ کس چیز کی آواز سنائی دیتی ہے؟“ اس نے ناؤ کا رخ کچھ اور سیدھا کر کے کہا۔۔۔ ”پانی کے بہاؤ کے زور سے اس طرف کے کنارے ٹوٹ کر گر رہے ہیں۔ یہ اسی کی آواز ہے۔“

میں نے پوچھا۔۔۔ ”کتنے بڑے کنارے ہیں اور کیا بہاؤ ہے؟“
 ”بڑا خطرناک بہاؤ ہے اوہ! اسی لئے تو۔۔۔ کل بارش ہوئی تھی۔ آج اس کے نیچے نہ جایا جائیگا۔ کہیں ایک بھی کنارہ گر پڑا تو کشتی اور ہم دونوں پس جائیں گے۔ اچھا تو ڈنڈا چلا سکتا ہے نا؟“
 ”چلا سکتا ہوں“
 ”تو چلا“

میں نے ڈانڈ چلانا شروع کیا۔ اندر نے کہا۔۔۔ ”وہی۔۔۔ وہی تو، جو بائیں طرف کالا کالا نظر آتا ہے۔ وہ چڑا ہے اس کے درمیان میں سے ہو کر ایک نہر گئی ہے۔ اسی میں سے نکل کر جانا ہو گا۔ لیکن بہت آہستہ، اگر کہیں ملاحوں کو اس بات کا ذرا سا بھی علم ہو گیا تو پھر زندہ واپس نہ لوٹ سکیں گے۔ وہ بانس کی مارے سے سر پھوڑ کر اسی کیچڑ میں گاڑ دیں گے۔“

”یہ کیا؟“ میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔۔۔ ”تو پھر اس نہر میں سے ہو کر مت چلو۔“ اندر نے شاید کچھ ہنس کر کہا۔۔۔ ”اور تو کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ اس کے اندر ہو کر تو جانا ہی ہو گا جزیرہ کی بائیں طرف کی مٹی کو دھکیل کر تو جہاز بھی نہیں جاسکتا۔ پھر ہم کیسے جائیں گے؟ لوٹتے وقت واپس آ سکتے ہیں لیکن جانیں سکتے۔“

”تو پھر مچھلیوں کے چرانے کی ضرورت نہیں ہے بھیا۔“ کہہ کر میں نے ڈانڈ اوپر اٹھالیا۔ چشم زدن میں ناؤ چکر کھا کر لوٹ چلی۔ اندر جھنجھلا اٹھا۔ اس نے آہستہ سے ہنسنے لگا۔ ”تو پھر آیا کیوں چل تجھے واپس پہنچا آؤں، بزدل کہیں کا، اس وقت میں نے چودہ سال پورے کر کے پندرہویں میں قدم رکھا تھا۔۔۔ میں بزدل؟ فوراً ڈانڈ کو پانی میں پھینک کر جی جان سے کھینچ لگا۔ اندر خوش ہو کر بولا۔۔۔ ”یہی تو چاہئے مگر بھائی، آہستہ آہستہ چلاؤ۔ سارے بہت پاجی ہیں۔ میں جہاؤ کے جنگل کے قریب مکئی کے کھیتوں میں سے ہو کر اس طرح بچا کر لے چلوں گا کہ سالوں کو ذرا بھی خبر نہ ہوگی۔“ پھر کچھ

۱۔ دریا میں میلے پانی کی مٹی جم کر جو جزیرے سے بن جاتے ہیں۔ انہیں چڑا کہتے ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد گرد و پیش گہری تاریکی سے محیط ہو کر اس میں چاروں اطراف غائب ہو گئیں۔ رہ گئی دائیں بابائیں طرف دونوں ساحلوں تک پھیلی ہوئی بے پایاں پانی کی پر جوش دھار اور اس کے اوپر خوب تیزی سے چلنے والی وہ چھوٹی سی ناؤ اور اس پر دونو جوان لڑکے۔ اگرچہ قدرت کے اس منظر کو اچھی طرح سمجھنے کی وہ عمر نہ تھی۔ تاہم میں اسے آج تک فراموش نہیں کر سکا۔ سنسان، خاموش اور تاریک رات کی ایک عظیم شکل تھی۔ اس کے گھناؤنے سیاہ بالوں سے زمیں و آسمان ڈھک چکے تھے۔ اور اس مہیب تاریکی کا پردہ پھاڑ کر خونخوار داڑھوں کی قطار کی مانند اس بے پایاں پانی کے تیز بہاؤ سے گویا ایک قسم کی عجیب و غریب کرن بے رمانہ دہی ہوئی ہنسی کی طرح بکھری رہی تھی۔ آس پاس اور سامنے کہیں تو پانی کا بے خود بہاؤ سطح میں جا کر اور اوپر کی طرف جا کر پھٹ پڑتا تھا۔ اور کہیں کہیں باہمی مخالف سمتوں میں ٹکڑھا کر چکر کھا رہا تھا اور کہیں دیوانہ وار دوڑا جا رہا تھا۔

ہماری کشتی ایک کونے سے دوسرے کونے کی طرف جا رہی تھی۔ فقط اتنا ہی معلوم ہو رہا تھا۔ مگر اس پار کی لامحدود تاریکی میں کوئی جگہ مقرر کر کے اندر چھو پکڑے بیٹھا ہے۔ یہ میں بالکل ہی نہ جانتا تھا۔ اس عمر میں وہ کتنا کامیاب ملاح بن گیا ہے۔ اس کا میں اس وقت تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اچانک وہ بولا۔

”کیوں رے شری کانت، ڈر لگتا ہے کیا؟“

میں بولا۔۔۔ ”نہیں“

اندر خوش ہو کر بولا۔۔۔ ”یہی تو چاہئے۔ جب تیرنا آتا ہے تو پھر ڈر کس بات کا؟“ جواب میں، میں نے ایک مختصر سی آہ کو دبا کر کہہ دیا کہ وہ سن نہ لے مگر ایسی گہری تاریک رات میں، اتنے پانی اور اس قدر بے پناہ بہاؤ میں تیرنا جانے اور نہ جانے میں کیا فرق ہے؟ یہ میری سمجھ میں نہ آ سکا۔ اس نے بھی اور کوئی بات نہ کہی۔ بہت دیر تک اسی طرح چلتے رہتے کے بعد کہیں سے کچھ آواز سی آئی۔ جو کہ مبہم اور

ملاحوں نے یہ سمجھ کر کہ نہر کا بڑا دروازہ محفوظ ہے اس جگہ پر پہرہ نہیں رکھا تھا۔ اسے ”مایا جال“ کہتے ہیں۔ نہر میں جن دنوں پانی رہتا ہے۔ تو اس کنارے سے لے کر اس کنارے تک اونچے اونچے لٹھ مضبوطی سے گاڑ دیے جاتے ہیں اور ان کے باہر کی طرف جال لٹکا دیا جاتا ہے۔ بعد میں برسات کے دنوں میں جب پانی کے بہاؤ میں بڑے بڑے روہو، کا تلاؤ وغیرہ مجھ بہ کر آتے ہیں تو ان لٹھوں سے رک کر وہ کو دوسری طرف آ جانا چاہتے ہیں اور سی کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔

دس پندرہ بیس سیر کے پانچ چھ روہو، کا تلاؤ مجھ دم بھر میں پکڑ کر اندر نے ناؤ پر رکھ دیئے۔ جسم مجھ راج اپنی دم کی پھنکار سے ہماری اس چھوٹی سی ناؤ کو ترو بالا کرنے لگے۔ اور ان کے اوچھل کود کی آواز بھی کچھ کم نہ تھی۔

”اتنی مچھلیوں کو کیا کرو گے بھائی؟“

”ضرورت ہے۔ بس اب اور نہیں۔ چلو بھاگ چلیں۔“ کہہ کر اس نے جال چھوڑ دیا۔ اب ڈانڈ چلانے کی ضرورت نہ رہی۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ اسی طرح چوری چھپے اسی راستہ سے باہر ہونا تھا۔ مطابق بہاؤ میں دو تین منٹ تیز رفتار سے بننے کے بعد اچانک ایک جگہ پر دھکا کھا کر ہمارے وہ چھوٹی سی ناؤ مکئی کے ایک کھیت میں داخل ہو گئی۔ اس کے اس بے موقعہ راستہ تبدیل کر لینے سے میں نے حیران ہو کر پوچھا..... ”کیوں؟ کیا ہوا؟“

اندر نے ایک دھکادے کر اسے کچھ اور بھی اندر لے جاتے ہوئے کہا..... ”خاموش! سالوں کو علم ہو گیا ہے..... چار کشتیاں کھول کر سالے ہمیں آ رہے ہیں۔ وہ دیکھو۔“ اندر سچ ہی کہہ رہا تھا۔ زور کے ساتھ پانی کو کٹتی اور چھپ چھپ آواز کرتی ہوئی تین کشتیاں ہمیں نکل جانے کے لیے سیاہ فام بھوتوں کی طرح دوڑی آ رہی ہیں۔ اس طرف تو جال سے راستہ بند تھا۔ اور اس طرف سے یہ لوگ آ رہے تھے۔ بھاگ کر چھنکارہ پانے کی ذرا سی بھی فرصت نہ تھی۔ مکئی کے اس کھیت میں اپنے آپ کو چھپایا جاسکے گا؟ یہ بھی مجھے ممکن معلوم نہ ہوا۔

”اب کیا ہوگا بھائی.....“ کہتے کہتے میرا گلاروندھ گیا۔ ”اس تاریکی میں، اس بنجرے کے اندر یہ لوگ اگر ہمارا خون کر کے بھی اس کھیت میں دبا دیں۔ تو انہیں کون روکے گا۔“

”اس سے بیشتر پانچ چھ مرتبہ“ چوری کافن بڑا فتن ہے“ اس بات کو باثبوت ثابت کر کے صاف نکل گیا تھا۔ اتنے دن تعاقب کیا جانے پر بھی ہاتھ نہیں آیا تھا مگر آج.....“

اس نے زبان سے تو کہا کہ ”ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔“ لیکن گویا اس کا لہجہ لرزٹھا۔ پھر بھی وہ رکنا نہیں۔ پوری طاقت سے چھوڑھکیل کر آہستہ آہستہ اندر چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔ تمام کا تمام:

ہنس کر بولا..... ”ارے اگر سالوں کو پہلے لگ بھی گیا تو کیا؟ پکڑ لینا کیا اتنا آسان ہے؟ دیکھ شری کانت کچھ بھی ڈر نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ ان لوگوں کی چار کشتیاں ہیں لیکن اگر یہ دیکھا کہ گھر ہی گئے ہیں اور بھاگ جانے کا کوئی چارہ نہیں ہے تو فوراً کود کر ڈبکی لگا جانا اور جتنی دور تک ممکن ہو جا کر نکلنا۔ بس کام بن جائیگا۔ اس تاریکی میں دیکھ سکنے کا تو کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد مزے سے ستویا کے نیلے پر چڑھ کر صبح کے وقت تیر کر اس پار آ جائیں گے۔ اور گنگا کے کنارے کنارے گھر پہنچ جائیں گے۔ بس پھر کیا کر سکیں گے سالے ہمارا۔“

یہ نام میں نے سنا تھا کہا..... ”ستویا کا نیلہ تو بالکل نالے کے مقابل ہے وہ تو بہت دور ہے۔“ اندر نے بے اعتنائی سے کہا..... ”کہاں بہت دور ہے؟ چھ سات کوس بھی تو نہ ہوگا۔ تیرتے تیرے ہاتھ تھک جائیں تو چپت ہو کر سستا لینا۔ اس کے علاوہ مردے جلانے کے کام آئے ہوئے بہت سے بڑے بڑے لکڑ بھی تو بہت مل جائیں گے۔“

جان بچانے کا جو آسان طریقہ تھا وہ اس نے بتا دیا۔ اس میں اعتراض کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ایسی تاریک رات، جس میں اطراف کا نام و نشان تک نظر نہ آتا تھا۔ اور اس تیز بہاؤ میں جس میں جابجا گرداب پڑ رہے تھے۔ سات کوس تک تیرتے جانا اور پھر صبح ہونے کا انتظار کرنا۔ صبح سے بیشتر اس طرف کنارے پر چڑھنے کا کوئی راستہ نہیں۔ دس پندرہ ہاتھ سیدھا ریت کا کنارہ ہے جو ٹوٹ کر سر پر آ سکتا ہے۔ اور اسی طرف گنگا کا بہاؤ نہایت تیزی سے بہہ رہا ہے۔

حالات کی نزاکت کا احساس کر کے میرے وسیع اور بہادر دل سکڑ کر بوند جیسا ہو گیا۔ کچھ دیر تک ڈانڈ چلا کر میں بولا..... ”لیکن ہماری ناؤ کا کیا ہوگا؟“

”اس دن بھی میں بالکل اسی طرح بھاگا تھا۔ اور اس کے دوسرے ہی دن آ کر ناؤ نکال لے گیا۔ کہہ دیا تھا کہ گھاٹ پر سے کشتی چرا کر اور کوئی لے گیا ہوگا میں نہیں لایا۔“

تو یہ سب اس کا خیال ہی نہیں ہے۔ بالکل آرمودہ نسخہ ہے۔ رفتہ رفتہ کشتی خلیج کے سامنے آ پہنچی۔ معلوم ہوا کہ ملاحوں کی کشتیاں قطار باندھ کر خلیج کے منبع پر کھڑی ہیں اور ان میں چراغ بھی ٹمٹما رہے ہیں۔ دو نیلوں کے درمیان کا یہ بہاؤ نہر کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ ہم لوگ گھوم کر نہر کے دوسرے کنارے پر جا پہنچے۔ اس جگہ پانی کے بہاؤ کے بے شمار منبع بن گئے تھے۔ اور جنگلی جھاؤ کے پودوں نے باہم ایک دوسرے کو اوٹ میں کر رکھا ہے۔ ان میں سے ایک کے اندر سے ہو کر کچھ ہی دور جانے کے بعد ہم نہر میں داخل ہو گئے ملاحوں کی کشتیاں وہاں سے بہت دور کھڑی ہوئی کالی جھاڑیوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ اور بھی کچھ دور جانے پر ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے۔

پانی میں کود پڑے ہیں۔“

”کچھ نہیں۔ سانپ!“ کانپ کر میں کشتی میں سکر کر بیٹھ گیا۔ اور حیران ہو کر پوچھا: ”کیسے سانپ ہیں بھائی!“

اندر نے کہا: ”سب قسم کے سانپ ہیں۔ ٹونڈا۔ بونڈا۔ کوڑیال کالے وغیرہ۔ پانی میں بہتے بہتے آئے اور جھاڑیوں میں لپٹے رہے۔ کہیں بھی تواج بھر خشک زمیں نہیں ہے دیکھتے نہیں ہو؟“

”یہ تو دیکھتا ہوں۔“ خوف کے مارے میرے پاؤں کے ناخنوں سے لے کر سر کے بال تک کھڑے ہو گئے۔ لیکن اس بھلے مانس کے کانوں پر جوں تک نہ رہی۔ اپنا کام کرتے کرتے ہی وہ کہنے لگا: ”دو تین تو میرے ہی جسم کو چھوتے ہوئے بھاگ گئے ہیں۔ کئی ایک تو خوب مونے ہیں۔ مگر یہ کانتے نہیں۔ یہ خود ہی ڈر کے مارے مرے جا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ٹونڈا بونڈا ہونگے اور اگر بفرض محال کاٹ بھی جائیں تو کیا کیا جاسکتا ہے مرنا تو ایک دن ہوگا بھائی۔“ اسی طرح وہ اور بھی کچھ اپنے قدرتی اور شیریں گلے سے کہتا رہا۔ میرے کانوں تک کچھ تو پہنچا اور کچھ نہ پہنچا۔ میں خاموش اور بے حس و حرکت کاٹھ کی پتلی کی طرح ایک ہی جگہ پر ایک ہی جذبہ سے متاثر ہوئے بیٹھا رہا۔ سانس لینے میں بھی ڈر معلوم ہوتا تھا۔ ”چھپ“ سے کہیں کوئی میری کشتی میں ہی نہ آگرے!

اور خواہ جو ہو لیکن وہ کیسا آدمی ہے؟ انسان، دیوتا، بھوت وہ کیا ہے؟ کس کے ساتھ میں اس جنگل میں گھوم رہا ہوں۔ اگر انسان ہے تو کیا وہ نہیں جانتا کہ اتنی عظیم کائنات میں خوف نام کی بھی کوئی شے ہوتی ہے؟ اس کا دل کیا پتھر کا بنا ہوا ہے؟ کیا وہ ہماری ہی طرح سکر تا پھلتا بھی ہے؟ تو پھر اس دن کھیل کے میدان میں، سب کے بھاگ جانے پر، بالکل اجنبی ہوتے ہوئے بھی، مجھ اکیلے کوچ و سالم باہر نکال دینے کے لیے دشمنوں کے درمیان وہ جو گھس آیا تھا۔ رحم دلی اور ہمدردی کا وہ جذبہ بھی کیا اس پتھر دل میں پنہاں ہے؟ اور آج مصیبت کا تمام حال رائی رائی، تل تل جانتے ہوئے بھی، سنتے ہوئے بھی، چپ چاپ لا پرواہی سے وہ اس موت کے منہ میں کھڑا ہے۔ ایک مرتبہ منہ سے یہ بھی نہیں کہا کہ شری کانت بھائی ایک بار تو بھی نیچے اتر آ، وہ تو مجھے جبراً نیچے اتر کر کشتی کھنچوا سکتا تھا۔ یہ محض کھیل ہی تو نہیں ہے۔ زندگی اور موت کے آمنے سامنے کھڑے ہو کر اس عمر میں اتنا ایثار رکھنے انسانوں نے کیا ہے؟ کسی نمائش کے بغیر اس نے کتنے قدرتی لہجہ میں کہہ دیا کہ۔ ”مرنا تو ایک دن ہوگا ہی بھائی۔“ ایسی صداقت کہتے ہوئے کتنے لوگ دکھائی دیتے ہیں؟ یہ سچ ہے کہ اس مصیبت میں وہی مجھے کھنچ لایا تھا۔ تاہم اس کے اتنے بڑے ایثار کو میں انسان ہو کر بھی کس طرح نظر انداز کر سکتا ہوں؟ کس طرح فراموش کر دوں اسے۔ جس کے دل سے اتنا عظیم جذبہ اتنی آسانی سے اند پڑا۔ اس دل کو کس نے کس شے سے

پانی ہو رہا تھا۔ اس کے اوپر آٹھ آٹھ دس دس ہاتھ لیے کئی اور جوار کے پودے تھے اور اندر ہم دونوں پور۔ کسی جگہ تو پانی چھاتی تک تھا اور کہیں کمر تک اور کہیں گھٹنوں سے زیادہ نہیں۔ سر پر لامحدود تار کی اور آگے پیچھے دائیں بائیں گھنا جنگل۔ ڈانڈ کچڑ میں دھسنے لگی۔ اور ناؤ اب ایک ہاتھ بھی آگے بڑھنے سے انکار کرنے لگی۔ پیچھے کی طرف سے ملاحوں کی بات چیت کی مبہم ہی آواز کانوں میں آنے لگی۔ اس بات میں اب رتی بھر شک و شبہ نہ تھا کہ ضرور کسی شبہ کی بنا پر ہی وہ لوگ چلے آئے ہیں اور اب بھی تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔

دفعہ ناؤ ایک طرف کچھ جھک کر سیدھی ہو گئی ہے۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ میں اکیلا ہی رہ گیا ہوں۔ دوسرا ساتھی نہیں ہے۔ ڈرتے ہوئے میں نے آواز دی: ”اندر“ پانچ چھ ہاتھ دور جنگل میں سے آواز آئی: ”میں نیچے ہوں۔“

”نیچے کیوں؟“

ناؤ کو کھینچ کر ناٹا ہوگا میری کمر سے رسی بندھی ہے۔“

”کھینچ کر کہاں۔ لے جاؤ گے؟“

”اس گنگا میں تھوڑی ہی دور لے جانے پر بڑا بہاؤ مل جائیگا۔“

سن کر میں خاموش ہو گیا۔ ناؤ آگے بڑھنے لگی۔ اچانک کچھ دور جنگل میں سے کنسٹر پیٹنے اور پھٹنے بانس کی پھٹا پھٹ آواز سے میں چونکا۔ ڈرتے ہوئے میں نے پوچھا: ”وہ کیا ہے بھائی؟“

”رکھو! لے چان پر بیٹھے ہوئے جنگلی سؤروں کو بھگا رہے ہیں۔“

”جنگلی سؤر! کہاں ہیں وہ؟“ اندر ناؤ کھینچتے ہوئے لا پرواہی سے بولا: ”مجھے کیا نظر آتا ہے جو تمہیں بتاؤں۔ ہو گئے یہیں کہیں“ جواب سن کر میں چپ ہو رہا۔ سوچا کس کام نہ دیکھا تھا آج صبح۔

شام ہی تو آج گھر کے اندر بیٹھنے کے ہاتھ پڑ گیا تھا۔ اب اگر اس جنگل میں جنگلی سؤروں کے ہاتھ جاؤں تو اس میں تعجب ہی کیا ہے۔ پھر سوچا میں تو کشتی میں بیٹھا ہوں مگر یہ انسانی چھاتی تک کچڑ اور نی میں اس جنگل میں کھڑا ہے۔ ایک قدم ملنے جلنے کا راستہ بھی اس کے پاس نہیں ہے۔ تقریباً پندرہ منٹ اسی طرح سوچتے سوچتے گزر گئے۔ اور بھی ایک بات پر میری نگاہ تھی۔ اکثر دیکھا تھا کہ قریب ہی کسی نہ کسی جوار یا کئی کے پودے کا بالائی حصہ بکا یک ملنے لگتا تھا۔ اور چھپ چھپ آواز ہوتی تھی۔ ایک دفعہ تو میرے ہاتھ کے پاس ہی حرکت ہوئی۔ مشکوک ہو کر اس طرف میں نے اندر کی توجہ کشش کی کہ ”بڑا سؤر تو نہ کسی کوئی بچہ سؤر تو نہیں ہے؟“

اندر نے نہایت ہی آہستہ آواز میں جواب دیا۔ ”وہ کچھ نہیں سانپ لپٹے ہیں۔ آہٹ پا کر

بنایا ہوگا؟ اس کے بعد کتنی مدت، کتنے آرام اور مصیبتوں سے گزر کر میں آج بوڑھا ہوا ہوں۔ کتنے ملک، کتنے صوبے، کتنے ندی نالے، پہاڑ پر بت، بن جنگل گھوما پھرا ہوں۔ قسم قسم کے انسان ان دو آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے ہیں لیکن اتنا عظیم انسان تو بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ لیکن وہ اب نہیں رہا۔ گویا وہ پانی کے ایک بلبلے کی طرح لامحدود میں مل گیا۔ آج اس کی یاد آتے ہی دونوں آنکھیں بھر آتی ہیں۔ محض ایک فضول سا فرد کی سطح پر جھاگ کی طرح تیرنا نظر آتا ہے۔ اے پروردگار، تو نے اس عجیب و غریب اور لاثانی مخلوق کو کس لیے پیدا کر کے دنیا میں بھیجا تھا۔ اور اس طرح بیکار کر کے اسے واپس کیوں بلالیا میرا درد آشناد! آج بیتاب ہو کر بار بار یہی سوال کرتا ہے۔ بھگوان! رو یہ پیسہ، دھن دولت، علم و عقل، تو اپنے انمول خزانہ سے انبار کے انبار تقسیم کرتے ہوئے تمہیں دیکھتا ہوں۔ لیکن ایسی عظیم شخصیتیں آج تک تم کتنی عطا کر سکے ہو؟ خیر جانے دو اس بات کو۔ گھرے پانی کا زور دار بہاؤ ہر لحظہ قریب سے قریب تر آتا رہا تھا۔ اس بات کو میں اچھی طرح جان رہا تھا۔ اس لیے مزید سوال کیے بغیر میں نے سمجھ لیا کہ اس خوفناک جنگل میں ہی وہ زور دار بہاؤ بہہ رہا ہے۔ جس کو سنیر بھی پار نہیں کر سکتے۔ میں اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ پانی کا زور بڑھ رہا ہے اور زرد رنگ کی جھاگ پر ریت کے ٹیلوں کا گمان ہو رہا ہے۔ اندر ناؤ پر چڑھ گیا اور ڈانڈ کو ہاتھ میں لے کر سامنے کے دیوانہ وار بہاؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو بیٹھا۔ وہ بولا..... ”اب کوئی تشویش نہیں ہے۔ ہم بڑی گنگا میں آ پہنچے ہیں۔“ دل ہی دل میں کہا..... ”اب ڈر نہیں ہے تو اچھا ہی ہے مگر تمہیں ڈر کس بات کا ہے؟ یہ تو میں سمجھا ہی نہیں۔“ لمحہ بھر بعد ہی ناؤ ایک بار گویا سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔ اور چشم زدن میں، میں نے دیکھا کہ وہ بڑی گنگا کے بہاؤ میں بجلی کی سی رفتار سے دوڑی جا رہی ہے۔ اس وقت اڑتے ہوئے بادلوں کی اوٹ میں ایسا معلوم ہوا۔ گویا چاند طلوع ہو رہا ہو۔ کیونکہ جس اندھیرے میں ہم اب تک سفر کرتے آ رہے تھے۔ وہ اندھیرا اب نہ رہا تھا۔ اب بہت دور تک اگرچہ صاف طور پر کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں نے دیکھا جنگلی جھاڑ اور کئی جوار کا ٹیلادائیں طرف چھوڑ کر ہماری ناؤ سیدھی جا رہی تھی۔



”بڑے زور سے نیند آ رہی ہے اندر! اب گھر لوٹ چلو بھائی۔“
اندر نے کچھ ہنس کر بالکل نسوانی پیاری طرح شیریں لہجہ میں کہا۔
”نیند آنے کی تو بات ہی ہے بھیا! لیکن کیا کیا جائے شری کانت! آج تو کچھ دیر ہوگی ہے۔ ابھی بہت کام بھایا پڑا ہے۔ اچھا ایسا کروا سی جگہ تھوڑا سالیٹ لو۔“
دوبارہ اصرار کی ضرورت ہی نہ رہی۔ میں سمٹ سٹنا کر اسی جگہ لیٹ گیا مگر نیند نہ آئی۔ نیم وا آنکھوں سے میں چپ چاپ آسمان میں بادلوں اور چاند کی آنکھو پھولی دیکھنے لگا۔ یہ ڈوباؤہ نکلا۔ پھر ڈوبا پھر نہا۔ اور کانوں میں پانی کے بہاؤ کا وہی شور سنائی دینے لگا۔ یہ ایک ہی بات اکثر میرے دل میں آیا کرتی ہے کہ اس دن میں سب کچھ بھول کر میں اس طرح بادل اور چاند کے درمیان کیسے ڈوب گیا تھا..... بالکل مجھو ہو کر چاند دیکھنے کی عمر تو اس وقت میری نہ تھی۔ مگر بڑے بڑے لوگ زمین کی گردش وغیرہ سے کئی نتیجے اخذ کیا کرتے ہیں کہ یہ ظاہر چاند کچھ بھی نہیں ہے۔ بادل بھی کچھ نہیں ہے۔ سب دھوکہ ہے سب وہم ہے فی الحقیقت اگر کوئی شے ہے تو وہ ہے صرف اپنا دل۔ وہ جب جس کو جو کچھ دکھاتا ہے مجھو ہو کر وہ صرف وہی دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ میری بھی یہی حالت ہے۔ اتنے زبردست حادثات سے اس طرح صحیح و سالم بچ کر باہر نکل آنے کے بعد میرا مردہ سادل اس وقت شاید ایسی ہی کسی ایک سکون پر تصویر میں چین حاصل کرنا چاہتا تھا۔

گھنٹہ دو گھنٹے نکل گئے اور مجھے ان کی کچھ خبر ہی نہ ہوئی۔ یکا یک مجھے معلوم ہوا کہ چاند بادلوں میں ایک طویل ڈبکی لگا گیا ہے۔ اور دائیں طرف سے جا کر بائیں طرف اپنا سر نکال رہا ہے۔ گردن ذرا اوپر اٹھا کر دیکھا۔ ناؤ اب اس طرف جانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ کچھ پوچھنے یا کہنے کا اس وقت مجھے ذرا سا خیال باقی نہ تھا۔ اس لیے میں پھر بدستور لیٹ رہا۔ پھر وہی آنکھ بھر کر چاند دیکھنے کا کھیل اور کان بھر کر بہاؤ کی گرج سننے لگا۔ شاید اسی طرح ایک گھنٹہ اور بھی گزر گیا۔

کھس س ریت کے ٹیلے پر ناؤ ٹکرائی۔ چونک کر میں اٹھ بیٹھا رہے، یہ تو اس پر آپہنچے۔ مگر یہ جگہ کون سی ہے؟ میرا گھر کتنی دور ہے؟ ریت کے انبار کے سوا تو اور کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ سوال کرنے سے پیشتر ہی یکا یک کہیں پاس سے ہی کتے کے بھونکنے کی آواز سن کر میں اور بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ یقیناً قریب ہی کہیں کوئی بستی ہے۔

اندر بولا..... ”ذرا ٹھہر شری کانت! میں تھوڑا سا گھوم کر ابھی آ جاؤں گا۔ تجھے اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس کنارے کے اس پار ہی ملاحوں کے مکان ہیں۔“

حوصلہ کی اتنی زیادہ آزمائشیں پاس کرنے کے بعد آخر کار یہاں پہنچ کر فیل ہو جانے کی میری بالکل ہی خواہش نہ ہوئی اور خصوصاً انسان کی اس جواں سالی میں جس کی مانند عظیم حیرت افزا شے دنیا بھر میں شاید اور کوئی نہیں ہے ایک تو یونہی انسان کی ظاہرہ نقل و حرکت ناقابلِ تسخیر ہوتی ہے اور پھر جواں لڑکے اور لڑکی کے دل کا جذبہ تو میں سمجھتا ہوں بالکل ہی ناقابلِ تسخیر ہے۔ اسی لیے شاید برندا بن کے ان جواں دیوانوں کی جواں فکر داستان مدتوں سے دلوں میں کیف برسا رہی ہے۔ عقل کے ذریعہ تسلیم نہ کر سکتے کی وجہ سے کسی نے اسے کہا..... ”اچھی“ کسی نے کہا..... ”بری“ کسی نے اسے پالینکس کہا۔ کسی نے کچھ اور..... کسی نے کوئی بات بھی نہ سنی وہ بحث و تمحیص کی حدود سے پار ہو گئے جو پار ہو گئے وہ غرق ہو گئے۔ پاگل بن گئے اور ناچ کر، رو کر، گا کر سب کچھ یکساں کر کے دنیا کو گویا انہوں نے ایک اچھا خاصا پاگل خانہ بنا چھوڑا۔ تو جن لوگوں نے ”بری“ کہہ کر گالیاں دی تھیں انہوں نے بھی کہا کہ اور خواہ کچھ بھی ہو مگر اس کیف کا سرچشمہ دوسری جگہ کہیں نہیں ہے۔ جن کی طبیعت کے ساتھ اس داستان کا میلان نہیں ہوتا تھا انہوں نے بھی قبول کیا کہ ان پاگلوں کے گروہ کو چھوڑ کر ہم نے ایسا گانا اور کہیں نہیں سنا۔ مگر یہ واقعہ جس بنیاد پر قائم ہوا جوازی اور ابدی ہے اور ساتھ ہی ہمیشہ نئی بھی..... برندا بن کے بن بن میں ہونے والی جوانی کی اس حسین داستان کا خاتمہ آج تک کسی کو بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ جن کے نزدیک دیدانت ہیچ و پوج ہے اور مکتی کی خواہش جن کی نگاہ میں قلمز کے مقابلہ میں ایک حقیر بوند کی مانند ہے نہ کسی نے کبھی حاصل کیا ہے اور نہ کبھی کوئی تلاش کر سکے گا۔ اس لئے تو میں نے کہا تھا کہ اس وقت میں وہی جواں سال تھا۔ گو اس وقت جوانی کی چنگی اور اس کا نور نہ آیا تھا۔ تاہم اس پر ناز کرنا تو سیکھ گیا تھا۔ خود ستائی کا جذبہ تو دل میں بیدار ہوا اٹھا تھا۔ اس وقت اپنے دوست کے نزدیک اپنے آپ کو بزدل ثابت کرنا کون برداشت کر سکے گا۔ اس لئے میں نے اسی دم جواب دیا۔ ”میں ڈروں گا کیوں؟ جاؤ“ اندر نے اور دوسرا لفظ ضائع نہ کیا اور وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا غائب ہو گیا۔

سر پر نور اور تاریکی میں وہ آنکھ چولی ہو رہی تھی۔ پشت کی طرف بہت دور تک لہروں کی گرج

سنائی دے رہی تھی اور سامنے وہی ریت کا کنارہ تھا۔ یہ کون سا مقام ہے سوچ ہی رہا تھا کہ اندر دوڑنا ہو آ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا..... ”مجھ سے ایک بات کہنے کے لئے واپس آیا ہوں۔“ اگر کوئی مچھلی مانگنے کے لئے آئے تو خبردار دینا نہیں۔ کہہ دیتا ہوں خبردار، ہرگز نہ دینا، کہنا تیرے منہ پر خاک، مرضی ہو تو خود ہی اٹھالے جا خبردار ہاتھ سے کسی کو اٹھا کر نہ دینا۔ خواہ میں بھی کیوں نہ ہوں۔ خبردار۔“

”یہ کیوں بھائی؟“

”واپس آنے پر بتاؤں گا۔ لیکن خبردار.....“ یہ کہتے کہتے وہ جس طرح آیا تھا اسی طرح دوڑتا

ہوا چلا گیا۔

اس مرتبہ سر سے پاؤں تک میرے جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ جسم کی تمام شریانوں میں برف کا پانی بہہ رہا ہے۔ میں بالکل بچہ ہی بچہ تو تھا نہیں جو اس کے اشارے کا مطلب بالکل ہی سمجھ نہ سکتا۔ میری زندگی میں اس قسم کے بے شمار واقعات رونما ہو چکے ہیں جن کے مقابلہ میں یہ واقعہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح بحرناپید کنار کے مقابلہ میں گائے کے کھر کے گڑھے میں بھرا ہوا پانی۔ مگر پھر بھی اس رات کے سفر میں جو خوف اور ڈر میں نے محسوس کیا اسے الفاظ کے ذریعہ ادا کرنا مشکل ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہوش و حواس گم کرنے کے آخری زینہ پر آ کر ہی میں نے قدم رکھ دیا ہے۔ اور ہر لمحہ یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ کنارے کے اس طرف سے گویا کوئی بار بار جھانک کر دیکھ رہا ہے۔ جونہی میں ترجیحی نظر سے دیکھتا ہوں وہ سر نیچا کر کے چھپ جاتا ہے۔

وقت کتنا نہیں تھا ایسا معلوم ہوتا تھا صدیاں گزر چکی ہیں اور اندر واپس لوٹ کر نہیں آیا۔

ایسا معلوم ہوا کہ کسی انسان کی آواز سنی ہو۔ جینیو کو انگوٹھی میں سینکڑوں بار لپٹ کر، منہ نیچا اور کان کھڑے کر کے سننے لگا۔ گلے کی آواز رفتہ رفتہ صاف ہونے لگی۔ اچھی طرح معلوم ہونے لگا کہ دو تین شخص بات چیت کرتے ہوئے اسی طرف آ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو اندر ہے اور باقی دو ہندوستانی وہ خواہ کوئی بھی ہوں مگر ان کے چہرے دیکھنے سے پہلے میں نے یہ اچھی طرح دیکھ لیا کہ چاندنی میں ان کا سایہ زمین پر پڑتا ہے یا نہیں کیونکہ اس حقیقت کو میں بچپن سے ہی جانتا تھا کہ ان لوگوں (بھوتوں) کا سایہ نہیں ہوتا۔

آہ یہ تو سایہ ہے۔ گو صاف نہیں مگر پھر بھی سایہ تو ہے۔ اس دن دنیا بھر میں کسی بھی انسان نے کسی بھی شے کو دیکھ کر مجھ سا سکون حاصل کیا تھا؟ حاصل کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن یہ بات تو میں شرط باندھ کر کہہ سکتا ہوں کہ نگاہ کی انتہائی مسرت جسے کہتے ہیں۔ وہ یہی ہے۔ جو لوگ آئے انہوں نے نہایت تیزی سے ان بڑے بڑے مجھروں کو کشتی سے اٹھا کر جال کی قسم کے کپڑے کے ایک ٹکڑے میں باندھ لیا اور

”کن سب کو؟“

”وہی جو کچھ مانگتے آتے ہیں۔“

”نہیں بھائی دیکھا تو نہیں۔ لیکن لوگ جو کہتے ہیں وہ سنا ہے۔“

”اچھا تم یہاں اکیلے آ سکتے ہو؟“

”خوف معلوم نہیں ہوتا؟“

”نہیں، رام کا نام لیتا ہوں پھر وہ کسی طرح نہیں آ سکتے۔“

کچھ دیر رک کر پھر کہنا شروع کیا۔ ”رام نام کیا کوئی معمولی شے ہے اگر تو رام کا نام لیتے ہوئے سانپ کے منہ میں بھی چلا جائے تو تیرا کچھ نہ بگڑے گا۔ دیکھے گا کہ مارے ڈر کے سبھی راستہ چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ مگر ڈرنے سے کام نہیں چلتا۔ پھر تو وہ جان جاتے ہیں کہ یہ صرف چالاکی کر رہا ہے۔ وہ سب غیب کا علم جو جانتے ہیں۔“

ریت کا کنارہ ختم ہوتے ہی نکلروں کا کنارہ شروع ہو گیا۔ اس طرف کی نسبت اس طرف پانی کی رفتار کم تھی۔ بلکہ یہاں تو ایسا معلوم ہوا گویا بہاؤ برعکس سمت جارہا ہے۔ اندر نے بانس اٹھا کر چوڑا ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ”وہ جو سامنے جنگل سا نظر آ رہا ہے۔ اسی میں سے ہو کر ہمیں جانا ہے۔ یہاں ذرا میں اتروں گا۔ جاؤں گا اور آ جاؤں گا۔ دیر نہ لگے گی کیا خیال ہے اتر جاؤں؟“

خواہش نہ ہوتے ہوئے بھی میں نے کہا۔ ”اچھا“ کیونکہ نہ کہنے کا راستہ تو ایک طرح سے میں خود ہی بند کر چکا تھا اور اب اندر بھی شاید میری بے خونی کا قائل ہو چکا تھا۔ لیکن یہ بات مجھے معلوم نہ ہوئی۔ یہاں سے وہ جگہ جنگل کی مانند ایسی تاریک نظر آ رہی تھی کہ ابھی ابھی رام نام کی غیر معمولی فضیلت سننے پر بھی اس تاریک رات میں برگد کے اس پرانے درخت نے نیچے کشتی پر تباہیڈھ کر اتنی رات گزرے رام نام کی طاقت کی آزمائش کرنے کی میری ذرا سی بھی خواہش نہ ہوئی۔ اور جسم میں کپکپی سی ہونے لگی۔ یہ درست ہے کہ مچھلیاں اب او نہیں تھیں۔ اس لئے مچھلیاں مانگنے والوں کا نشان و گمان بھی نہ ہو سکے گا۔ لیکن ان سب کا لالچ صرف مچھلیوں کے لئے ہی ہے یہ بھی کون کہہ سکتا ہے۔ انسان کی گردن مروڑ کر تازہ تازہ خون پینے اور گوشت کھانے کی داستان بھی کئی مرتبہ سن چکا ہوں۔“

بہاؤ کی مطابقت اور ڈانڈ کے زور سے ناؤ آگے بڑھنے لگی اور بھی کچھ دور جاتے ہی، دافنی طرف گردن تک ڈوبا ہوا جنگلی جھاڑ اور کانٹوں کا جنگل سر اٹھا کر ہم دو بہادر بچوں کی طرف حیرت و استعجاب سے دیکھتا رہا۔ اور اس میں سے کوئی کوئی جھاڑ تو سر ہلا کر گویا ”اندر آنے کی اجازت نہیں“ کا حکم دینے لگا۔ بانس طرف بھی ان ہی کے بھائی بند خوب اونچے پتھر لیے کناروں پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ بھی اسی

اس کے عوض میں انہوں نے اندر کی مٹھی میں جو کچھ تھا دیا۔ اس کے کھن کی ایک آواز کے دلکش لفظ سے اپنا تعارف بھی میرے سامنے پوری طرح پوشیدہ نہ رہنے دیا۔

اندر نے ناؤ کھول دی۔ لیکن بہاؤ میں نہ چھوڑی۔ بہاؤ کے قریب بہاؤ کے خلاف بانس چلاتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

میں نے کوئی بات نہ کہی۔ کیونکہ میرا دل اس وقت اس کے خلاف نفرت اور بے اعتنائی کے جذبہ سے لبا لب بھر گیا تھا۔ مگر یہ کیا؟ ابھی ابھی تو اسے چاند کی روشنی میں سایہ ڈال کر لوٹتے ہوئے دیکھ کر بیتابانہ محبت سے دودھ کر سینے سے لگا لینے کے لئے بے قرار ہوا تھا تھا۔

ہاں تو انسان کی فطرت ہی اس قسم کی ہے۔ ذرا ساعیب دیکھتے ہی لمحہ بھر پیشتر کی تمام باتیں بھول جاتی ہیں اور اس میں دیر ہی کتنی لگتی ہے؟ رام! رام! اس نے اس طرح روپے حاصل کئے۔ اب تک مچھلی جرانے کا یہ بیوپار میرے دل میں بہت نمایاں طور پر چوری کی شکل میں شاید جگہ نہ پاسکا تھا کیونکہ لڑکپن سے ہی روپے پیسوں کی چوری ہی حقیقی چوری تھی۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو کھن کی آواز کے کان میں داخل ہوتے ہی اتنی دیر کی بہادری، دیدہ دلیری سب کچھ چشم زدن میں ہی خشک نیلے کی طرح ہوانہ ہو جاتی۔ اگر ان مچھلوں کو لنگا میں پھینک دیا جاتا۔۔۔۔۔ یا کچھ اور کیا جاتا صرف روپوں کے ساتھ ہی ان کا کوئی تعلق پیدا نہ ہوتا تو اگر ہماری اس تفریح کو کوئی چوری کہہ کر پکارتا تو شاید غصے میں آ کر اس کا سر پھوڑ ڈالتا اور سمجھتا کہ اس کو حقیقت میں جو سزا ملنی چاہئے وہی اسے ملی ہے۔ مگر رام! رام! یہ کام۔ یہ کام تو جیل خانے کے قیدی کیا کرتے ہیں۔

اندر نے بات شروع کی۔ ”پوچھا۔۔۔۔۔ تمہیں کچھ بھی ڈر محسوس نہیں ہوا کیوں رے شری کانت!“

میں نے مختصر جواب دیا۔ ”نہیں۔“

اندر بولا۔ ”مگر تیرے سوائے وہاں اور کوئی بیٹھا نہ رہ سکتا یہ جانتا ہے تو۔ تجھے میں خوب پیار کرتا ہوں۔۔۔۔۔ میرا ایسا دوست اور کوئی نہیں ہے جب کبھی بھی میں آؤں گا۔ صرف تجھے ہی ساتھ لاؤں گا، کیوں؟“

میں نے جواب نہ دیا۔ مگر اسی وقت اس کے چہرے پر بادلوں کی زد سے حال ہی میں آزاد ہوئے چاند کی جو کرن پڑی اور اس سے اس کے چہرے پر جو کچھ نظر آیا۔ اس سے متاثر ہو کر یکایک میں اپنا اتنی دیر کا سب غم و غصہ بھول گیا۔ میں نے پوچھا۔

”اچھا اندر تم نے کبھی ان سب کو دیکھا ہے؟“

طرح دیکھتے رہے اور اسی طرح منع کرنے لگے۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو ان کا حکم کبھی نہ ٹالتا لیکن میرا ہنما بھی تو موجود تھا۔ اس کے نزدیک تو ہر قسم کی اجازت اور ممانعت صرف ایک رام نام کے زور سے ہی بیکار ہو جاتی۔ اس نے کسی کی طرف اپنی بھوں تک نہ پھرائی۔ دائیں طرف کے ٹیلے کے زیادہ پھیلاؤ کی وجہ سے یہ جگہ ایک جھیل سی بن گئی تھی۔ صرف مشرق کی طرف کا منہ کھلا ہوا تھا میں نے پوچھا۔ ”اچھا کشتی کو باندھ کر اوپر جانے کے لئے گھاٹ تو ہے ہی نہیں۔ تم کس طرح جاؤ گے؟“

اندر بولا۔۔۔۔۔ ”یہ جو بڑا درخت ہے۔ اس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا گھاٹ ہے۔“

کچھ دیر سے گاہے گاہے ہوا کے ساتھ کسی قسم کی نامعلوم بدبو ناک تک آ رہی تھی۔ یکا یک ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ وہ بدبو اتنی قریب ہو کر ناک میں گھسی کہ اس کا برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ جتنا ہی آگے بڑھتے تھے۔ اتنی ہی وہ بھی بڑھتی تھی۔ ناک پر کپڑا دبائے ہوئے میں نے کہا۔۔۔۔۔ ”یقیناً ہی کچھ سڑ گیا ہے اندر!“

اندر بولا۔۔۔۔۔ ”مردے سڑ رہے ہیں۔ آج کل مہلک ملیر یا پھیل رہا ہے۔ اسی لئے تو لاشوں کو جلایا نہیں جاسکتا۔ منہ پر تھوڑی سی آگ لگا کر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ گیدڑ اور کتے کھاتے ہیں اور وہ پڑی پڑی سڑتی رہتی ہیں۔ انہیں کی تو اتنی سخت بدبو ہے۔“

”لاشوں کو کس جگہ پھینک جاتے ہیں بھیا؟“

”وہاں سے لے کر یہاں تک۔۔۔۔۔ سب ہی تو شمشان ہے۔ جہاں چاہے پھینک دیتے ہیں اور اس بڑے نیچے گھاٹ پر نہا کر واپس گھر چلے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ ارے در، در کیا ہے رہے۔ وہ گیدڑ گیدڑ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اچھا آ میرے پاس بیٹھ۔“

میرے گلے سے آواز نہ نکلتی تھی۔ کسی طرح میں گھسٹ کر اس کی گود کے نزدیک جا کر بیٹھ گیا۔ دم بھر کے لئے مجھے چھو کر اور ہنس کر بولا۔۔۔۔۔ ”ڈر کیا ہے شری کانت! کتنی ہی مرتبہ رات کو میں اسی راستے سے آیا گیا ہوں۔ تین دفعہ رام کا نام لینے سے پھر کس کی طاقت ہے جو پاس تک بھی پھیلے؟“

اسے چھو کر گویا میرے جسم میں بھی جان آئی۔ میں نے لڑکھڑائی آواز میں کہا۔۔۔۔۔ ”نہیں بھائی! تمہارے پاؤں پڑتا ہوں۔ یہاں کہیں بھی مت اترو۔۔۔۔۔ سیدھے ہی چلو۔“

اس نے پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔۔۔۔۔ ”نہیں شری کانت! ایک دفعہ جانا ہی پڑے گا۔ یہ روپے دیئے بغیر کام نہ چلے گا۔۔۔۔۔ وہ بیٹھے راہ دیکھ رہے ہوں گے۔۔۔۔۔ میں تین دن سے نہیں جا سکا۔“

”روپے کل نہ دے سکو گے بھائی؟“

”نہیں بھائی، ایسی بات نہ کہو، میرے ساتھ تو بھی چل۔ لیکن کسی کو یہ بات ہرگز نہ بتانا۔“

میں آہستہ سے ”نہ“ کہہ کر بدستور اسے چھوئے ہوئے پتھر کی مانند بیٹھا رہا۔ گلا خشک ہو کر لکڑی ہو گیا تھا۔ لیکن ہاتھ بڑھا کر پانی پی لوں یا پلٹے جلنے کی کوئی کوشش کروں یہ طاقت مجھ میں باقی نہ رہی۔

درختوں کے سایہ کے درمیان آ جانے سے قریب ہی وہ گھاٹ نظر آنے لگا۔ جس مقام پر ہمیں نیچے اترنا تھا وہ جگہ اوپر درخت وغیرہ نہ ہونے سے دھندلی چاندنی کی روشنی میں خوب چمک رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اتنی پریشانی میں بھی مجھے ایک مسرت کا احساس ہوا۔ گھاٹ کے ٹکڑوں کے ساتھ کشتی نکرا نہ جائے۔ اس لئے اندر پیشتر ہی اترنے کے لئے تیار ہو کر کشتی کے کنارے تک لھسک آیا تھا۔ کنارے لگتے ہی وہ اوپر سے کود پڑا۔ مگر کودتے ہی وہ خوفزدہ آواز میں ”اف“ کہہ اٹھا۔ میں اس کے پیچھے ہی تھا۔ اس لئے دونوں کی نگاہ اس شے پر تقریباً ایک ہی ساتھ پڑی۔ اس وقت وہ نیچے تھا اور میں کشتی کے اوپر۔ میری زندگی میں بے وقت اور ناگہانی موت، کبھی اس قدر دردناک شکل میں نظر نہ آئی تھی۔

وہ کس قدر سوہان روح ہوا کرتی ہے۔ یہ بات اس طرح نہ دیکھی جائے تو شاید اور کسی طرح سمجھی ہی نہیں جاسکتی۔ سنجیدہ رات میں ہر چہار اطراف خاموشی سے معمور تھیں۔ محض شمشان میں رہنے والے گیدڑوں کا بھوک سے بے تاب ہو کر چلانا اور درختوں پر سوئے ہوئے بڑے بڑے پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ یا بہت دور تیز پانی کے بہاؤ کی ”ہو ہو“ آواز اس سناٹے کو گاہے گاہے توڑتی تھی۔ ان سب کے درمیان بے حس و حرکت اور خاموش ہم کھڑے رہے۔ ایک چھ سات سال کی عمر کا گورا اور خوبصورت موٹا تازہ بچہ پڑا ہوا دکھائی دیا۔ جس کا تمام جسم پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور صرف سر ہی گھاٹ کے اوپر تھا۔ شاید گیدڑ ابھی بھی اسے پانی سے نکال رہے تھے۔ اور اب صرف ہماری غیر متوقع آمد سے کہیں پاس ہی کھڑے ہوئے ہمارے جانے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ اس کو مرے ہوئے زیادہ سے زیادہ تین چار گھنٹے ہوئے ہوں گے۔ گویا وہ بیچارہ مہلک ہیضہ کی سخت اذیت برداشت کر کے ماں گنگا کی گود میں ہی سو رہا تھا۔ اور

ماں بڑی احتیاط کے ساتھ اس کے نرم اور خوبصورت جسم کو اپنی گود سے اتار کر پھونکے پر سلا رہی تھی۔ اس طرح کچھ پانی اور کچھ خشکی پر پڑے ہوئے اس سوتے ہوئے بچے کے جسم پر ہماری نظر پڑی۔ سر اٹھایا تو دیکھا کہ اندر کی دونوں آنکھوں سے سیل اشک جاری ہے۔ وہ بولا۔۔۔۔۔ ”تو ذرا ہٹ کے کھڑا ہو جا شری کانت! اس بیچارے کو ناؤ میں رکھ کر ٹیلے کے اس پار کے جنگل میں رکھ آتا ہوں۔“

یہ سچ ہے کہ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھتے ہی میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ مگر اس چھونے اور اٹھانے وغیرہ کی تجویز سے میں یکبارگی مطمئن ہو اٹھا۔ اس بات کو میں نا منظور نہیں کرتا کہ

یہ سچ ہے کہ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھتے ہی میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ مگر اس چھونے اور اٹھانے وغیرہ کی تجویز سے میں یکبارگی مطمئن ہو اٹھا۔ اس بات کو میں نا منظور نہیں کرتا کہ

دوسروں کے دکھ سے دکھی ہو کر آنکھوں سے آنسو بہانا آسان کام نہیں ہے لیکن اسی وجہ سے اس کی مصیبت میں دونوں ہاتھ بڑھا کر شامل ہو جانا بہت مشکل امر ہے۔ اس وقت چھوٹی بڑی نامعلوم کتنی جگہوں پر وباؤ پڑتا ہے۔ اول تو میں روئے زمین کی سب سے افضل قوم ہندو گھرانے میں وراثت وغیرہ کے مقدس خون کا وارث ہو کر پیدا ہو۔ اس لئے پیدائشی رواجوں کے مطابق میں نے سیکھ رکھا تھا کہ مردہ اجسام کو چھونا بھی ایک بہت بڑا خطرناک کاروبار ہے۔ دوسرے ہمارے شاستروں نے اس کے لئے کتنی زبردست ممانعت کر رکھی ہے اور کتنی قسم کے کرم کا نڈوں کی کثرت ہے۔ اس کے علاوہ یہ کس بیماری سے مرا ہے؟ کس کا لڑکا ہے؟ کس قوم کا ہے؟ وغیرہ کچھ بھی نہ جانتے ہوئے اور مرنے کے بعد یہ ٹھیک طور سے باقاعدہ طور سے باقاعدہ آخری رسم ادا کر کے گھر سے باہر ہوا تھا یا نہیں۔ اس بات کا پتہ لئے بغیر ہی اسے کس طرح چھو جا سکتا ہے؟

اداس ہو کر جونہی میں نے پوچھا..... ”کس قوم کا مردہ ہے اور کیا تم اسے چھوؤ گے؟“ کہ آگے بڑھ کر اندر نے ایک ہاتھ اس کی گردن کے نیچے اور دوسرا ہاتھ گھٹنوں کے نیچے دے کر اسے خشک تنکے کی مانند اٹھالیا اور کہا..... ”ورنہ پیارے کو گیدڑ نوج نوج کر کھا جائیں۔“

اس کے منہ سے تو ابھی تک دو انیوں کی خوشبو آرہی ہے۔ یہ کہتے کہتے اس نے ناؤ جس پر پہلے میں سویا ہوا تھا۔ اسے لٹا دیا اور ناؤ کو دھکیل کر خود بھی چڑ گیا۔ بولا.....

مردے کی بھی کوئی قوم ہوتی ہے۔“

میں نے اعتراض کیا..... ”کیوں نہیں ہوتی؟“

اندر نے جواب دیا..... ”ارے تو یہ مردہ ہے۔ مرے ہوئے کی ذات کیا؟ یہ تو دیسے ہی ہے جیسے ہماری یہ کشتی..... اس کی بھلا کیا ذات ہے؟ آم یا جامن جس کی بھی لکڑی کی یہ بنی ہو..... اب تو اسے کشتی کے علاوہ کوئی بھی نہیں کہے گا کہ آم ہے یا جامن؟ سمجھا کہ نہیں؟ یہ بھی اسی طرح ہے۔“

اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمثیل محض بچوں کی سی نہیں تھی۔ لیکن دل میں یہ بھی تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ یہیں کہیں اس میں ایک تلخ حقیقت بھی پنہاں ہے۔ گاہے گاہے وہ ایسی ہی کھری کھری کہہ جایا کرتا تھا اس لئے میں نے کئی مرتبہ سوچا ہے کہ اس عمر میں کسی سے بھی علم حاصل کئے بغیر بلکہ مروجہ تعلیم کو بھی ترک کر کے، ان سب رموز کو اس نے کہاں سے سیکھا؟ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ میں نے اس کا جواب بھی حال کر لیا ہے۔ مگر دُریب تو گویا اندر میں تھا ہی نہیں۔ مقصد کو در پر دہ رکھ کر تو وہ کوئی کام کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں۔ اس کے دل کا وہ انفرادی حقیقت پسند جذبہ کسی غیبی اصول کے ماتحت عالمگیر سچائی کو مجسم بنا کر خود بخود با آسانی اسے اپنی طرف کشش کر کے

روح میں جذب کر لیتا تھا۔ اس کی پاکیزہ اور سلیم عقل کامل استاد کی امیدواری کے بغیر ہی تمام معاملہ کی مابیت کو اچھی طرح سمجھ لیتی تھی۔ درحقیقت بے ریا اور سلیم عقل ہی تو دنیا میں افضل و اکمل عقل ہے اس سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں۔ اچھی طرح دیکھنے سے وہم (باطل) نام کی کسی بھی شے کا وجود اس لامحدود کائنات میں نظر نہیں آتا۔ باطل تو صرف انسان کے ماننے اور منانے کا انجام محض ہے۔ سونے کو پیتل تسلیم کر لینا بھی باطل ہے اور تسلیم کرنا بھی..... یہ میرا ایمان ہے۔ لیکن اس سے سونے یا پیتل کا کچھ بگڑتا بنتا نہیں۔ تمہاری جو مرضی ہو اسے ماننے پھر۔ وہ تو جو کچھ ہے وہی رہے گا۔ سونا سمجھ کر اسے صندوق میں بند کر کے رکھنے سے اس کی حقیقی قیمت میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اور پیتل کہہ کر باہر پھینک دینے سے اس کی قیمت کم نہیں ہو جاتی۔ اس دن بھی وہ پیتل تھا اور آج بھی پیتل ہے۔ تمہارے باطل کے لئے تمہیں چھوڑ کر نہ اور کوئی جوابدہ ہے اور اس پر کوئی اعتراض ہی کرتا ہے۔ اس لامحدود کائنات کی ہر ایک شے حقیقت ہے۔ باطل کا وجود اگر کہیں ہے تو وہ انسان کے دل کے علاوہ اور کہیں نہیں ہے۔ اس لئے اندر نے اس باطل کو اپنے دل میں دیدہ دانستہ یا نادانستہ کسی دن بھی جب جگہ نہیں دی۔ تو اگر اس کی سلیم عقل نیکی اور حقیقت کو ہی حال کرتی ہے تو اس میں تعجب ہی کیا ہے؟

لیکن یہ بات اس کے لئے حیرت افزا نہ ہونے پر بھی میرا یہ دعویٰ نہیں کہ کسی کے لئے بھی حیرت افزا نہیں ہے۔ اسی بہانہ میں نے اپنی زندگی میں ہی اس کا جو ثبوت حاصل کیا ہے۔ اس کا بیان کر دینے کی خواہش کو ترک کر دینا میرے لئے ناممکن ہے۔

مندرجہ بالا واقعہ کے دس بارہ سال بعد اچانک شام کے وقت یہ طلاع ملی کہ بوڑھی برہمنی اس محلے میں صبح سے مری پڑی ہے..... کسی طرح بھی لوگ اس کے کرایا کرم کے لئے اکٹھے نہیں ہوتے۔ لوگوں کے جمع نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کاشی کی یا ترا سے لوٹتے وقت راہ میں بیمار ہو گئی اور اس شہر میں گاڑی سے اترنے کے بعد بالکل معمولی تعارف ہونے کے باعث جن کے گھر میں وہ ٹھہری تھی اور دو رات وہاں ٹھہر کر جان بحق ہوئی وہ حضرت ولایت سے لوٹے ہوئے تھے۔ اور برادری سے الگ تھے۔ بڑھیا کا یہی جرم تھا کہ اسے بالکل بے سرو سامانی اور کمپرسی کی حالت میں بھی، برادری سے خارج، اس گھر میں مرنا پڑا۔

خیر نذر آتش کر کے دوسرے دن صبح آ کر میں نے دیکھا کہ ہر ایک گھر کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ سننے میں آیا کہ گزشتہ رات گیارہ بجے تک ہری کین الٹین ہاتھ میں لے کر لوگوں نے گھر گھر گھوم کر فیصلہ دے دیا۔ کہ شاستر کے بالکل برعکس کام کرنے کی وجہ سے ان کو سرمنڈانا ہو گا۔ اپنا قصور تسلیم کرنا ہو گا اور ایک ایسی شے (گوبر) کھانی ہوگی جو پاکیزہ ہوتے ہوئے بھی انسانی خوراک نہیں

میں بولا..... ”اندر اب چلو۔“

اندر محو حیرت ہو کر بولا..... ”کہاں؟“

”ابھی جہاں چلنے کے لئے تم نے کہا تھا۔“

”رہنے دو آج نہیں جاؤں گا۔“

میں خوش ہو کر بولا..... ”ٹھیک یہی بہتر ہے بھائی! چلو گھر چلیں۔“

جواب میں اندر میرے منہ کی طرف دیکھ کر بولا..... ”ہاں رے شری کانت! مرنے کے بعد

انسان کا کیا ہوتا ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے؟“

میں نے فی الفور جواب دیا..... ”نہیں بھائی میں کیا جانوں کیا ہوتا ہے۔ اب تو تم گھر چلو

..... وہ سو سو رگ چلے جاتے ہیں بھیا۔ تمہارے پاؤں پڑتا ہوں۔ تم مجھے.....“

اندر نے گویا سنا ہی نہ ہوا اور کہا..... ”سب لوگ تو سو رگ جانیں سکتے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ

وقت تک تو ہر ایک کو یہاں رہنا پڑتا ہے دیکھو میں نے اس کو پانی کے اوپر سلا دیا تھا تو اس نے آہستہ سے

صاف صاف کہا تھا بھیا۔“ میں کانپتے ہوئے لہجہ میں روتے ہوئے بول اٹھا..... ”مجھے خواہ مخواہ ڈر رہا ہے

ہو تم! بھائی میں بیہوش ہو جاؤں گا۔“ اندر نے نہ تو کچھ کہا اور نہ ہی مجھے کسی طرح کی تسلی دی۔ آہستہ سے

ڈانڈ کو ہاتھ میں لے کر اس نے کشتی کو جھاؤ کے جنگل سے باہر کر لیا۔ اور پھر سیدھا چلانے لگا۔ منٹ یا دو

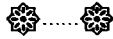
منٹ خاموش رہ کر اس نے سنجیدہ اور شیریں لہجہ میں کہا..... ”شری کانت! دل ہی دل میں رام کا نام لے،

وہ کشتی چھوڑ کر نہیں گیا ہے..... ہمارے پیچھے ہی بیٹھا ہے۔“

اس کے بعد میں اسی جگہ منہ ڈھانپ کر اوندھا ہو گیا تھا۔ پھر مجھے خبر نہیں رہی جب آنکھ کھلی تو

اندر میرا نہیں تھا۔ کشتی کنارے پر لگی ہوئی تھی۔ اندر میرے پاؤں کے پاس بیٹھا ہوا تھا بولا..... ”اب

قدرے چلنا ہو گا شری کانت اٹھ بیٹھ۔“



ہے۔ انہوں نے گھر گھر جا کر صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ دھرم شاستر کے خلاف کوئی بھی فعل نہ ہونے

دیں گے۔ ہم لوگ اور کوئی چارہ کار نہ دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں گئے۔ وہ یہی اس شہر میں قابل

ترین معالج تھے اور بلا فیس ہی بجالیوں کا علاج کیا کرتے تھے۔ ہماری کہانی سن کر ڈاکٹر صاحب غے

سے سلگ اٹھے اور کہنے لگے..... ”جو لوگ اوروں کو اس طرح ستاتے ہیں ان کے گھروں میں اگر کوئی

میری آنکھوں کے سامنے بغیر علاج کے مرنے بھی ہو گا۔ تو میں اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں گا۔“

نا معلوم کس نے یہ بات بچوں کے کانوں تک پہنچا دی۔ بس شام ہونے سے پیشتر ہی میں نے سنا کہ

سرمنڈانے کی ضرورت نہیں رہی۔ صرف قصور تسلیم کر کے اس شے کو کھالینے محض کام چل جائے گا۔ اس

بات کو نا منظور کرنے پر دوسرے دن صبح یہ سنا گیا کہ صرف قصور تسلیم کر لینا ہی کافی ہو گا۔ اس شے کو کھانے

کی ضرورت نہیں۔ اور جب اس بات کو بھی نا منظور کیا گیا۔ تو یہ سننے میں آیا کہ چونکہ ہم لوگوں کا یہ پہلا

قصور ہے۔ اس لئے انہوں نے اسے یوں ہی معاف کر دیا ہے۔ کفارہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مگر دو

دن تک انہیں جو تکلیف دی گئی ہے۔ اس کے لئے اگر ہر ایک شخص آ کر معافی نہ مانگے گا تو پھر وہ جیسا

پہلا کہہ چکے ہیں ویسا ہی کریں گے۔ یعنی کسی کے بھی گھر نہ جائیں گے۔“ اس کے بعد اسی دس ریشام

سے ہی ڈاکٹر صاحب کے ہاں ایک ایک کر کے تمام بوڑھے بچوں کی آمد شروع ہو گئی۔ آئندہ دادوے کر

انہوں نے کیا کہا اسے تو میں سن نہ سکا۔ لیکن دوسرے دن دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کا غصہ فرو ہو چکا ہے اور

ہم لوگوں کے کفارہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔

خیر جانے دو۔ کیا عرض کر رہا تھا۔ اور کیا بات درمیان میں آ پڑی۔ لیکن خواہ جو کچھ بھی ہو۔

مجھے اس بات کا یقین ہے کہ سمجھدار ناظرین اس نام اور مکان سے محروم تذکرہ سے پوری پوری سچائی

حاصل کر سکیں گے۔ میرے عرض کرنے کا اصلی مقصد یہ ہے کہ اندر نے اس کم سنی میں ہی اپنی اندرونی

ضمیر میں جس حقیقت کو مجسم کر لیا تھا اتنے بڑے بڑے شیخ سردار اتنی بڑی عمر تک بھی اس کا کوئی راز نہ سمجھ

سکے تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب اس دن ان کے شاستر گیان کا اسی طرح علاج نہ کر دیتے تو ان کی اس مرضی

کا علاج کبھی ہو سکتا یا نہ ہو سکتا۔ یہ بھگوان ہی جانتیں۔

ٹیلے پر آ کر آدھے ڈوبے ہوئے جنگلی جھاؤ کے اندھیرے میں پانی کے اوپر اس اجنبی بجے

کے جسم کو اندر نے جب ایک عجیب پیار کے ساتھ رکھ دیا۔ تو رات زیادہ نہ تھی۔ کچھ دیر تک وہ اس لاش کی

طرف سر جھکائے رہا اور جب بالآخر اس نے منہ اٹھا کر دیکھا۔ تو وہندلی چاندنی میں اس کے چہرے کا

جتنا بھی حصہ نظر آیا۔ وہ نہایت ادا اس تھا اور اس کے خشک منہ پر بالکل ویسا ہی جذبہ نمودار ہو رہا تھا جیسے

کوئی کان اٹھا کر کسی کی راہ میں دیکھ رہا ہو۔

پاؤں تو کسی طرح اٹھتے ہی نہ تھے تاہم کسی طرح لنگا کے ساحل کے ساتھ چلتے چلتے صبح کے وقت گلنار آنکھیں اور نہایت خشک اور اداس چہرہ لے کر گھر پہنچا گھر میں ایک جوش و خروش انداز پر۔ ”یہ آیا یہ آیا“ کہنے سب یک زبان ہو کر اس طرح چلا اٹھے کہ میری روح قبض ہونے کی تیاری کرنے لگی۔ جیتیں تقریباً تقریباً میرا ہم عصر تھا۔ اس لئے اس کی مسرت کی انتہا بھی نہ تھی۔ کہیں سے دوڑتا ہوا وہ آیا اور آگیا شری کانت! یہ آگیا بھلے بھیا۔ اس قسم کی والہانہ بے خودی سے چلاتا ہوا گھر کی چھت کو چھاڑتا ہوا میری آمد کا اعلان کرنے لگا۔ اور چشم زدن کی بھی تاخیر کے بغیر اس نے کمال احترام سے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے مجھے بیٹھک کے پانداز پر لا کھڑا کیا۔ وہاں بھلے بھیا نہایت یکسوئی سے امتحان پاس کرنے کی تیاریوں میں محو تھے۔ سر اٹھا کر تھوڑی سی دیر میری طرف دیکھ کر انہوں نے پھر پڑھنے میں دل لگالیا یعنی شیر شکار کو اپنے قبضہ میں کر لینے کے بعد کسی تہا اور محفوظ مقام میں بیٹھا ہو۔ مجھے سزا دینے کا ایک اچھا اور سنہری موقعہ ان کی قسمت میں پہلے بھی کبھی ملا تھا یا نہیں اس میں شک ہے۔

منٹ بھر تک وہ خاموش رہے۔ تمام رات باہر بسر کرنے کی وجہ سے دونوں کانوں اور گالوں پر جو حادثہ رونما ہوگا اسے بخوبی جانتا تھا۔ لیکن اب اور زیادہ دیر کھڑا بھی نہ رہ سکتا تھا اور ادھر ”فاعل“ صاحب کو بھی تو فرصت نہ تھی۔ وہ بھی تو امتحان پاس کرنے کی تیاریوں میں منہمک تھے۔

ہمارے ان بھلے بھیا کو شاید قارئین اتنی جلدی بھولے نہ ہوں گے۔ یہ وہی حضرت ہیں جن کی کڑی نگرانی میں کل شام کو ہم سب مطالعہ کر رہے تھے۔ اور لمحہ بھر بعد ہی نہایت سنجیدگی سے ”اول اوس“ آواز اور چراغ دان النادینے کی چوٹ گزشتہ رات اس ”دی رائل بنگال“ کو بھی حواس باختہ ہو کر ایک مرتبہ اتار کے درخت پر پناہ لینی پڑی تھی۔

”پہنچا بنگ (پتری) تو دیکھ رہے شیش آج اس وقت بیگن کھانا اچھا ہے یا نہیں“ کہتی ہوئی عقب کے دروازہ کو کھول کر بواجی نے جوں ہی گھر میں قدم رکھا ویسے ہی مجھے دیکھتے ہی دم بخود رہ گئیں۔

”کب آیا رہے؟ کہاں چلا گیا؟ آفرین ہے لڑکے کے تجھ پر..... تمام رات نیند نہیں آئی..... سوچ سوچ کر مر گئی..... اس اندر کے ساتھ چپکے سے جو باہر گیا تو پھر دکھائی ہی نہ دیا۔ نہ کھانا نہ پینا۔ کہاں تھا بول تو ارے کمخت، چہرہ سیاہ پڑ گیا ہے؟ آنکھیں لال پھلھلارہی ہیں۔ کہتی ہوں بخار تو نہیں چڑھا آیا ہے۔ ذرا پاس تو آ۔ دیکھوں تو تیری نبض“ ایک ساتھ سوالات کی ایک جھڑی لگا کر بوا خود ہی آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بول اٹھیں..... ”جو سوچا تا آخرو ہی ہوانا۔ نبض خوب گرم ہے۔ ایسے لڑکوں کے تو ہاتھ پاؤں باندھ کر جل بچھوا (کاٹھ) لگا دیا جائے تو تبھی کچھ چین ہو۔ پہلے تجھے گھر سے بالکل ہی نکال کر پھر کوئی دوسرا کام کروں گی۔ چل اندر جا کر سو جا۔ پا جی۔“ وہ بیگن کھانے کے سوال کو بالکل ہی بھول گئیں۔ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی گود میں کھینچ لیا۔

”مٹھلے بھیا نے بادل کی طرح سنجیدہ لہجہ میں صرف اتنا ہی کہا..... ”ابھی یہ جانہ سکے گا۔“

”کیوں یہاں کیا کرے گا؟ نہیں نہیں اس وقت اب اس کا پڑھنا لکھنا نہ ہوگا۔ پہلے دو لقمے کھا کر کچھ سولے..... آ میرے ساتھ۔“ کہہ کر بواجی مجھے لے کر چلے گئیں۔

لیکن شکار تو ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ مٹھے بھیا وقت اور مقام کا خیال بھول گئے زور سے چلا اٹھے اور دھمکا کر بولے۔ ”خبردار کہتا ہوں یہاں سے مت جا شری کانت! اب تو اب کچھ چونک اٹھیں اس کے بعد منہ پھیر کر مٹھے بھیا کی طرف دیکھ کر محض اتنا ہی کہا..... شیش!“

بواجی سنجیدہ مزاج عورت تھیں۔ تمام گھر ان سے ڈرتا تھا۔ مٹھے بھیا تو اس ایک تیکھی نظر سے ہی ڈر کے مارے بیٹھا گئے اور پھر پاس ہی کے کمرے میں بڑے بھیا بھی بیٹھے تھے۔ بات کہیں ان کے کان تک جا پہنچی تو پھر خیر نہ تھی۔

بواجی کے مزاج میں ایک بات اور بھی ہم دیکھتے آ رہے تھے۔ کبھی کسی بھی وجہ سے وہ شور و غل مچا کر لوگوں کو جمع کر لینا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ہزار غصہ ہونے پر بھی وہ کبھی زور سے نہیں بولتی تھیں وہ بولیں..... ”معلوم ہوتا ہے کہ تیرے ہی ڈر سے یہ یہاں کھڑا ہے۔ دیکھ شیش وقتا فوقتا سنارتی ہوں کہ تو بچوں کو مارتا بیٹتا ہے۔ آج سے اگر کبھی کسی کو ہاتھ بھی لگایا اور مجھے اس کا علم ہو گیا تو یاد رکھا اسی کھجے سے بندھوا کر نوکر کے ہاتھ سے تجھے بید لگواؤں گی۔ کوئی پڑھے خواہ نہ پڑھے۔ آئندہ تو کسی سے بھی باز پرس نہ کر سکے گا۔“

اتنا کہہ کر جس راستے پر آئی تھیں اسی راستے مجھے لے کر وہ چلی گئیں۔ مٹھے بھیا اپنا سامنے لئے بیٹھے رہے۔ اس بات کو مٹھے بھیا اچھی طرح جانتے تھے کہ اس حکم کی خلاف ورزی کرنا کسی کے بھی بس کی بات نہیں ہے۔

مجھے اپنے ساتھ لئے بوا اپنے کمرے میں آئیں۔ میرے کپڑے تبدیل کر دئے۔ پھر پیٹ بھر گرم گرم جلیبیاں کھلائیں۔ بستر پر سلا دیا اور یہ بات اچھی طرح واضح کر کے باہر سے کڈی لگا کر چلی گئیں کہ میں مری جاؤں تو ان کے عضو کا رہ ہو جائیں۔

پانچ منٹ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ کڈی کھول کر چھوٹا بھائی ہانپتا ہوا آیا اور میرے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ مسرت کے انتہائی جوش میں پہلے تو وہ کوئی بات ہی نہ کر سکا پھر قدرے دم لے کر چنچن پھسا کر بولا..... ”مٹھلے بھیا کو ماں نے حکم دیا ہے جانتے ہو؟ ہم لوگوں کے کسی بھی کام میں دخل دینے کی اب انہیں ضرورت نہیں ہے۔ اب تم اور میں دونوں ایک کمرے میں پڑھا کریں گے..... اور مٹھلے بھیا کی نام ذرا سی بھی کیئر (پرواہ) نہیں کریں گے۔“

چنچن بھی پیچھے پیچھے آ حاضر ہوا۔ وہ اپنی کارگزاری سنانے کے اضطراب میں یکبارگی ہو رہا تھا۔ اور چھوٹے بھائی کو یہ اطلاع دے کر کھینچ لایا تھا۔ پہلے تو کچھ دیر تک وہ خوب ہنستا رہا۔ پھر ہنسنا بند کر کے اپنی چھاتی کو بار بار ٹھونک کر بولا..... ”میں، میں میرے ہی باعث یہ سب ہوا ہے۔ اس بات کو کیا تم نہیں جانتے۔ میں اگر اسے یعنی مجھے مٹھلے بھیا کے روبرو نہ لے گیا ہوتا تو کیا ماں ایسا حکم دیتی؟“

”لیکن چھوٹے بھیا تمہیں اپنا کلدار لٹو مجھے دینا ہی ہوا۔ یہ بات میں تمہیں بتائے دیتا ہوں..... اچھا دیا۔ لے آ، جا میرے ڈیسک میں سے۔“ چھوٹے بھائی نے اسی لمحہ حکم دے ڈالا۔ لیکن اسی لٹو کو گھنٹہ بھر پہلے شاید وہ تمام روئے زمین کی دولت کے عوض بھی نہ لے سکتا تھا۔

ایسی ہی قیمت ہوا کرتی ہے انسان کی آزادی کی، انفرادی حقوق کو حاصل کرنے میں ایسی ہی مسرت ہوا کرتی ہے۔ آج مجھے بار بار خیال آتا ہے کہ بچوں کے نزدیک بھی اس کی قدر و قیمت رتی بھر بھی کم نہیں ہے۔

مٹھلے بھیا بڑے ہونے کے باعث اپنی خود مختاری سے چھوٹوں کے جن تمام حقوق کو غصب کر چکے تھے۔ انہیں پھر سے حاصل کرنے کی خوش نصیبی کے لالچ سے چھوٹے بھیا نے عزیز از جان شے بھی بلا پس و پیش دے ڈالی۔ دراصل مٹھلے بھیا کے ظلم و ستم کی انتہا نہ تھی۔ اتوار کے دن کڑی دوپہر میں ایک میل کار اسٹاپ کر ان کے تاش کھیلنے والے دوستوں کو بلانے جانا پڑتا تھا۔ گرمی کی چھٹیوں میں دن میں جب تک وہ سوتے رہتے تب تک پنکھا جھلنا پڑتا تھا۔ سردی کے دنوں میں جب وہ لحاف کے اندر ہاتھ پاؤں چھپا کر بچھوئے کی طرح بیٹھے کتاب پڑھتے تھے۔ تب ہمیں بیٹھے بیٹھے ان کی کتاب کے ورق الٹ دینے پڑتے تھے۔ اس قسم کے ان کے مظالم تھے اور پھر نہ کہنے کی بھی کوئی گنجائش نہ تھی۔ کسی کے پاس شکایت کرنے کی بھی تاب نہ تھی۔ ان کو اگر ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو وہ فوراً حکم دے بیٹھتے..... ”کیٹو جاتو

ذرا اپنا جغرافیہ لے آ دیکھوں تجھے پرانا سبق یاد بھی ہے یا نہیں۔ چنچن جاتو جھاؤ کی ایک اچھی سی جھڑی توڑ لا۔“ یعنی ہر حالت میں بیٹنا ضروری تھا۔ اس لئے خوشی اور مسرت کی مقدار میں بھی ان لوگوں نے حد اعتدال سے تجاوز کر دیا ہو تو اس میں تعجب کی بات ہی کیا تھی۔

لیکن خوشی خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو بالآخر اسے ملتی رکھنا ضروری ہو گیا۔ کیونکہ سکول کا وقت ہو رہا تھا۔ مجھے تو بخار تھا اس لئے مجھے تو کہیں آنا جانا نہ تھا۔

خیال آتا ہے اس رات بخار تیز ہو گیا تھا۔ اور پھر سات آٹھ دن تک بستر پر ہی پڑے رہنا پڑا۔

☆☆☆

اس کے کتنے دنوں بعد سکول گیا اور پھر کتنے دنوں بعد اندر سے ملاقات ہوئی۔ یہ تو یاد نہیں لیکن ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ بہت دنوں بعد ہوئی سلجر کا دن تھا۔ ان دنوں گنگا میں پانی اترنا شروع ہو گیا تھا اور گنگا کے ایک معاون نالے کے کنارے میں بنی (مچھلیاں پکڑنے کی کڈی) ڈال کر کچھلی پکڑنے بیٹھا تھا۔ اور بھی بہت سے آدمی مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ یکا یک میں نے دیکھا کہ کوئی پاس ہی بیٹھا سر کی کے جھنڈی آڑ میں بیٹھ کر پناہ مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ آڑ میں ہونے کی وجہ سے وہ تو اچھی طرح دکھائی نہ دیتا تھا۔ بہت دیر سے مجھے اپنی جگہ پسند نہیں آ رہی تھی۔ دل میں سوچا چلوں میں بھی اسی کے قریب جا بیٹھوں۔ بنی ہاتھ میں لے کر میرے ایک بار گھوم کر کھڑے ہوتے ہی وہ بولا..... ”میرے دائیں طرف آ کر بیٹھ جا۔ اچھا تو ہے شری کانت؟ چھاتی دھک دھک کرنے لگی۔ اگرچہ میں ابھی تک اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا تھا تو بھی پہچان گیا کہ اندر ہے۔ جسم کے اندر برقی رودور جانے سے جو جہاں ہوتا ہے وہیں چشم زدن میں جس طرح چونک اٹھتا ہے۔ اس کے لہجے کے بعد میری بھی وہی حالت ہوئی۔ جسم کا ہر ذرہ چنچل ہوا تھا۔ اور خون کی رفتار میں تیزی بڑھ گئی اور بے صبر ہو کر جسم کا خون سینے پر بچھاڑ کرنے لگا۔ بدقت بسیار بھی منہ سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اس بات کو میں لکھ تو ضرور گیا ہوں لیکن اس کو الفاظ میں ادا کرنے کی بات درکنار اسے سمجھنا بھی میرے لئے نہایت مشکل نہیں شاید ناممکن تھا کیونکہ کہنے کے لئے تو عام طور پر استعمال ہونے والے معمولی الفاظ کا سلسلہ گویا دل کی حرکت بند ہونے کو تھی۔ خون کا جوش بے انتہا تھا۔ برقی رو کی طرح بہہ رہا تھا۔ وغیرہ وغیرہ اصطلاحات کے علاوہ اور تو کوئی راستہ نہیں لیکن اس سے کتنی سی بات ظاہر ہوئی ہے۔ جس نے اپنی زندگی میں ایک دن کے لئے بھی یہ محسوس نہیں کیا میں ہی اس کو یہ کس طرح احساس کراؤں اور وہ بھی اس کو کس طرح جان سکتا ہے؟ تمنا کیا کرتا تھا اور اس کے باوجود بھی کہیں اس سے کسی شکل ملاقات نہ ہو جائے۔ اس خوف سے دن بدن سوکھ کر کاٹا ہوا جاتا تھا۔ اس نے اس

طرح اچانک غیر متوقع عجیب شکل میں میری آنکھوں کے رو برو مجھے اپنے قریب آ کر بیٹھنے کا اصرار کیا۔ اس کے قریب جا کر بیٹھ بھی گیا۔ تاہم ہمہ کچھ نہ کہہ سکا۔

اندر بلوا..... ”اس دن واپس آ کر تو نے بڑی مار کھائی۔ کیوں نہ شری کانت! تجھے لے جا کر میں نے اچھا کام نہیں کیا۔ اس کے لئے اتنے دنوں تک مجھے افسوس ہوتا رہا ہے۔ میں نے سر ہلا کر کہا..... ”مار نہیں کھائی۔“ اندر خوش ہو کر بولا..... ”نہیں کھائی، سن رہے شری کانت! تیرے جانے کے بعد میں نے کالی ماتا کو کئی مرتبہ پکارا تھا تا کہ کوئی تجھے مار نہ سکے۔ کالی ماتا بڑی ظاہرہ دیوی ہیں۔ انہیں یکسوئی سے پکارنے سے کبھی کوئی مار نہیں سکتا۔ ماتا آ کر اس طرح سب کچھ بھلا دیتی ہیں کہ کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔“ یوں کہہ کر اس نے ہنسی کو رکھ دیا اور ہاتھ جوڑ کر اپنی پیشانی سے لگا لئے۔ گویا انہیں دل ہی دل میں پرنام کیا ہو۔ پھر ہنستی میں چارہ لگا کر اسے پانی میں ڈالتے ہوئے بولا..... ”مجھے تو خیال نہ تھا کہ تجھے بخارا آ جائے گا۔ اگر ہوتا تو میں وہ بھی نہ ہونے دیتا۔“

میں نے آہستہ سے دریافت کیا..... ”کیا کرتے ہو تم؟“ اندر نے جواب دیا۔ ”کچھ نہیں صرف جوا پھول (گڑپر) لا کر ماتا کے قدموں پر چڑھا دیتا۔ انہیں جو پھول بہت پیارے ہیں جو جس ارادہ سے انہیں یہ پھول نذر کرتا ہے اس کا ویسا ہی پھل ملتا ہے۔ یہ تو ہر کوئی جانتا ہے کیا تو نہیں جانتا؟“ میں نے پوچھا۔ تمہاری طبیعت تو خراب نہیں ہوتی تھی؟ اندر نے حیرت کے ساتھ جواب دیا۔ ”میری؟..... میری طبیعت تو خراب نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی نہیں ہوتا؟ وہ کیا یک سنجیدہ ہو کر بولا۔“ ”دیکھ شری کانت! میں تجھے ایک چیز دکھائے دیتا ہوں۔ اگر تو صبح و شام خوب یکسوئی سے دیوی کا نام لیا کرے لگا تو وہ سامنے آ کر کھڑی ہو جائیں گی..... تو انہیں صاف طور پر دیکھ سکے گا اور پھر وہ تیرا کبھی برانہ ہونے دیں گی کوئی تیرا بال بیکانہ نہ کر سکے گا۔ خود بخود سمجھ جائے گا اور پھر میری طرح جہاں بھی خواہش ہو جانا جو دل میں آئے کرنا۔ پھر کوئی فکر نہیں، سمجھے؟“

میں نے سر ہلا کر کہا..... ”ٹھیک ہے۔“ پھر ہنسی میں چارہ لگا کر اور اسے پانی میں ڈال کر دل آویز لہجہ میں پوچھا..... ”اب تم کس کو ساتھ لے کر وہاں جاتے ہو؟“

”کہاں؟“

”اس پار مچھلی پکڑنے۔“

اندر ہنسی کو اٹھا کر اور احتیاط سے اپنے قریب رکھ کر بولا..... ”اب نہیں جاتا۔“ اس کی بات سن کر مجھے کمال حیرت ہوئی پوچھا..... ”اس کے بعد کیا تم ایک دن بھی نہیں گئے؟“

”نہیں، ایک دن بھی نہیں۔ مجھے سر کی قسم دے کر۔“ بات کو مکمل کئے بغیر ہی کچھ شپٹا کر اندر

خاموش ہو گیا۔

اس کے متعلق یہ بات مجھے رہ رہ کر کانٹنے کی مانند چبھتی رہی۔ کسی طرح بھی اس دن کی وہ مچھلی بیچنے کی بات بھول نہ سکا تھا۔ اس لئے اگرچہ وہ خاموش رہا۔ لیکن میں نہ رہ سکا۔ پوچھا۔ کس نے تمہیں سر کی قسم دی ہے؟“ تمہاری ماں نے؟“

”نہیں، ماں نے نہیں۔ کہہ کر اندر خاموش ہو رہا۔ پھر ہنسی میں آہستہ آہستہ چارہ لپیٹتے ہوئے بولا..... ”شری کانت اپنی اس رات کی بات گھر میں تو نے کسی سے کہی تو نہیں؟“

”نہیں، لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ میں تمہارے ساتھ چلا گیا تھا۔“

اندر نے اور کوئی سوال نہ کیا۔ میں نے سوچا تھا کہ اب وہ اٹھے گا لیکن وہ نہ اٹھا چپ بیٹھا رہا۔ اس کے چہرہ پر ہمیشہ ہنسی کا ایک جذبہ نمودار رہتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ بالکل معدوم ہو چکا تھا۔ گویا وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ اور کسی وجہ سے کچھ کہہ نہ سکتا ہو اور بغیر کہے رہا بھی نہ جاتا ہو۔ بیٹھے بیٹھے بھی وہ گویا بے چینی سی محسوس کر رہا ہو۔ آپ لوگ شاید یہ کہہ انھیں گے کہ ”بابو! یہ تو تمہارا سفید جھوٹ ہے اتنی زبردست قیافہ شناسی کی وہ تمہاری عمر تو تھی۔“

میں بھی اسے تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن اس بات کو بھی آپ لوگ بھول جاتے ہیں کہ مجھے اندر سے محبت تھی۔ ایک انسان دوسرے کے دل کی بات تو جان سکتا ہے تو محض ہمدردی اور محبت سے۔ عمر اور عقل سے نہیں۔ دنیا میں جس نے جتنی محبت کی ہے دوسرے کے دل کی بات اس کے سامنے اتنی ہی زیادہ ظاہر ہوا ہوتی ہے۔ اور کسی طرح نہیں۔ اس کا ایک ثبوت دیتا ہوں۔

اندر نے سر اٹھا کر گویا کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکے کی وجہ سے اس کا چہرہ بلا وجہ ہی رنگین ہو اٹھا۔ فوراً ہی سر کی کا ایک سونٹا اس نے توڑ لیا اور وہ اسے سر جھکائے پانی پر ٹپکنے لگا۔ پھر بولا۔

”شری کانت!“

”کیا ہے بھیا؟“

”تیرے..... تیرے پاس روپے ہیں؟“

”کتنے روپے؟“

”کتنے!..... ارے یہی چار پانچ روپے ہیں؟“

”ہیں! کیا تم لوگ؟“ کہہ کر میں نے نہایت ہی خوشی کے ساتھ اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ یہ تھوڑے سے روپے ہی میرے پاس تھے۔ اندر کے کام آنے کی نسبت اور زیادہ بہتر مصرف کا میں تصور ہی نہ کر سکتا تھا۔ لیکن کہاں؟ اندر کو تو بالکل کوئی خوشی نہ ہوئی۔ اس کا چہرہ تو اور بھی زیادہ شرم و حیا

کیا یہ تمہاری جینجی کا گھر ہے؟ یہ تو سپیرے..... مسلمان..... ہیں“ اندر کچھ کہنے کو تیار ہوا..... لیکن پھر اسے دبا گیا اور چپ چاپ میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ میں ایک بے پایاں اضطراب جھلک رہا تھا۔ قدرے رک کر وہ بولا..... ”ایک دن تجھے سب کچھ بتاؤں گا۔ سانپ کا کھیل دیکھے گا شری کانت؟“

اس کی بات سن کر میں حیران رہ گیا۔ ”کیا سانپ کو تم کھلاؤ گے؟ اگر کاٹ کھائے تو؟“ اندر اٹھ کر گھر کے اندر گیا اور ایک چھوٹی سی پٹاری اور سپیرے کی تو بنی (بین) لے آیا۔ اس نے اسے سامنے رکھا، پٹاری کا ڈھکن کھولا اور تو بنی بجائی میں ڈر کے مارے کاٹھ ہو گیا۔ پٹاری مت کھولو بھائی۔ اس میں اگر گوکھر و سانپ ہوا تو؟ اندر نے اس کا جواب دینے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ اشارے سے بتا دیا کہ میں گوکھر و سانپ کو بھی کھلا سکتا ہوں۔ دوسرے ہی لمحہ سر ہلا کر تو بنی بجاتے ہوئے اس نے ڈھکن کو الگ کر دیا۔ بس پھر کیا تھا ایک بڑا بھاری گوکھر و سانپ ایک ہاتھ اونچا ہو کر پھن پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ چشم زدن کے لئے بھی تاخیر کے بغیر اندر کے ہاتھ کے ڈھکن میں اس نے زور سے منہ مارا اور پٹاری میں سے باہر نکل پڑا۔

”ارے باپ رے“ کہہ کر اندر صحن میں اچھل پڑا۔ میں بینڈے پر چڑھ گیا۔ تنگ آمد جنگل آمد کے مصداق سانپ تو بنی پر ایک وار کر کے گھر کے اندر ٹھس گیا۔ اندر کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اس نے کہا..... ”یہ تو ایک دم جنگلی ہے۔ جس کو میں کھلایا کرتا تھا وہ یہ نہیں ہے۔“ ڈر، جھنجھلاہٹ اور تنگ آ کر مجھے قریباً قریب روانا آ گیا۔ میں بولا..... ”ایسا کام تم نے کیوں کیا؟ اس نے جا کر کہیں اگر شاہ جی کو کاٹ کھایا تو؟“ اندر شرم و ندامت کے مارے گڑا جا رہا تھا۔ بولا..... ”گھر کی ارگل لگا آؤں؟ مگر کہیں قریب ہی چھپا ہوا ہو تو کیا ہوگا۔“

میں بولا..... ”تو پھر نکلتے ہی اسے کاٹ کھائے گا۔“ بے معنی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر اندر بولا..... ”کانٹے دو بچو کو۔ جنگلی سانپ رکھ چھوڑا ہے۔ جو..... سالے گا نجیڑی کو اتنی بھی عقل نہیں ہے۔ یہ لودہ جینی آ گئیں..... آ نامت! آ نامت، وہیں کھڑی رہو۔“ میں نے سر کھٹا کر اندر کی جینجی کو دیکھا۔ گویا راکھ سے ڈھکی ہوئی آگ ہو۔ جیسے دیوں کی کٹھن ریاضت ختم کر کے ابھی اٹھ کے آئی ہو۔ بائیں طرف کمر پر سی سے بندھی ہوئی تھوڑی سی خشک لکڑیاں تھیں۔ اور دائیں ہاتھ میں پھولوں کی ڈلیا کی طرح ایک ٹوکری میں کچھ ساگ سبزی تھی پوشاک ہندوستانی مسلمانوں کی طرح تھی اور کپڑے گیر دے رنگ میں رنگے ہوئے تھے لیکن میلے نہ تھے۔ ہاتھ میں لاکھ کی دو چوڑیاں تھیں۔ مانگ ہندوستانیوں کی طرح سیندر سے بھری تھی انہوں نے لکڑیوں کا بوجھ نیچے رکھ دیا اور بینڈا کھولتے کھولتے کہا..... ”کیا ہے؟“

قریب گیا اور اس نے اسے پیٹ سے پکڑ کر صحن کی دوسری طرف کھینچ کر سر کا دیا۔ میں نے بینڈے کے اوپر سے دائیں طرف دیکھا۔ اس جھوپڑی کے برآمدے میں بہت سی پھٹی چٹائیوں اور پھٹی تھریوں کے بچھونے پر بیٹھا ہوا ایک کمزور جسم دبلا پتلا عمر رسیدہ انسان کھانسی کی شدت کے مارے ہانپ رہا تھا۔ اس کے سر کی جٹائیں اونچی بندھی ہوئی تھیں اور گلے میں کئی قسم کی جھوٹی بڑی ملائیں پڑی ہوئی تھیں۔ تن کے کپڑے نہایت میلے کچیلے اور ایک قسم کے ہڈی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اس کی لمبی داڑھی کپڑے کے ایک ٹکڑے کے ساتھ جٹا کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ پہلے تو میں اسے پہچان ہی نہ سکا لیکن قریب آتے ہی پہچان گیا کہ وہ سپیرا ہے۔ پانچ چھ مہینے پیشتر میں اسے تقریباً تقریباً ہر جگہ دیکھا کرتا تھا۔ ہمارے گھر میں بھی وہ کئی مرتبہ سانپ کا کھیل دکھانے آیا تھا۔ اندر نے اسے شاہ جی کہہ کر مخاطب کیا۔ اس نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ہاتھ اٹھا کر اندر کو گانجے کا سر انجام اور چلم دکھادی۔ اندر نے کچھ کہے بغیر ہی اس کے ارشاد کی تعمیل شروع کر دی۔ جب چلم تیار ہوئی تو شاہ جی کھانسی سے بے دم ہونے پر بھی ”خواہ مخواہ مردوں یا بچوں“ کا عہد کر کے دم کھینچنے لگا اور ذرا سا بھی دھواں کسی طرف سے باہر نکل نہ جائے اس لئے اس نے بائیں ہتھیلی سے اپنی ناک کو خوب زور سے دبا لیا۔ پھر سر کے ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے چلم اندر کے ہاتھ میں دے دی اور کہا..... پڑو۔“

اندر نے چلم پی نہیں۔ آہستہ سے نیچے رکھتے ہوئے کہا..... ”نہیں“ شاہ جی نے حیرت زدہ ہو کر وجہ دریافت کی لیکن جواب کے لئے ایک لمحہ بھی انتظار نہ کیا اور خود ہی اسے اٹھالیا اور کھینچ کھینچ کر اسے ختم کر کے الٹ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان نہایت نرم و نازک لہجہ میں گفتگو شروع ہوئی۔ جس کا زیادہ تر حصہ تو میں نہ سن سکا اور نہ سمجھ ہی سکا۔ لیکن ایک بات کو میں نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ شاہ جی ہندی بولتے رہے اور اندر نے بنگالی چھوڑ کر کسی زبان کا استعمال نہ کیا۔

شاہ جی کا لہجہ رفتہ رفتہ گرم ہوا اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے پاگلوں کی چلاہٹ میں تبدیل ہو گیا۔ اندر کو مخاطب کر کے وہ جو گالی گلوچ کرنے لگا وہ ایسی تھی کہ سنی جاسکتی اور کہی جاسکتی۔ اندر نے تو اس کو برداشت کر لیا لیکن میں اسے کبھی برداشت نہ کر سکتا۔ اس کے بعد وہ بینڈے کے سہارے بیٹھ گیا اور دم بھر بعد ہی گردن جھکا کر سو گیا۔ دونوں کے کچھ دیر چپ چاپ بیٹھے رہنے کے باعث میں اکتا اٹھا اور بولا..... ”وقت گزر رہا ہے تمہیں کیا وہاں نہیں جانا ہے؟“

”کہاں شری کانت!“

”اپنی جینجی کے یہاں، روپے دیئے نہیں جانا ہے؟“

”جینجی کے لئے ہی تو میں بیٹھا ہوں۔ یہی تو ان کا گھر ہے۔“

اندر پریشانی کے عالم میں بولا..... ”کھول مت جیبی، تمہارے پاؤں پڑتا ہوں ایک بڑا بھاری سانپ گھر میں گھس گیا ہے۔“ انہوں نے میری طرف دیکھ کر کچھ سوچا اس کے بعد تھوڑا سا ہنس کر..... ”وہی تو سپرے کے گھر میں سانپ گھسا ہے۔ یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔ ہے نا شری کانت؟“

میں ایک نکل نظروں سے صرف انہی کی طرف دیکھتا رہا..... ”مگر یہ تو کہو اندر نا تھ! وہ اندر کس طرح گیا؟“

اندر بولا..... ”پٹاری کے اندر سے نکل پڑا ہے بالکل جنگلی سانپ ہے۔“ شاید وہ اندر سو رہے ہیں، کیوں؟“

اندر نے غصے سے کہا..... ”گانجا پی کر بالکل بے ہوش پڑے ہیں۔ چلا چلا کر مرجانے پر بھی نہ اٹھیں گے۔“

انہوں نے پھر ہنس کر کہا..... ”اور یہی موقع غنیمت سمجھ کر شری کانت کو سانپ کا کھیل دکھانے چلے تھے، کیوں نا؟ اچھا، آؤ میں پکڑے دیتی ہوں۔“

”تم مت جانا جیبی، تمہیں کاٹ کھائے گا، شاہ جی کو اٹھا دو..... میں تمہیں نہ جانے دوں گا۔“

یہ کہہ کر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر وہ راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بے قرار لہجہ میں جولاٹانی محبت مضمر تھی اسے انہوں نے بخوبی محسوس کیا۔ لمحہ بھر کے لئے ان کی آنکھیں چھلچھلا اٹھیں لیکن انہیں چھپا کر وہ ہنس کر بولیں..... ”ارے پاگل، اتنی اچھی قسمت تیری جیبی نے نہیں پائی۔ مجھے وہ نہیں کاٹے گا۔ ابھی پکڑے دیتی ہوں دیکھ۔“

کہہ کر بانسری کے منج پر سے مٹی کے تیل کی ڈبیا اٹھا کر اور اسے جلا کر وہ گھر کے اندر گئی۔ منٹ بھر میں ہی سانپ کو پکڑ لائی اور پٹاری میں بند کر دیا..... اندر نے فوراً اس کے قدموں میں گر کر نمسکار کیا اور پاؤں کی خاک سر پر لگا کر کہا..... جیبی، اگر تم کہیں میری جیبی ہوتیں، انہوں نے داہنا ہاتھ بڑھا کر اندر کے ہاتھ کو چھوا، اور اس کی انگلی کو چوم لیا اور پھر منہ پھیر کر چھپے چھپے انہوں نے اپنی دونوں آنکھیں پونچھ لیں۔



تمام واقعہ سننے سننے اندر کی جیبی معادو ایک مرتبہ اس طرح لرز بھگی کہ اگر اندر کا اس طرف کچھ خیال ہوتا تو اسے کمال حیرت ہوتی۔ وہ تو دیکھ نہ سکا لیکن میں نے دیکھ لیا۔ وہ کچھ دیر تک چپ چاپ اس کی طرف دیکھ کر پیار بھری حقارت کے ساتھ بولیں..... ”جیبی، بھیا ایسا کام اب کبھی نہ کرنا۔ ان تمام خوفناک جانوروں سے کھیلنا اچھا نہیں۔ خوش قسمتی سے تمہارے ہاتھ کی پٹاری کے ڈھکنے پر ہی اس نے دانت مارے ورنہ آج کیسا ظلم ہو جاتا۔ بولو تو۔“

”میں کیا ایسا بے وقوف ہوں جیبی! یہ کہہ کر اس نے اپنی دھوتی کا کنارہ کھینچ کر کمرے میں سوت سے بندھی ہوئی ایک خشک جڑی (بوٹی) دکھا کر کہا..... ”یہ دیکھ جیبی، نہایت احتیاط کے ساتھ باندھ رکھی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو کیا آج وہ مجھے کانٹے بغیر چھوڑ دیتا؟ شاہ جی سے حاصل کرنے میں مجھے کیا کم تکلیفیں اٹھانی پڑی ہیں۔ اس کی موجودگی میں تو مجھے کوئی بھی کاٹ نہیں سکتا اور اگر کاٹ بھی لیتا تو بھی کیا بگڑتا۔ شاہ جی کو نورانی جگا کر ان سے زہر مہرہ لے کر کئی جگہ پر رکھ دیتا۔ اچھا جیبی، یہ زہر مہرہ کتنی دیر میں سب زہر کھینچ لیتا ہے؟ آدھ گھنٹے میں؟ ایک گھنٹے میں؟ نہیں اتنی دیر نہیں لگتی ہوگی، کیوں جیبی!“

مگر جیبی اس طرح خاموش دیکھتی رہیں۔ اندر مشتعل ہوا تھا۔ بولا..... ”آج دو نا جیبی مجھے ایک زہر مہرہ۔ تمہارے پاس تو دو تین پڑے ہیں۔ کتنے دنوں سے مانگ رہا ہوں۔“ پھر جواب کا انتظار کئے بغیر ہی وہ غرور کے لہجہ میں بول اٹھا..... ”مجھ سے تو تم لوگ جو بھی کہتے ہیں۔ وہی کر دیتا ہوں۔ لیکن تم لوگ مجھے جھانسنے دے کر کہتے ہو آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں..... اگر نہیں دینا ہے تو صاف کیوں نہیں کہہ دیتے؟ میں پھر نہیں آؤں گا..... جاؤ!“

اندر نے تو محسوس نہ کیا۔ لیکن میں نے جیبی کی طرف دیکھتے ہوئے خوب اچھی طرح محسوس کیا کہ ان کا چہرہ کسی بے پایاں درد اور شرم کی وجہ سے گویا ایک دم سیاہ ہو گیا ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحہ کچھ ہنسی کا تاثر اپنے خشک ہونٹوں پر زبردستی لا کر انہوں نے کہا..... ”ہاں رے اندر کیا تو اپنی جیبی کے یہاں

تا؟ اگر جانتی نہ ہوتی تو اس طرح سانپ کو کیسے پکڑ لیتیں؟“ اتنا کہہ کر وہ متحسنگا ہوں سے ججی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

ججی نے بہت دیر تک سر جھکائے چپ چاپ دل ہی دل میں گویا کچھ سوچ لیا اور پھر منہ اٹھا کر آہستہ سے کہا..... ”اندر تیری ججی کے پاس یہ سب علم کافی کوڑی کا بھی نہیں ہے اور کیوں نہیں ہے یہ اگر تو یقین کرے بھائی۔ تو آج تیرے سامنے سب باتیں کھول کر اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کر ڈالوں۔ بول تو تم آج میری سب باتوں پر یقین کر دو گے؟“ کہتے کہتے اس کے آخری الفاظ کچھ بھاری ہواٹھے۔

ابھی تک میں بالکل ہی خاموش تھا۔ اس دفعہ سب سے پہلے زور سے بول اٹھا۔ ”میں تمہاری سب باتوں پر یقین کروں گا ججی! سب پر۔ جو تم کہو گی، سب پر ایک بھی بات پر شک نہ کروں گا۔“ میری طرف دیکھ کر وہ کچھ ہنسیں اور بولیں..... ”یقین کیوں نہ کرو گے بھائی! تم شریف گھرانوں کے لڑکے جو ظہرے۔ چھوٹے لوگ ہی نامعلوم اجنبی لوگوں کی باتوں پر شک کیا کرتے ہیں اور ڈر کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے تو کبھی جھوٹ بولا نہیں بھائی؟“ اتنا کہہ کر انہوں نے ایک مرتبہ پھر ہماری طرف دیکھ کر تھوڑا سا ہنس دیا۔

اس وقت شام کی دھند بگنی ہو چکی تھی، چاند نکل آیا اور اس کی دھندلی سی کرنیں درختوں کی، منجانب شاخوں اور پتوں میں سے چھن چھن کر نیچے کی گہری تاریکی میں پڑ رہی تھیں۔

کچھ دیر خاموش رہ کر ججی یکا یک بول اٹھیں۔ ”اندر نا تھ، سوچا تھا کہ آج ہی اپنی تمام کہانی تمہیں سنا دوں مگر سوچ کر دیکھا کہ نہیں ابھی وہ موقع نہیں آیا ہے لیکن میری اس بات پر ضرور یقین کر لو کہ ہم لوگوں کی تمام کرامات شروع سے آخر تک دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔ اس لئے اب تم جھوٹی امید سے شاہ جی کے پیچھے پیچھے چکر مت کاٹو۔ ہم لوگ منتر جنتر کچھ نہیں جانتے۔ مردوں کو بھی نہیں جلا سکتے۔ کوڑی پھینک کر سانپ کو بھی پکڑ کر نہیں لا سکتے اور دوسرا کوئی یہ کام کر سکتا ہے یا نہیں یہ تو میں نہیں جانتی۔ لیکن یہ بالکل سچ ہے کہ ہم لوگوں میں ایسی کوئی بھی طاقت نہیں۔“

نامعلوم کیوں اس مختصر سے تعارف سے ہی میں نے ان کے ہر ایک لفظ پر پورا پورا یقین کر لیا۔ مگر اتنے گہرے تعلقات ہوتے ہوئے بھی اندر یقین نہ کر سکا۔ وہ ناراض ہو کر بولا..... ”اگر طاقت نہیں ہے تو تم نے سانپ کو پکڑ کس طرح لیا؟“

ججی بولیں۔ ”یہ تو صرف ہاتھ کی پھرتی ہے اندر، کسی منتر کا زور نہیں۔ سانپ کا منتر ہم نہیں جانتے۔“

اندر بولا..... ”اگر نہیں جانتے تو تم دونوں نے مکاری کر کے مجھ سے اتنے روپے کیوں ٹھگ

صرف سانپ کا منتر اور زہر مہرے کے لئے ہی آیا کرتا ہے؟“

اندر بلا جھجک بول اٹھا..... ”اور نہیں تو کیا۔“ پھر نیم خوابی کی حالت میں سوئے ہوئے شاہ جی کی طرف ترچھی نظر سے دیکھ کر کہا..... ”مگر وہ ہمیشہ مجھے جھانہ ہی دیتے رہتے ہیں۔ اس تاریخ کو نہیں اس تاریخ کو نہیں۔ اس دن نہیں اس دن نہیں۔ صرف وہ ایک جھاڑنے کا منتر دیا تھا۔ بس اور کچھ دینا ہی نہیں چاہتے۔ لیکن آج مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے ججی! کہ تم بھی کچھ کم نہیں ہو۔ تم بھی سب جانتی ہو۔ اب ان کی اور خوشامد نہیں کروں گا ججی! تم سے ہی سب منتر سیکھ لوں گا۔“ اتنا کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا اور پھر اچانک ایک طویل آہ بھر کر شاہ جی کی طرف اشارہ کر کے عزت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ شاہ جی، گناہ بد غیر ضروری پیتے ہیں مگر تین دن کے مرے ہوئے مردے کو آدھ گھنٹہ کے اندر ہی اٹھا کر کھڑا کر سکتے ہیں، اتنے بڑے استاد ہیں۔ ہاں ججی، تم بھی تو مردے کو جلا سکتی ہو؟“

ججی کچھ دیر چپ چاپ دیکھتی رہیں اور پھر یکا یک کھکھلا کر ہنس پڑیں۔ وہ کتنی دلکش مسکراہٹ تھی۔ اس طرح میں نے بہت ہی کم لوگوں کو ہنسنے دیکھا ہے۔ لیکن وہ مسکراہٹ گویا گھنے بادلوں سے محیط آسمان کی سی بجلی کی چمک کی طرح دوسرے ہی لمحہ تاریکی میں غائب ہو گئی۔

مگر اندر کا اس طرف خیال ہی نہ تھا۔ وہ ایک دم ججی کے گلے پڑ گیا اور بولا..... ”میں جانتا ہوں کہ تمہیں سب معلوم ہے مگر میں کہے دیتا ہوں کہ ایک ایک کر کے تمہیں اپنا تمام علم مجھے دینا ہو گا۔ جتنے دن زندہ رہوں گا اتنے دن تمہارا پورا پورا غلام بن کر رہوں گا۔ تم نے کتنے مردوں کو زندہ کیا ہے ججی؟“

ججی بولیں..... ”میں تو مردے جلا نا جانتی نہیں اندر نا تھ؟“

اندر نے پوچھا..... ”تمہیں شاہ جی نے یہ منتر نہیں دیا؟“

ججی نے سر ہلا کر کہا..... ”نہیں۔“

اندر آن واحد تک ان کے چہرے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد خود ہی اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا..... ”یہ علم کوئی آسانی سے دینا چاہتا ہے ججی، اچھا، کوڑی چلا نا تو تم نے یقیناً ہی سیکھ لیا ہو گا؟“

ججی بولیں..... ”کوڑی چلانا کہتے ہیں یہ بھی تو میں نہیں جانتی بھائی۔“

اندر کو یقین نہ ہوا..... ”ہش، جانتی کیسے نہیں۔ نہیں دوں گی یہی کہہ دو نا!“ پھر میری طرف دیکھ کر بولا..... ”کوڑی چلانا کبھی دیکھا ہے شری کانت! دو کوڑیاں منتر پڑھ کر چھوڑ دی جاتی ہیں۔ وہ جہاں سانپ ہوتا ہے اس کے سر پر چپٹ جاتی ہیں اور اسے دس دن تک کے راستے سے کھینچ لا کر حاضر کر دیتی ہیں۔ منتر کا ایسا ہی زور ہے۔ اچھا ججی، گھر باندھنا، جسم باندھنا، دھول پڑھنا، یہ سب تو تم جانتی ہو

ایک تونے کی خماری، پھر اچانک یہ غیر متوقع تکرار۔ اس لئے وہ حواس باختہ ہو گیا اور اسی طرح کلر کر دیکھنے لگا۔

اندر مجھے لے کر جب تک دروازے کے باہر آیا تب تک شاید وہ کچھ ہوش میں آ کر خالص بنگالی زبان میں پکارا اٹھا۔ ”سن اندر ناتھ، کیا ہوا ہے بول تو؟“

پہلی ہی مرتبہ بنگالی بولنے ہوئے میں نے اسی وقت سنا۔ اندر لوٹ کر بولا۔ ”جنسز منتر تم کچھ نہیں جانتے پھر کیوں جھوٹ موٹ مجھے دھوکہ دے کر اتنے دنوں تک روپیہ ایشٹھے رہے اس کا جواب دو۔“

وہ بولا۔ ”نہیں جانتا یہ تمہیں کس نے بتایا؟“

اندر نے اسی آن خاموش کھڑی جیجی کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ”انہوں نے کہا کہ تمہارے پاس کافی کوڑی کا بھی علم نہیں ہے۔ اگر کچھ آتا ہے تو صرف دھوکہ یا لوگوں کو ٹھگنا۔ یہی تو ہم لوگوں کا کاروبار ہے۔ جھوٹا چور!“

شاہ جی کی آنکھیں جل اٹھیں۔ وہ کس خوفناک فطرت کا انسان ہے؟ اس کا علم مجھے اس وقت تک بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کی طرف اس نگاہ سے ہی میرے جسم کے روٹنے کھڑے ہو گئے۔ وہ اپنی منتشر جٹاؤں کو باندھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور سامنے آ کر بولا۔ ”کہا ہے تو نے؟“

جیجی بدستور منہ نیچا کئے ہوئے چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ اندر نے مجھے ایک دھکا دے کر کہا ”رات ہو گئی ہے چل نا۔“

میں نے کہا۔ ”رات تو ضرور ہو رہی ہے لیکن میرے پاؤں تو گویا اپنی جگہ سے ہلے ہی نہیں ہیں۔“ اندر نے اس پر توجہ نہ دی اور زبردستی ہی مجھے کھینچ لے چلا۔

کچھ قدم آگے بڑھتے ہی شاہ جی کی آواز پھر سنائی دی۔ ”کیوں کہا تو نے؟“

سوال تو سنا لیکن اس کا جواب نہ سن سکا۔ چند قدم اور آگے بڑھتے ہی اچانک چاروں طرف سے اس گھنی تاریکی کا کلیجہ چیر کر ایک زور کی چیخ پیٹھ کی جھونپڑی میں سے ہمارے کانوں کو چھیدتی ہوئی نکل گئی اور پلک مارتے اندر اس چیخ کا تعاقب کر کے غائب ہو گیا۔ لیکن میری قسمت میں کچھ اور ہی تھا۔ سامنے ہی ایک خاردار جھاڑی تھی۔ میں زور سے اسی پر جا کر اور کانٹوں سے میرا تمام جسم چھلنی ہو گیا۔ یہ جو ہوا سو ہوا۔ اور اپنے آپ کو کانٹوں کی زد سے چھڑانے میں مجھے تقریباً دس منٹ لگ گئے۔ ایک کانٹے سے چھوٹا تو کسی دوسرے کانٹے میں الجھ جاتا اور اسے چھڑاتا تو کسی تیسرے میں جا نکلتا۔ اس طرح کافی تکلیف اور دیر کے بعد جب میں شاہ جی کے گھر کے صحن کے کنارے پہنچا تو دیکھا کہ اس صحن کے ایک

لئے؟“

جیجی فوراً جواب نہ دے سکیں۔ شاید اپنے آپ کو کچھ سنبھالنے لگیں۔ اندر نے پھر سخت لہجہ میں کہا۔ ”تم سب ٹھگ، بد معاش اور مکار ہو۔ اچھا دکھاتا ہوں تم لوگوں کو اس کا مزہ۔“

پاس ہی مٹی کے تیل کا ایک دیا جل رہا تھا۔ میں نے اس کی روشنی میں دیکھا جیجی کا چہرہ مردے کی مانند سفید فاق ہو گیا ہے وہ ڈر اور جھجک کے ساتھ بولیں۔ ”ہم لوگ مداری جو ہیں بھائی؟ ٹھگنا تو ہمارا کاروبار ہے۔“

”تمہارا کاروبار میں ابھی سب باہر نکالے دیتا ہوں۔ چل رے شری کانت! ہمیں اس سالے بد معاش کے سایہ سے بھی بچنا چاہئے، حرا مزادے، بد ذات، بد معاش، مکار۔“ یہ کہہ کر اندر دفعتاً میرا ہاتھ پکڑ کر اور زور سے ایک جھکادے کر کھڑا ہو گیا۔ اور ذرا سی بھی دیر کئے بغیر مجھے کھینچ لے گیا۔

اندر کو کوئی الزام نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اس کی مدتوں کی بہت بڑی بڑی امیدیں گویا چشم زدن میں مٹ کر غائب ہو گئیں۔ لیکن میں اپنی دونوں آنکھوں کو جیجی کی ان آنکھوں کی طرف پھر لوٹا نہ سکا۔ میں نے اپنی پوری طاقت سے اندر کے قبضے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر پانچ روپے سامنے رکھ دیئے اور کہا۔ ”تمہارے لئے لایا تھا جیجی..... انہیں لے لو۔“

اندر نے جھپٹ کر انہیں اٹھالیا اور کہا۔ ”اب اور روپے؟ بے ایمانی سے انہوں نے مجھ سے کتنے روپے لئے ہیں۔ یہ کیا تجھے معلوم نہیں ہے شری کانت؟ میں تو اب یہی چاہتا ہوں کہ یہ لوگ بغیر کھائے پئے سوکھ سوکھ کر مر جائیں۔“

میں نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔ ”نہیں اندر! دے دینے دو..... میں یہ جیجی کے لئے ہی لایا ہوں۔“

”اوہ..... بڑی آئیں تیری جیجی!“ کہہ کر وہ مجھے کھینچ کر بینڈے کے پاس گھسیٹ لایا۔ اسی دوران میں اس گول مال سے شاہ جی کا نشہ اچٹ گیا۔ ”کیا ہوا کیا ہوا۔“ کہتے کہتے وہ اٹھ بیٹھا۔

اندر مجھے چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا اور بولا۔ ”ڈاکو سالے! کبھی راستے میں مل گیا تو چابک سے تیری پیٹھ کا چمڑا ادھیڑ دوں گا۔“ کیا ہوا، بد معاش، سالہا جانتا کچھ بھی نہیں، پھر بھی کہتا پھرتا ہے۔ منتر کے زور سے مردے جلاتا ہوں۔ اگر کبھی راستہ پر دکھائی دیا تو اب کی بار اچھی طرح دیکھوں گا تجھے۔“ اتنا کہہ کر اس نے ایک ایسا مہیب اشارہ کیا جس سے شاہ جی چونک اٹھا۔

کروں گی، اس دن سے اب تک اس شیطان کے بچے نے انہیں کتنی مار ماری ہے اس کا کوئی حساب نہیں۔ پھر بھی جیجی لکڑی ڈھو کر، اوپلے بیج کر کسی نہ کسی طرح اسے کھلاتی پلاتی ہیں، گانچے کے لئے پیسے دیتی ہیں مگر یہ اس کا پانا نہ ہوا۔ اب میں اسے پولیس کے ہاتھ میں دوں گا تو چھوڑوں گا ورنہ یہ تو جیجی کا خون کر ڈالے گا۔ یہ خون کر سکتا ہے۔“

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ انسان اس بات سے لرز اور سر اٹھا کر اس نے فوراً ہی اسے نچا کر لیا۔ یہ سب چشم زدن میں ہی ہو گیا۔ لیکن اقدام جرم کی جو تشویش اس وقت میں نے اس کے چہرے پر بکھرتی ہوئی دیکھی۔ اس کا وہ چہرہ آج بھی مجھے صاف صاف یاد آ جاتا ہے۔

میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس کہانی کو جسے میں آج لکھ رہا ہوں۔ قارئین سچ تسلیم نہ کریں گے بلکہ اسے ایک عجیب تخیل سمجھ کر میرا مذاق اڑانے میں بھی جھجھک نہ کریں گے۔ تاہم یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں نے اسے لکھا ہے اور یہی میری واقفیت کی حقیقی قیمت ہے کیونکہ سچائی کی بنیاد پر کھڑے ہوئے بغیر کسی طرح بھی تمام داستان کو مکمل نہیں کیا جاسکتا۔ قدم قدم پر یہی ڈر رہتا ہے کہ لوگ اسے مذاق میں اڑا نہ دیں۔ عالم امکان تپتے واقعات تخیل تک کو بہت دور پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ کیفیت خود اسے لکھنے میں کس طرح کی امداد نہیں کرتی بلکہ ہاتھ کے قلم کو بار بار کھینچ کر روکتی ہے۔

لیکن جانے دو اس بات کو، جیجی جب آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھیں تو شاید نصف رات گزر چکی تھی۔ اس کی بے ہوشی دور ہوتے اور بھی ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اس کے بعد ہمارے منہ سے سارا ماجرا سن کر وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور شاہ جی کے بندھ کھولنے کے بعد بولیں..... ”جواب سور ہو۔“

اس کے چلے جانے کے بعد انہوں نے اندر کو پاس بلا کر اور اس کا دایاں ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر کہا..... ”اندر میرے اسی سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ اب پھر کبھی تو اس گھر میں نہیں آئے گا۔ ہمارے ساتھ جو ہونا ہو تو اب ہماری کوئی خبر نہ لینا۔“

اندر پہلے تو گم سم کھڑا رہا لیکن دوسرے ہی لمحہ آگ کی طرف چل اٹھا اور بولا..... ”ٹھیک ہی تو ہے۔ میرا خون کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو کچھ بھی نہیں اور میں نے جو تھوڑی دیر کے لئے باندھ دیا تو تمہارا اتنا غصہ۔ ایسا نہ ہو تو پھر یہ کلج ہی کیوں کہلائے لیکن تم دونوں کتنے نمک حرام ہو۔ آ رہے شری کانت، چلیں بس ہو چکا۔“

جیجی خاموش ہو رہی ہیں۔ انہوں نے اس الزام کی تردید نہ کی۔ کیوں نہ کی اس بات کو بعد میں خواہ کتنا ہی سمجھا ہو لیکن اس وقت بالکل نہ سمجھ سکا۔ تاہم میں چپ چاپ وہ پانچ روپے وہیں کھبے کے پاس رکھ کر اندر کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ محن کے باہر آ کر وہ چلا کر بولا..... ”ہندو کی لڑکی ہو کر جو ایک

حصے میں جیجی بے ہوش پڑی ہیں اور دوسرے حصے میں دونوں گورو چیلے کی باقاعدہ کشتی ہو رہی ہے۔ قریب ہی ایک تیز دھار والی برتھی پڑی ہوئی ہے۔

شاہ جی کا جسم طاقت ور تھا۔ لیکن اسے یہ علم نہ تھا کہ اندر اس سے بھی کتنا زیادہ طاقت ور ہے۔ اسے اگر یہ علم ہوتا تو شاید وہ ایسی جرأت نہ کرتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اندر اسے چاروں شانے چت گرا کر اس کی چھاتی پر سوار ہو بیٹھا۔ اور اس کی گردن کو زور زور سے دبوچنے لگا اور اگر میں دخل نہ دیتا تو شاید، شاہ جی کی مداری زندگی اسی وقت ختم ہو جاتی۔

کافی کھینچا تالی کے بعد جب میں نے دونوں کو الگ الگ کیا تو اندر کی حالت دیکھ کر ڈر کے مارے ایک دم رو پڑا۔ پہلے تو اندر میرے میں دیکھ نہ سکا تھا کہ اس کے تمام کپڑے خون سے تر ہو رہے ہیں۔ اندر ہانپتا ہوا بولا..... ”سائلے گجی دی نے مجھے سانپ مارنے کا برچھا مارا ہے یہ دیکھا؟“ کرتے کی آستین اٹھا کر اس نے دکھایا۔ بازو میں قریب دو تین انچ گہرا زخم ہو گیا تھا اور اس میں سے لگا تار خون بہہ رہا تھا۔

اندر بولا..... ”رومت، اس کپڑے سے میرے زخم کو خوب مضبوطی سے باندھ دے..... اے خبردار، بالکل اسی طرح بیٹھا رہ، اٹھا تو تیرے گلے پر پاؤں رکھ کر زبان کھینچ کر باہر نکال دوں گا، حرازدے، سور..... لے شری کانت، تو کھینچ کر باندھ، دیر مت کر۔“ یہ کہہ کر اس نے چرچاپنی دھوتی کے کنارے کا ایک حصہ پھاڑ ڈالا۔ میں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے زخم باندھنے لگا اور شاہ جی پاس ہی کسی لب مرگ زہری سانپ کی طرح بیٹھا ہوا چپ چاپ دیکھنے لگا۔

اندر بولا..... ”نہیں تیرا کوئی بھروسہ نہیں ہے تو خون کر ڈالے گا۔ میں تیرے ہاتھ باندھوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے اس کی گردے رنگ کی پگڑی کھینچ کھاچ کر اس کے دونوں ہاتھ کس کس باندھ دیئے۔ اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ جواب نہ دیا۔ ذرا سی بھی چون تک نہ کی۔

جس لاشی کے وارے جیجی بے ہوش ہو گئیں تھیں۔ اسے اٹھا کر ایک طرف رکھتے ہوئے اندر بولا..... ”کیسا نمک حرام شیطان ہے سالا۔ میں نے اسے اپنے باپ کے نامعلوم کتنے روپے چرا کر دیئے ہیں۔ اور اگر جیجی نے سر کی قسم دے کر روکا نہ ہوتا تو اور بھی دیتا۔ اس پر بھی یہ مجھے برچھا مار بیٹھا۔ شری کانت! اس پر نظر رکھ تا کہ یہ اٹھ نہ بیٹھے..... میں جیجی کی آنکھوں اور چہرے پر پانی کے چھینٹے دیتا ہوں۔“

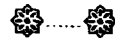
پانی کے چھینٹے دے کر ہوا کرتے ہوئے وہ بولا..... ”جس دن جیجی نے کہا کہ ”اندر ہاتھ تیرے مکائے ہوئے پیسے ہوتے تو میں لے لیتی..... مگر انہیں لے کر میں اپنی یہ دنیا اور عاقبت برباد نہ

مسلمان کے ساتھ بھاگ آتی ہے اس کا دین ایمان ہی کیا؟ چو لھے میں چلی جائے۔ اب میں نہ کوئی کھوج ہی کروں گا اور نہ خبر لوں گا۔ حرام زادہ بد معاش کہیں گا؟“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے اس جنگلی راستے کو عبور کر کے چل دیا۔

ہم دونوں آ کر کشتی میں بیٹھ گئے۔ اندر چپ چاپ کشتی کھیلنے لگا اور بار بار ہاتھ اٹھا اٹھا کر آنکھیں پونچھنے لگا۔ یہ صاف صاف سمجھ کر وہ رو رہا ہے میں نے بھی اور کوئی سوال نہ کیا۔

شمشان کے اسی راستہ میں لوٹ آیا اور اسی راستے اب بھی چلا جا رہا ہوں مگر نہ جانے کیوں؟ آج میرے دل میں ڈر کی کوئی بات نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے شاید میرا دل اتنا بے قرار اور اتنا ڈھکا ہوا تھا کہ اتنی رات گئے کس طرح، گھر میں گھسوں گا اور گھسنے پر کیا حالت ہوگی۔ اس فکر کو بھی اس وقت کوئی جگہ نہ مل سکی۔

تقریباً رات کے آخری پہر میں کشتی گھاٹ پر آ گئی۔ مجھے اتار کر اندر بولا۔ ”گھر چلا جا شری کانت! تو بڑا منحوس ہے۔ تجھے ساتھ لے کر جانے سے ایک نہ ایک فساد اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ آج سے تم کو کسی بھی کام کے لئے نہ بلاؤں گا۔ اور تو بھی میرے سامنے نہ آنا۔ جا چلا جا۔“ کہہ کر وہ گہرے پانی میں کشتی کو دھکیل کر دیکھتے ہی دیکھتے بہاؤ کی طرف غائب ہو گیا۔ میں حیرت و استعجاب سے خاموش ہو کر سسنان ندی کے ساحل پر تنہا ہی کھڑا رہ گیا۔



سنجیدہ اور خاموش رات میں ماں گنگا کے کنارے بالکل بلاوجہ ہی جب اندر مجھے تنہا ہی چھوڑ کر چلا گیا تو میں اپنے گریہ کو برداشت نہ کر سکا۔ اسے میں پیار کرتا ہوں۔ اس کی اس نے کوئی قیمت ہی نہ سمجھی۔ ایک رشتہ دار کے گھر میں رہتے ہوئے سخت نگرانی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ گیا۔ اس بات کی بھی اس نے کوئی قدر نہ کی بلکہ الٹا مجھے منحوس کہہ کر اور تنہا بے بسی کی حالت میں چھوڑ کر بے پرواہی سے چلا گیا۔ اس کا یہ ظلم مجھے کتنا برا محسوس ہوا؟ اس کا ذکر کرنے کی کوشش کرنا بھی بیکار ہے۔ اس کے بعد بہت دنوں تک نہ تو اس نے مجھے تلاش کیا اور نہ میں نے ہی اسے۔ کارے قضا کبھی اگر راہ گھاٹ میں مل بھی جاتا تو میں یوں منہ موڑ کر چلا جاتا گویا اسے دیکھا ہی نہ ہو لیکن میرا گویا، مجھے ہمیشہ ہی تنکوں کی آگ میں جلایا کرتا تھا۔ اس کا کچھ بھی نقصان نہ کر سکتا۔ لڑکوں کے گروہ میں اس کی خاص عزت تھی۔ فٹ بال، کرکٹ کا وہ سردار تھا۔ جمناسک اکھاڑے کا ماہر تھا۔ اس کے کتنے ہی پیروکار تھے۔ اور کتنے ہی عقیدت مند۔ میں تو ان کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھا پھر..... کس لئے دودن کی ملاقات میں مجھے دوست کہنے لگا اور اس کے بعد اس نے مجھے ترک کیوں کر دیا؟ اور جب اس نے ترک کر ہی دیا تو میں بھی زبردستی اس سے تعلق قائم کیوں کروں؟

مجھے خوب یاد ہے کہ بھولی ساتھی جب اندر کا ذکر کر کے اس کے متعلق طرح طرح کی عجیب و غریب باتیں کہنا شروع کر دیتے تو میں چپ چاپ انہیں سننا رہتا۔ چھوٹی سی بات کہہ کر بھی میں نے کبھی یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ مجھے جانتا ہے یا اس کے متعلق میں کچھ جانتا ہوں۔ نا معلوم کس طرح میں اس چھوٹی سی عمر میں یہ جان گیا تھا کہ بڑے اور چھوٹے کی دوستی کا انجام عموماً یہی ہوا کرتا ہے۔ اپنی آئندہ زندگی میں خوش قسمتی سے بے شمار، بڑے، دوستوں کی صحبت میں آؤں گا۔ اسی لئے شاید بھگوان نے مہر کر کے یہ تیز مجھے عطا کر دی تھی جس کے باعث میں کبھی کسی وجہ سے اپنی حالت کا غلط اندازہ کر کے یعنی اپنی قابلیت کا خیال کے بغیر دوستی کی قیمت کا اندازہ کرنے نہ جاؤں۔ ورنہ دیکھتے دیکھتے دوست آقا بن جاتا

اسی وقت میگھ ناکہیں سے چھلانگ مار کر سامنے آدھ کا تمام سٹیج چرما کر کانپ اٹھا۔ فٹ لائٹ کے پانچ چھ گولے الٹ کر بجھ گئے اور ساتھ ہی ساتھ خود اس کا پیٹ باندھنے کا زری کا کرپٹہ بھی تراق سے ٹوٹ گیا۔ ایک بالچل سی جھج گئی۔ اسے بیٹھ جانے کے لئے کئی لوگ خوفزدہ ہو کر چیخ اٹھے کئی لوگ سین ڈراپ کرنے کے لئے چلا اٹھے لیکن بہادر میگھ ناکہ کی بھی کسی بات سے گھبرا یا نہ۔ بائیں ہاتھ کی کمان کو پھینک کر اس نے چٹون کو تھام لیا اور وہ اپنے ہاتھ سے صرف تیر سے ہی جنگ کرنے لگا۔

واہ رے بہادر! واہ رے بہادری تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے طرح طرح کے جنگ دیکھے ہیں مگر ہاتھ میں کمان نہیں، بائیں ہاتھ کی حالت بھی جنگ کے موافق نہیں ہے تاہم محض دائیں ہاتھ اور تیروں کی مسلسل لڑائی کیا کبھی کسی نے دیکھی ہے؟ ملا خراس کی ہی جیت ہوئی۔ دشمن کو بھاگ کر جان کی حفاظت کرنی پڑی۔

مسرت کی انتہائی تہی مٹو ہو کر دیکھ رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں اس عجیب و غریب لڑائی کے لئے ان کی ہزار بار تعریف کر رہا تھا۔ عین اسی وقت پیٹھ پر انگلی کا دباؤ پڑا۔ منہ پھیر کر دیکھا تو اندر.....

”وہ آہستہ سے بولا.....“ ”باہر آ شری کانت! جیجی تمہیں بلارہی ہیں۔“

بجلی کی تار چھو جانے کی مانند میں سیدھا کھڑا ہو گیا اور بولا..... ”کہاں ہیں وہ؟“

”باہر تو آتا ہوں۔“ راستے پر آنے سے وہ صرف ”میرے ساتھ چل“ کہہ کر چلنے لگا۔

لنگا کے ساحل پر پہنچ کر دیکھا۔ اس کی ناؤ بندھی ہوئی ہے۔ چپ چاپ ہم دونوں اس پر جا بیٹھے۔ اندر نے ناؤ کھول دی۔

پھر اسی تیرہ تار جنگل کے راستے ہوئے دونوں شاہ جی کی جھونپڑی میں جا پہنچے۔ اس وقت رات شاید زیادہ باقی نہ تھی۔

مٹی کے تیل کے ایک دیئے کی روشنی میں جیجی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی گود میں شاہ جی کا سر رکھا ہوا تھا۔ اور ان کے پاؤں کے قریب ایک کافی لمبا کالا سانپ پڑا تھا۔

جیجی نے ملائم لہجہ میں تمام داستان مختصراً کہہ سنائی۔ آج دوپہر کو کسی گھر سے سانپ پکڑنے کا بلاوا آیا تھا۔ وہاں اس سانپ کو پکڑنے میں جو انعام ملا۔ اس سے اس نے تاڑی پی لی اور شام سے کچھ پیشتر نشہ میں چور ہو کر گھر لوٹ آیا۔ پھر جیجی کے منع کرنے پر بھی وہ اس سانپ کو کھلانے کے لیے تیار ہوا اور بربک کھلاتا بھی رہا۔ مگر آخر کار کھیل کو ختم کرنے سے پہلے جب وہ اسے دم سے پکڑ کر ہانڈی میں بند کرنے لگا تو نشے کی جھونک میں آ کر جوئی اس کے منہ کو اپنے منہ کے قریب لاکر بوسہ دے کر اپنا پیار ظاہر کرنے لگا تو اس نے بھی اپنا پیار ظاہر کرنے کے لیے شاہ جی کے گلے پر زور سے بوسہ کا نشان ثبت کر

ہے اور دوستی کا استحقاق غلامی کی بیڑی بن کر، چھوٹے، کے پاؤں کو جکڑ لیتا ہے۔ یہ راز اتنی آسانی سے اور اس طرح حقیقی شکل میں مجھے حاصل ہو گیا تھا کہ میں ہمیشہ کے لئے بے عزتی اور بدنامی سے نجات پا گیا ہوں۔

تین چار مہینے گزر گئے۔ دونوں نے ہی دونوں کو ترک کر دیا۔ ممکن ہے کہ اس کی کوفت کسی فریق کے لئے کتنی ہی پرآزاد ہو لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی نے بھی کسی کی کھوج نہیں لی۔

دلت خاندان کے گھر میں کالی پوجا کے سلسلہ میں اس محلے کا شوقیہ ناکہ سٹیج تیار ہو رہا تھا۔ ”میگھ ناودودھ“ کا کھیل ہونے والا تھا۔ اس سے پیشتر ملک میں یا ترائے تو کوئی مرتبہ دیکھی تھی مگر ڈرامے زیادہ نہیں دیکھے تھے۔ میں نے تمام دن نہ ہایا نہ کھایا اور نہ آرام ہی کیا۔ سٹیج بنانے میں مدد کر سکنے سے ہی اپنے آپ کو مبارک سمجھنے لگا تھا۔ اتنا ہی نہیں جو صاحب رام کا پارٹ کرنے والے تھے انہوں نے خود مجھ سے اس دن ایک رسی پکڑے رہنے کے لئے کہا تھا۔ اس لئے مجھے بڑی امید تھی کہ رات کو جب اور لڑکے قنات کے سوراخ میں سے اندر گرین روم میں جھانکیں گے اور مارا اور لاٹھی کے پچکولے کھائیں گے تو میں شری رام کی عنایت سے فوج جاؤں گا۔ شاید وہ مجھے دیکھ کر اندر بھی ایک آدھ بار جانے دیں۔ مگر وائے بد قسمتی تمام دن جی جان تو زکرت کی۔ شام کے بعد اس کا کچھ بھی انعام نہ ملا۔ گھنٹوں گرین روم کے دروازے پر کھڑا رہا۔ رام چندر کتنی مرتباً آئے اور گئے انہوں نے مجھے نہ پہچانا۔ ایک بار پوچھا تک نہیں۔ کہ میں اس طرح کھڑا کیوں ہوں۔ ہائے رے احسان فراموش رام! کیا رسی پکڑنے کا مطلب بھی یکبارگی ختم ہو گیا۔

رات دس بجے ناکہ کی پہلی گھنٹی بجی۔ نہایت رنجیدہ دل سے تمام سلوک کے خلاف خفا ہو کر پردے کے سامنے ایک ہی جگہ پر میں نے جگہ سنبھالی اور وہیں بیٹھ گیا۔ مگر کچھ ہی دیر میں تمام روٹھنا بھول گیا۔ کیسا عمدہ ناکہ تھا۔ زندگی میں میں نے بہت کم ناکہ دیکھے ہیں۔ لیکن ویسا کبھی نہیں دیکھا۔ میگھ ناہنات خود ایک تماشہ تھا۔ اس کا چہرہ ہاتھ اونچا جسم اور ساڑھے چار ہاتھ پیٹ کا گھیرا تھا۔ سب لوگ کہتے تھے کہ اگر یہ مر گیا تو تیل گاڑی پر لے جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔

یہ بہت دنوں کا ذکر ہے اس لئے مجھے تمام واقعہ یاد نہیں رہا۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ اس نے جو شجاعت دکھائی وہ ہمارے ہاں کے ہران پلسٹائی بھیم کے پارٹ میں ساگو ان کی شاخ کندھے پر رکھ کر اور دانت کڑمڑا کر بھی نہیں دکھا سکتے۔

ڈراپ سین اٹھا۔ معلوم ہوا وہ لکشمی ہی ہوں گے..... کم و بیش بہادری کا اظہار کر رہے تھے۔

بنگال میں جو منظر کے بغیر ناکہ ہوتے ہیں انہیں یا ترائے کہتے ہیں۔ جیسے یہاں رام لایا۔

دیا۔

جینی نے اپنے میلے آنچل کے کنارے سے اپنی آنکھیں پونچھے ہوئے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ”شری کانت! اسی وقت انہیں علم ہوا کہ اب وقت زیادہ نہیں ہے تو انہوں نے یہ کہہ کر کمر آ رہے، اب ہم دونوں ساتھ ہی کوچ کریں۔“ سانپ کے سر کو پاؤں کے نیچے دبایا اور دونوں ہاتھ سے دم کھینچ کر اتالبا کر کے پھینک دیا۔ اس کے بعد دونوں کا کھیل ختم ہو گیا۔ ”اتنا کہہ کر انہوں نے ہاتھ سے نہایت ہی درد کے ساتھ شاہ جی کے چہرے کے اوپر کا کپڑا اٹھا دیا۔ اور نہایت احتیاط سے ان کے نیلے ہونٹوں کو اپنے ہاتھ سے چھو کر کہا۔“ جانے دوا چھائی ہو! اندر نا تھ۔ بھگوان پر میں ذرا سا بھی الزام نہیں دیتی۔“ ہم دونوں میں سے کوئی بھی بول نہ سکا۔ اس نکلے سے جو درد بھر لہجہ التجا اور گناہ خفا ہوا۔ اسے جس نے سنا اس کے لیے بھول جانا اس زندگی میں ممکن نہیں ہے مگر یہ فخر کس کے لیے تھا اور التجا بھی کس کے لیے تھی؟

کچھ دیر ٹھہر کر وہ بولیں۔۔۔۔۔ ”تم لوگ ابھی بچے ہو لیکن تم دونوں کو چھوڑ کر میرا تو اور کوئی اور نہیں ہے بھائی؟ اس لیے تم سے بھیک مانگتی ہوں کہ ان کا کچھ چارہ کر جاؤ۔“ پھر انگلی سے جھوپڑی کے جنوب کی طرف جنگل دکھا کر کہا۔۔۔۔۔ ”وہاں ایک جگہ ہے اندر نا تھ، بہت دنوں سے میری آرزو تھی کہ اگر میں مر جاؤں تو اسی جگہ سو جاؤں۔ صبح ہوتے ہی اسی جگہ لے جا کر انہیں سلا دو۔ اس زندگی میں انہوں نے بے شمار مصیبتیں برداشت کی ہیں۔۔۔۔۔ وہاں کچھ سکون حاصل کر سکیں گے۔“

اندر نے پوچھا۔۔۔۔۔ ”شاہ جی کیا قبر میں دفنائیں جائیں گے؟“

جینی بولیں۔۔۔۔۔ ”جب مسلمان ہیں تو قبر میں ہی دفنا نا ہوگا بھائی؟“

اندر نے پھر پوچھا۔۔۔۔۔ ”جینی کیا تم بھی مسلمان ہو؟“

جینی بولیں۔۔۔۔۔ ”ہاں مسلمان نہیں تو اور کیا ہوں؟“

جواب سن کر اندر بھی پریشان ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے جذبہ سے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس جواب کی اسے امید نہ تھی۔ جینی کو دراصل وہ چاہتا تھا۔ اس لیے اپنے دل میں وہ ایک پوشیدہ آرزو کو پال رہا تھا۔ کہ اس کی جینی اس کی سوسائٹی کی ایک عورت ہے۔ لیکن مجھے ان کی بات پر یقین نہ ہوا خود ان کے منہ سے قبول کر لینے پر بھی میرے دل میں یہ بات بیٹھ نہ سکی کہ وہ ہندو لڑکی نہیں ہے۔

بقایا رات بھی کٹ گئی۔ اندر مقررہ جگہ پر جا کر قبر کھود آیا اور ہم تینوں نے لے جا کر شاہ جی کے مردہ جسم کو دفنا دیا۔ گنگا جی کے عین اوپر نکلر دوں کا ایک ٹیلہ ٹوٹ کر گویا کسی کی آخری آرام گاہ کے لیے خود بخود ہی جگہ بن گئی تھی۔ بیس پچیس ہاتھ نیچے گنگا میا کی دھارتھی اور سر پر جنگلی پیلوں کا جھرمٹ۔ کسی

عزیز شے کو احتیاط سے چھپا رکھے کے لیے ہی یہ جگہ بنائی گئی تھی۔ نہایت ہی افسردہ دل سے ہم تینوں قریب ہی بیٹھے۔۔۔۔۔ اور ایک جان ہماری بغل کے پاس ہی مٹی کے نیچے ابدی نیند سو گئی۔ اب تک بھی آفتاب طلوع نہ ہوا تھا۔ نیچے آہستہ رفتار بھاگتھی (گنگا) بہہ رہی تھی۔ کل صبح کیا یہ سوچا تھا کہ آج رات اس طرح بسر ہوگی۔ کون جانتا تھا کہ ایک انسان کا آخری وقت اتنا قریب آ گیا ہے؟

یہ ایک جینی اس قبر پر لیٹ گئی اور ٹوٹ گئے سے چلا کر رو پڑی۔ ”ماں گنگا، مجھے بھی اپنے قدموں میں پناہ دو۔ میرے لیے اب کہیں اور سہارا نہیں ہے۔“ ان کی یہ پراگتھنا یہ آرزو کتنی روح فرسا حقیقت تھی۔ یہ اس دن میں اتنی سختی سے محسوس نہ کر سکا تھا جتنا اس سے دو دن بعد کر سکا۔ اندر نے ایک مرتبہ میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ اس کے بعد اس نڈھال عورت کے جھکے ہوئے سر کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور اسی کی طرح نہایت غناک لہجہ میں کہا۔۔۔۔۔ ”جینی تم میرے یہاں چلو۔۔۔۔۔ میری ماں اب بھی زندہ ہیں وہ تمہیں ٹھکرائیں گی نہیں۔ اپنی گود میں اٹھالیں گی۔ وہ محبت کا مجسمہ ہیں۔ ایک بار تم ان کے سامنے کھڑی ہو جانا۔ چلو تم ہندو لڑکی ہو جینی۔“

جینی کچھ بولی نہیں۔ کچھ دیر اسی طرح بے ہوش پڑی رہیں اور آخر کار اٹھ بیٹھیں۔ اس کے بعد ہم تینوں نے گنگا اٹھان کیا۔ جینی نے ہاتھ کی چوڑیاں اور سہاگ کی لٹھی توڑ کر گنگا میں بہا دی۔ مٹی سے سر کا سیندر پوچھ کر بیوہ کے لباس میں طلوع آفتاب کے ساتھ انہوں نے کہا کہ شاہ جی میرا خاوند تھا۔ اتنے دنوں بعد آج پہلے پہل انہوں نے کہا کہ شاہ جی ان کا خاوند تھا لیکن اندر کے دل میں یہ بات اچھی طرح جم کر بیٹھتی ہی نہ تھی۔ مشکوک لہجہ میں اس نے دریافت کیا۔۔۔۔۔ ”مگر تم تو ہندو لڑکی ہو جینی!“

جینی بولیں۔۔۔۔۔ ”ہاں برہمن کی لڑکی ہوں اور وہ بھی برہمن تھے۔“

اندر کچھ دیر تک مبہوت کھڑا رہا پھر بولا۔۔۔۔۔ ”انہوں نے اپنا دھرم کیوں چھوڑ دیا؟“

جینی بولیں۔۔۔۔۔ ”یہ بات میں اچھی طرح نہیں جانتی بھائی! لیکن جب انہوں نے اپنا دھرم بدل دیا تو ان کے ساتھ میرا دھرم بھی کھو گیا۔ عورت ہم مذہب ہوتی ہے۔ ورنہ میں نے اپنے ہاتھوں اپنا دھرم بھی نہیں چھوڑا اور کسی دن اپنے دھرم کے خلاف کوئی فعل بھی نہیں کیا۔“

اندر کھی لہجے میں بولا۔۔۔۔۔ ”یہ تو میں دیکھتا ہی ہوں جینی۔ اس لیے تو ہر گھڑی میرے دل میں یہی بات آتی رہی ہے۔۔۔۔۔ مجھے معاف کرنا جینی۔ تم یہاں کیسے آ پڑیں۔ تمہاری عقل پر کس طرح پردہ پڑ گیا۔ لیکن اب میں تمہاری کوئی بات نہ سنوں گا۔ میرے گھر تمہیں چلنا ہی پڑے گا۔ چلو اسی وقت چلو!“

جینی دیر تک چپ چاپ کچھ سوچتی رہیں۔ پھر سر اٹھا کر آہستہ آہستہ بولیں۔۔۔۔۔ ”ابھی میں

غم سے معمور اسی جھونپڑی میں واپس لوٹ گئی۔ جہاں تک نظر آتی رہیں۔ میں ان کی طرف دیکھتا رہا مگر انہوں نے ایک مرتبہ بھی لوٹ کر نہ دیکھا۔ اسی طرح سر نیچا کئے ایک ہی چال سے چلتی ہوئی وہ نظر سے اوجھل ہو گئیں۔ ہم دونوں محسوس کر رہے تھے کہ انہوں نے ایک بار بھی لوٹ کر کیوں نہیں دیکھا؟

تین دن بعد سکول سے چھٹی ہوتے ہی باہر آ کر دیکھا کہ اندر ناتھ پھانک کے باہر کھڑا ہے۔ اس کا منہ خشک ہو رہا تھا۔ پاؤں میں جوتے نہیں تھے وہ گھنٹوں تک مٹی سے بھرے تھے۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر میں خوفزدہ ہوا اٹھا بڑے آدمی کا لڑکا تھا اور بظاہر شوقین مزاج بھی تھا۔ ایسی حالت میں نے اس کی کبھی نہ دیکھی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اور کسی نے بھی نہ دیکھی ہوگی۔ اشارہ سے مجھے میدان کی طرف لے جا کر اس نے کہا..... ”جیجی نہیں ہیں..... کہیں چلی گئی ہیں۔“ میرے چہرے کی طرف اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا بولا..... ”کل سے کتنی ہی جگہ جا کر تلاش کر آیا ہوں لیکن کہیں بھی وہ نظر نہیں آئیں۔ تیرے لئے وہ ایک چٹھی لکھ کر رکھ گئی ہیں یہ لے۔“ اتنا کہہ کر ایک تہہ کیا ہوا زرد رنگ کا کاغذ میرے ہاتھ میں دے کر وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا دوسری طرف چل دیا۔ معلوم ہوا کہ اس کا دل غم سے اتنا دب رہا تھا کہ کسی کے ساتھ ذکر کرنا اس کے لئے مشکل تھا۔

میں وہم سے اسی جگہ بیٹھ گیا اور اور گری کھول کر اس کاغذ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھا۔ اس میں جو کچھ لکھا تھا ایک زمانہ گزرنے کے بعد اگرچہ وہ تمام کا تمام یاد نہیں رہا۔ تاہم دماغ پر زور دے کر بہت سی باتیں یاد کر سکتا ہوں لکھا تھا..... ”شری کانت! رخصت ہوتے وقت میں تم لوگوں کو دعا دیئے جاتی ہوں، صرف آج ہی نہیں جتنے دن زندہ رہوں گی تمہیں دعا دیتی رہوں گی۔ لیکن میرے لئے تم افسوس مت کرنا۔ اندر ناتھ مجھے ڈھونڈتا پھرے گا۔ یہ میں جانتی رہوں گی۔ لیکن میرے لئے تم افسوس مت کرنا۔ یہ میں جانتی ہوں مگر تم اسے سمجھا کر روک دینا۔ میری تمام باتیں آج ہی نہیں سمجھ سکو گے مگر بڑے ہونے پر ایک دن ضرور سمجھو گے۔ اس امید سے یہ خط لکھ رہی ہوں۔ اپنی کہانی اپنے ہی منہ سے کہی جا سکتی تھی لیکن نہ جانے کیوں نہیں کہہ سکی۔“ کہوں کہوں“ سوچتے ہوئے بھی نہ جانے خاموش رہ گئی لیکن اگر آج نہ کہہ سکی تو پھر کبھی کہنے کا موقع ہی نہ ملے گا۔

”میری کہانی صرف میری کہانی ہی نہیں بھائی!..... میرے شوہر کی کہانی ہے۔ اور پھر وہ بھی کچھ اچھی کہانی نہیں ہے۔ میری اس زندگی کے گناہوں کی تعداد کتنی ہے یہ تو میں نہیں جانتی لیکن گزشتہ زندگی کے جمع شدہ گناہوں کی حد بہت نہیں۔ اس میں رتی بھر بھی شبہ نہیں۔ اس لئے جب جب بھی میں نے کہنا چاہا۔ تب تب میرے دل میں یہی آیا ہے کہ عورت ہو کر اپنے منہ سے شوہر کی برائی کر کے گناہ کے اس بوجھ کو اور بھی بھاری نہ بناؤں گی اور جب وہ عجبے سدا ہار گئے اس لئے اس کے کہنے میں کوئی

کہیں نہیں جاسکوں گی اندر ناتھ!“

”کیوں نہیں جاسکو گی جیجی!“

جیجی بولیں..... ”مجھے معلوم ہے کہ وہ کچھ قرض سر پر لا کر لے گئے ہیں۔ جب تک اس کو ادا نہ کروں تب تک میں کہیں ہل بھی نہیں سکتی۔“

اندر غصے سے کھول اٹھا..... ”یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ شراب کی دوکان کا، گانے کی دوکان کا ضرور کچھ دینا ہوگا۔ لیکن اس سے تمہیں کیا سرور کار، کس کی مجال ہے کہ تم سے روپیہ مانگ سکے؟ چلو تم میرے ساتھ دیکھوں کون روکتا ہے تمہیں؟“

اتنے غم میں بھی جیجی کو قدرے ہنسی آ گئی بولیں..... ”ارے مجھے روکنے والا خود میرا اپنا دھرم ہے۔ شوہر کا قرض خود میرا اپنا قرض ہے اور ان لینے والوں کو تم کس طرح روک سکو گے بھائی؟ یہ ناممکن ہے۔ آج تم لوگ گھر جاؤ۔ میرے پاس جو کچھ تھوڑا سا مان ہے اسے بیچ کر قرض ادا کرنے کی کوشش کروں گی..... کل پرسوں پھر کسی دن آنا.....“

اتنی دیر سے میں خاموش تھا اس مرتبہ بولا..... ”جیجی میرے پاس گھر میں اور بھی چار پانچ روپے پڑے ہیں۔ لے آؤں کیا؟“ بات ابھی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ وہ اٹھ کھڑی ہو گئی اور چھوٹے بچے کی مانند مجھے چاتی سے لگا کر میری پیشانی کو اپنے ہونٹوں کا بوسہ دے کر میرے منہ کی طرف پیار سے دیکھتی ہوئی بولیں..... ”نہیں بھیا اور لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس دن تم پانچ روپے رکھ گئے تھے۔ تمہاری وہ عنایت میں مرتے دم تک یاد رکھوں گی بھیا دعا دیئے جاتی ہوں کہ بھگوان تمہارے دل میں بسیں اور اسی طرح مصیبت زدہ لوگوں کے لیے آسو بھاتے رہیں۔“ بولتے بولتے ہی ان کی ایک آنکھ سادون بن گئی اور دوسری بھا دوں۔

تقریباً اٹھ نو بجے ہم گھر جانے کے لئے تیار ہوئے۔ اس دن وہ ساتھ ساتھ راستے تک پہنچانے آئیں۔ رخصت ہوتے وقت اندر کا ہاتھ پکڑ کر بولیں..... ”اندر ناتھ شری کانت کو تو دعا دے دی۔ لیکن تمہیں دعا دینے کی جرأت مجھ میں نہیں ہے۔ تم انسانی دعا سے بعید تر ہو۔ اس لیے میں نے آج دل ہی دل میں تمہیں بھگوان کے مقدس قدموں میں سوپ دیا ہے۔ وہ تمہیں اپنائیں۔“

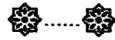
اندر کو انہوں نے پہچان لیا تھا۔ منع کرتے ہوئے بھی اندر نے ان کے قدموں کی خاک لے کر پر نام کیا۔ اور روتے روتے کہا..... ”جیجی اس جنگل میں تمہیں تنہا چھوڑ کر جانے کا مجھے کسی طرح بھی حوصلہ نہیں ہوتا۔ میرا دل ایسا کہہ رہا ہے کہ اب تمہیں پھر دوبارہ نہ دیکھ سکوں گا۔“

جیجی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ منہ پھیر کر آنکھیں پونچھتی ہوئی وہ اسی جنگلی راستے سے اپنی

مانگتے ہی وہ تمہیں مل جائیں گے۔ دل میں ناراض نہ ہونا بھائی۔ وہ روپے تو ضرور میں نے لوٹا دیے ہیں لیکن تمہارے اس کپے نازک دل کو اپنے دل میں رکھ کر لئے جاتی ہوں اور تمہاری جیبی کا یہ ایک حکم ہے شری کانت! کہ میری یاد کر کے اپنے دل کو ناشاد نہ کرنا۔ سمجھ لینا کہ تمہاری جیبی جہاں کہیں بھی رہیں گی، اچھی ہی رہیں گی کیونکہ تکالیف کو برداشت کرتے کرتے اس کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ اس کے جسم پر اب کسی بھی مشکل کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کسی طرح بھی اسے تکلیف پہنچ نہیں سکتی۔ میرے دونوں بھائیو! کیا کہہ کر تمہیں دعا دوں۔ ڈھونڈے سے بھی مجھے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے محض یہی کہے جاتی ہوں بھگوان اگر شوہر پرست بیوی کی بات رکھتے ہیں تو وہ تمہاری دوستی کو ہمیشہ کے لئے قائم رکھیں گے۔

تمہاری جیبی

“ان دا”



برائی نہیں۔ یہ میں تسلیم نہیں کرتی۔ تاہم نہ معلوم کیوں اپنی اس بے انتہاد دکھ بھری کہانی کو تمہیں سنائے بغیر میں کسی طرح بھی رخصت لینے کے قابل نہیں ہوں۔“

”شری کانت! تمہاری اس مصیبت زدہ بہن کا نام ان دا ہے۔ شوہر کا نام پوشیدہ کیوں رکھ رہی ہوں۔ اس کی وجہ سے اس خط کو آخر تک پڑھنے کے بعد خود بخود معلوم ہو جائے گی۔“

”میرے باپ بڑے آدمی ہیں۔ ان کے کوئی لڑکا نہیں۔ ہم صرف دو بہنیں تھیں۔ اس لئے میرے باپ نے میرے شوہر کو ایک غریب کے گھر سے لا کر اپنے پاس رکھ کر، پڑھا لکھا کر، انسان بنانا چاہا تھا۔ وہ انہیں پڑھنا لکھنا تو ضرور سکھا سکے لیکن انسان بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ میری بڑی بہن بیوہ ہونے کے بعد گھر ہی رہتی تھی۔ اس کا خون کر کے وہ ایک دن لاپتہ ہو گئے۔ یہ برافل انہوں نے کیوں کیا اس کا باعث تم ابھی کم سن ہو اس لئے نہ سمجھ سکو گے پھر بھی کسی دن تم جان جاؤ گے۔ لیکن بتاؤ شری کانت! یہ کتنا بڑا آزار ہے۔ یہ کتنی جان لیوا عداوت ہے۔ پھر بھی تمہاری جیبی نے سب کچھ برداشت کر لیا۔ مگر شوہر بن کر جس بے عزتی کی آگ کو انہوں نے اپنی بیوی کے دل میں جلا دیا تھا۔ اس کے شعلوں کو تمہاری جیبی آج تک بھی بجھا نہیں سکی۔ لیکن جانے دو اس بات کو!.....“

”مندرجہ بالا واقعہ کے سات سال بعد انہیں پھر دیکھ سکی۔ جس بھیس میں تم نے انہیں دیکھا تھا۔ اسی بھیس میں وہ ہمارے گھر کے سامنے سانپ کا کھیل دکھا رہے تھے۔ انہیں اور تو کوئی پہچان نہ سکا۔ مگر میں نے پہچان لیا۔ میری آنکھوں کو وہ دھوکہ نہ دے سکے۔ سنا ہے کہ یہ سب کچھ انہوں نے میرے ہی لئے کیا تھا لیکن یہ جھوٹ ہے۔ پھر بھی ایک دن گہری رات میں کھڑکی کا دروازہ کھول کر شوہر کی خاطر میں نے گھر کو ترک کر دیا اور سب نے یہی مناسب نے یہی سمجھا کہ ان دا کلنک کا ٹیکہ لگا کر گھر سے نکل گئی ہے۔“

کلنک کا یہ بوجھ ہمیشہ ہی مجھے اپنے اوپر لا دے پھرنا ہوگا۔ کوئی چارہ نہیں ہے کیونکہ شوہر کے جیتے جی تو اپنے آپ کو ظاہر نہ کر سکی۔ اپنے باپ کو پہچانتی تھی۔ وہ کبھی کسی طرح بھی اپنی اولاد کا خون کرنے والے کو معاف نہیں کر سکتے۔ آج اگر چہ وہ ڈر نہیں ہے۔ آج جا کر ان سے سب حال کہہ سکتی ہوں۔ مگر اتنے دنوں بعد اس پر کون یقین کرے گا؟ اس لئے باپ کے گھر میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

یہاں شوہر کا جو قرض تھا وہ سب ادا ہو چکا ہے۔ میں نے اپنے پاس سونے کی دو بالیاں چھپا کر رکھ چھوڑی تھیں۔ انہیں آج بیچ دیا ہے۔ تم جو پانچ روپے ایک دن رکھ گئے تھے۔ انہیں میں نے خرچ نہیں کیا۔ بڑے راستے کے موڑ پر موجودی کی دکان ہے۔ اس کے مالک کے پاس انہیں رکھ دیا ہے۔

تمباکو بھر کر حقہ ہاتھ میں دیتے ہی انہوں نے خوش ہو کر پیٹے پیٹے پوچھا..... ”تو کہاں رہتا ہے رے کانت؟ تیرے جسم پر وہ کالا سا کیا ہے؟..... رپر ہے۔ آہا، رپر کی کیا ہی شان ہے۔ اس کے تیل کی خوشبو سے تو بھوت بھی بھاگ جائیں۔ چھو کرے..... پھیلا کر بچھا تو دے یہاں اسے، بیٹھیں اس پر“..... ”میں دیتا ہوں نوین بھیا! مجھے سردی نہیں لگتی، یہ لو۔“ کہہ کر اندر نے اپنے جسم کی الوان فوراً تار کر پھینک دی۔ وہ اسے مزے سے بچھا کر بیٹھ گیا اور آرام سے تمباکو پینے لگا۔

موسم سرما کی گنگا کا پاٹ زیادہ نہ تھا۔ آدھ گھنٹے میں ہی ناؤ دوسرے کنارے سے جا ٹکرائی۔ ساتھ ہی ساتھ ہوا بند ہو گئی۔

اندر بے قرار ہو کر بولا..... ”نوین بھیا! یہ تو بڑی مشکل ہوئی۔ ہوا بند ہو گئی ہے اب تو بادبان چلے گا نہیں۔“

نوین بھیا بولے..... ”اس چھو کرے کے ہاتھ میں دے دو نا، ڈانڈ کھینچے۔“

کلکتہ کے باشندے نوین بھیا کی واقفیت عامہ پر کچھ ہلکی سی ہنسی ہنس کر اندر نے کہا۔ ”ڈانڈا کوئی نہیں لے جاسکتا نوین بھیا! اس ریت کو ڈھکیل کر جانا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ ہمیں لوٹنا پڑے گا۔“

یہ تجویز سن کر نوین بھیا لمحہ بھر کے لئے آگ بگولا ہو گئے۔ ”تو پھر لے کیوں آیا بد بخت! جس طرح بھی ہو مجھے وہاں پہنچانا ہی ہو گا۔ مجھے تھیز میں ہارمونیم بجانا ہی ہو گا۔ ان کا خاص اصرار ہے۔“

اندر بولا..... ”ان کے پاس بجانے والے اور بھی ہیں نوین بھیا، تمہارے نہ جانے سے ان کا کام اٹکاندہ ہے گا۔“

”انکاندہ ہے گا؟ اس گنوار علاقہ کے چھو کرے بجا بیگی ہارمونیم! چل جس طرح ہو ویسے ہی لے چل۔“ یہ کہہ کر انہوں نے جس طرح کی شکل بنائی اس سے میرا تمام جسم جل اٹھا۔ ان کا ہارمونیم بجانا بھی بعد میں ہم نے سنا لیکن وہ کیسا تھا اس کے بتانے کی ضرورت نہیں۔

اندر کو مصیبت میں پڑے دیکھ کر میں نے آہستہ سے کہا..... ”اندر کیاری سے کھینچ کر لے جانے سے کام نہ چلے گا؟“ بات ختم ہونے سے پیشتر ہی میں چونک اٹھا۔ وہ اس طرح دانت کلکنا اٹھے کہ ان کا وہ چہرہ آج بھی مجھے یاد آ جاتا ہے۔ بولے..... ”تو پھر جا، کھینچتا کیوں نہیں؟ جانور کی طرح بیٹھا کیوں ہے؟“

اس کے بعد ایک دفعہ اندر اور ایک دفعہ میں باری باری سے رسی کھینچتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ کہیں اونچے کنارے کے اوپر سے، کہیں نیچے اتر کر اور گاہے گاہے برف کی مانند اس سرد پانی میں

ناؤ پر بیٹھا اور نہ میں ہی۔ وہ دن خوب یاد ہے۔ صرف اسی لئے نہیں کہ وہ ہمارے کشتی کے سفر کے خاتمے کا دن تھا بلکہ اس لئے کہ اس دن خود غرضی کی جو رہنہ شکل میں نے دیکھی تھی اسے آج تک بآسانی بھول نہ سکا۔ لیجئے وہ داستان بھی عرض کئے دیتا ہوں.....

وہ کرا کے کی سردی کی شام تھی۔ پہلے دن خوب موسلا دھار بارش ہو چکی تھی۔ اس لئے سردی سوئی کی مانند جسم میں چبھتی تھی۔ آسمان میں پورا چاند طلوع ہو چکا تھا۔ چاروں طرف چاندنی تیر رہی تھی۔ ایک ایک اندر آٹکا بولا..... ”تھیز نہ دیکھنے چلے گا؟“ تھیز کے نام سے میں یکبارگی اچھل پڑا..... اندر بولا۔ ”تو پھر کپڑے پہن کر جلدی ہمارے گھر آ جا۔“ پانچ منٹ میں ایک رپر لے کر باہر نکل پڑا۔ اس جگہ ریل گاڑی سے جانا ہوتا تھا۔ سوچا گھر سے گاڑی کر کے جانا ہو گا..... اس لئے اتنی جلدی ہے۔

اندر بولا..... ”ایسا نہیں، ہم لوگ کشتی پر چلیں گے۔ میرا تمام جوش جاتا رہا کیونکہ گنگا میں ناؤ کو اس طرف چلا کر لے جانا پڑے گا۔ اور اس لئے بہت زیادہ دیر ہو جانے کا امکان تھا۔ شاید وقت پر پہنچ بھی نہ سکیں۔ اندر بولا..... ”ہوا تیز ہے، دیر نہ ہوگی۔ ہمارے نوین بھیا کلکتہ سے آئے ہیں۔ وہ گنگا سے ہی جانا چاہتے ہیں۔“

خیر ڈانڈے لے کر بادبان لگا کر ٹھیک طرح سے ہم لوگ ناؤ میں بیٹھ گئے۔ نوین بھیا بہت دیر میں گھاٹ پر پہنچے۔ چاند کی روشنی میں انہیں دیکھ کر میں تو ڈر گیا۔ کلکتہ کے خوفناک بابو۔ ریشم کے موزے، چمچھاتے پمپ شو۔ اوپر سے نیچے تک اور کوٹ پہنے ہوئے، گلے میں گلوبند، ہاتھ میں دستانے، سر پر ٹوپی..... سردی کے خلاف ان کی احتیاط کی حد نہ تھی۔ ہماری اس پیاری کشتی کو انہوں نے نہایت ”روی“ کہہ کر اپنی سخت رائے ظاہر کر دی۔ اور اندر کے کندھے پر بوجھ ڈال کر اور میرا ہاتھ پکڑ کر بڑی مشکل سے، بڑی احتیاط کے ساتھ وہ ناؤ کے درمیان جا کر بیٹھ گئے۔

”تیرا کیا نام ہے رے؟“

ڈرتے ڈرتے میں نے کہا..... ”شری کانت!“

انہوں نے بے اعتنائی کے ساتھ منہ بنا کر کہا..... ”شری..... کانت..... صرف کانت ہی کافی ہے۔ جا چھو تو بھرا۔ ارے اندر! حقہ چلم کہاں ہے؟ اس چھو کرے کو دود، تمباکو بھر دے۔“

ارے باپ رے کوئی اپنے نوکر کو بھی اس طرح حقارت سے حکم نہیں دیتا۔ اندر گھبرا کر بولا..... ”شری کانت! تو آ کر کچھ دیر ڈانڈ پکڑ رکھ! میں حقہ بھرے دیتا ہوں۔“

اس کا کچھ جواب نہ دے کر میں خود ہی حقہ بھرنے لگا کیونکہ وہ اندر کی موسی کے لڑکے تھے۔ کلکتہ کے رہنے والے تھے۔ اور حال ہی میں انہوں نے بی۔ اے پاس کیا تھا۔ لیکن میرا دل بگڑا تھا۔

اس کے علاوہ اکیلے رہنے کی بھی خواہش نہ تھی۔ بابو صاحب کہتے ہی اندر اسی دم بول اٹھا۔ نوین بھیا اکیلے تمہیں ڈر لگے گا۔۔۔۔۔ ہمارے ساتھ تھوڑا گھومنا بھی ہو جائے گا۔ یہاں پر کوئی چور دور نہیں ہے۔ ناؤ کوئی نہیں لے جائے گا، چلے نہ چلو؟“

نوین بھیا اپنے چہرے کو بگاڑ کر بولے۔۔۔۔۔ ”ڈر! ہم لوگ درزی پاڑے کے لڑکے ہیں۔ ملک الموت سے بھی نہیں ڈرتے۔۔۔۔۔ یہ جانتے ہو۔ لیکن بایں ہمہ گندی بستی میں ہم نہیں جاتے۔ سالوں کے جسم کی بدبو اگر ناک میں چلی جائے تو ہماری طبیعت خراب ہو جائے۔“ دراصل ان کا دلی خفا یہ تھا کہ میں ان کے پہرے پر مقرر ہو کر ان کا حقہ بھرتا ہوں۔

لیکن ان کے سلوک سے میں دل ہی دل میں اتنا ناراض ہو گیا تھا کہ اندر کے اشارہ کرنے پر بھی میں کسی طرح اس آدمی کے ساتھ اکیلے رہنے پر رضامند نہ ہوا۔ اندر کے ساتھ ہی چل دیا۔ درزی پاڑے کے بابو صاحب نے ہاتھ سے تالی دے کر گانا شروع کیا۔

بہت دور تک ان کے ناک کے لہجے میں گانے کی متعارف آواز ہم لوگوں کو سنائی دیتی رہی۔ اندر خود بھی دل میں اپنے بھائی کے رویہ سے نہایت شرمندہ اور ناراض ہو گیا تھا۔ آہستہ سے بولا۔۔۔۔۔ ”یہ کلکتے کے بابو بھرے، ہماری طرح آب و ہوا برداشت نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔“ سمجھے شری کانت!“ میں نے کہا۔۔۔۔۔ ”ہوں۔“

اندر ان کی غیر معمولی واقفیت کا تعارف (شاید میری عقیدت کشش کرنے کے لئے ہی) کراتے ہوئے چلنے لگا۔ بات چیت کے دوران میں اس نے یہ بھی کہا کہ وہ تھوڑے ہی دنوں میں بی۔اے پاس کر کے ڈپٹی ہو جائیں گے۔ خیر جو ہو، اب اتنے دنوں بعد بھی اس وقت وہ کہاں کے ڈپٹی ہیں یا انہیں وہ رتبہ حاصل ہوا یا نہیں مجھے معلوم نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈپٹی ضرور ہو گئے ہوں گے۔ ورنہ گا ہے گا ہے بنگالی مجسٹریٹوں کی اتنی شہرت کس طرح ہوتی۔ اس وقت وہ شباب کی پہلی منزل میں تھے۔ سننے ہیں کہ زندگی کے اس زمانہ میں دل کی وسعت، اور ہمدردی کا جذبہ جتنا زیادہ بڑھتا ہے اتنا پھر کبھی نہیں بڑھتا۔ لیکن ان کچھ گھنٹوں کی صحبت میں ہی جو نمونہ انہوں نے دکھایا اتنے عرصہ کے بعد بھی وہ فراموش کیا نہیں جاسکتا۔ خوشی ہے کہ ایسے نمونے قسمت سے ہی کبھی کبھی دیکھنے پڑتے ہیں۔ ورنہ بہت دیر پہلے ہی یہ دنیا باقاعدہ پولیس تھانہ کی شکل میں تبدیل ہو جاتی لیکن رہنے دو اب اس بات کو۔

قارئین کو یہ اطلاع دینا نہایت ضروری ہے کہ بھگوان بھی ان پر غصہ ہو گئے تھے۔ اس طرف کے راہ گھاٹ دوکان ہاٹ سب اندر کو معلوم تھے۔ وہ جا کر مودی کی دکان پر حاضر ہوا۔ لیکن دکان بند تھی اور دوکاندار سردی کے خوف سے دروازے، کھڑکیاں بند کر کے گہری نیند میں چلا گیا تھا۔ نیند کی وہ گہرائی تھی

گھس کر ہمیں نہایت تکلیف کے ساتھ کشتی کو آگے لے جانا پڑا اور اس کے علاوہ کئی دفعہ بابو صاحب کا حقہ بھرنے کے لئے بھی کشتی کو روکنا پڑا۔ لیکن بابو بدستور جم کر بیٹھے رہے۔ ذرا سی بھی مدد انہوں نے نہ کی۔ اندر نے ایک بار ان سے چوپکڑنے کو کہا تو جواب دیا کہ ”میں دستانے کھول کر ایسی سردی میں نمونیا کو بلانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“ اندر نے کہا نا چاہا۔۔۔۔۔ ”انہیں کھولے بغیر ہی۔۔۔۔۔“

”ہاں قیمتی دستانوں کو مٹی کر ڈالوں، یہی نا۔۔۔۔۔ لے۔۔۔۔۔ جا جو کرنا ہو کر۔“ درحقیقت ایسے خود غرض انسان زندگی میں بہت ہی کم دیکھے ہیں۔ ان کے ایک واہیات شوق کو پورا کرنے کے لئے ہم لوگوں کو جو ان سے عمر میں بھی چھوٹے تھے۔ اتنی تکلف برداشت کرتے ہوئے اپنی آنکھوں کو دیکھ کر بھی ان کا پتھر دل ذرا سا بھی نہ پیسجا۔ مبادا ذرا سی سردی انہیں بیمار نہ کر دے۔ ایک چھینٹا پانی پڑ جانے سے ان کا قیمتی اور کوٹ خراب نہ ہو جائے یا ہلنے چلنے سے انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ اسی خوف سے وہ بالکل بے جان ہو کر، بیٹھے رہے اور چلا چلا کر احکام کی جھڑی لگاتے رہے۔

اور بھی ایک آفت آئی۔۔۔۔۔ ”گنگا کی موافق ہوا میں بابو صاحب کی بھوک بھی بھڑک اٹھی۔ اور دیکھتے دیکھتے کشتی کے ہچکولوں سے اور بھی تیز ہوا مٹھی چلتے چلتے رات کے دس بج گئے۔ تھیز پینچے پینچے دو بج جائیں گے۔ یہ سن کر بابو صاحب تقریباً پاگل سے ہو گئے اور جب رات کے گیارہ بجے تو کلکتے کے بابو بے قابو ہو کر بولے۔ ”ہاں رے اندر! قریب ہی کہیں ہندوستانیوں کی کوئی بستی وغیرہ ہے یا نہیں چڑوا وغیرہ کچھ ملے گا؟“

اندر بولا۔۔۔۔۔ ”سامنے ہی ایک خوب بڑی بستی ہے نوین بھیا، سب چیزیں ملتی ہیں۔“ تو پھر چل چلا۔۔۔۔۔ ارے چھو کرے۔۔۔۔۔ ذرا کھینچ نذر سے۔۔۔۔۔ کیا کھانے کو نہیں ملتا؟ اندر اپنے ساتھی سے کہنا، تھوڑا اور زور کے ساتھ کھینچ کر چلے۔“

اندر یا میں کسی نے بھی اس کا جواب نہ دیا۔ جس طرح چل رہے تھے اسی طرح چلتے ہوئے ہم تھوڑی دیر میں ایک گاؤں کے قریب جا پہنچے۔ اس جگہ کنارہ ڈھلوان اور کشادہ ہوتا ہوا پانی کے ساتھ مل گیا تھا۔ ناؤ کو پوری طاقت کے ساتھ دھکا دے کر اور تھوڑے پانی میں کر کے ہم دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ بابو صاحب بولے۔۔۔۔۔ ”ہاتھ پاؤں کچھ سیدھے کرنے ہوں گے اترا جاتا ہوں۔“ اس لئے اندر نے انہیں کندھے پر اٹھا کر نیچے اتار دیا۔ وہ چاندنی کی بہار میں لڑکا کی چمکتی ہوئی ریت پر چہل قدمی کرنے لگے۔

ہم دونوں ان کی اشتہا کو مٹانے کے لئے گاؤں کے اندر گھسے۔ اگرچہ ہم لوگ جانتے تھے کہ اتنی رات گزرے اس غریب بستی میں کھانا ملنا آسان کام نہیں ہے تاہم کوشش کے بغیر بھی چھکارہ نہ تھا۔

کندھے پر بلی رکھی اور ایک کافی لمبی چھری جیب سے نکال کر بائیں ہاتھ میں لے لی اور کہا..... ”تو اسی جگہ ٹھہر شری کانت! اگر میں نہ آیا تو واپس جا کر میرے گھر اطلاع دے دینا میں چلتا ہوں۔“

اس کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا مگر دونوں آنکھیں جل رہی تھیں۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ اس کی فضول ہی محض اچھل کود نہ تھی کہ ہاتھ پکڑ کر یونہی ڈرکی دو چار باتیں کہنے سے اس کا جوش پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ جائے گا۔ میں یقیناً جانتا تھا کہ کسی طرح بھی وہ روکا نہیں جاسکتا..... وہ ضرور جائے گا جنہیں روز اول سے خوف سے واسطہ نہ رہا ہو۔ انہیں کس طرح اور کیا کہہ کر روکا جاتا؟ جب وہ جانے کے لئے بالکل تیار ہو گیا تو میں بھی ٹھہر نہ سکا۔ میں بھی جو کچھ ملا ہاتھ میں لے کر اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ اس مرتبہ اندر نے منہ پھیر کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا..... ”تو پاگل ہو گیا ہے شری کانت! تیرا کیا قصور ہے؟ تو کیوں جائے گا؟“

اس کالب دلچسپن کر ایک لمحہ میں ہی میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کسی طرح انہیں چھپا کر بولا..... ”تمہارا ہی بھلا کیا قصور ہے اندر؟ تم ہی کیوں جاتے ہو؟“

جواب میں اندر نے میرے ہاتھ سے ہانس چھین کر ناز میں پھینک دیا اور کہا۔

”میرا بھی کوئی قصور نہیں ہے بھائی! میں نوین بھیا کو ساتھ لانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اب اکیلے لوٹا بھی نہیں جاسکتا۔ مجھے تو جانا ہی ہوگا۔“

”مگر مجھے بھی تو جانا چاہئے۔“ کیونکہ پہلے ہی ایک دفعہ کہہ چکا ہوں میں بھی بالکل ڈر پوک نہیں تھا۔ اس لئے ہانس کو پھر اٹھا کر میں کھڑا ہو گیا اور بحث کے بغیر ہی ہم دونوں آگے چل دیے۔ اندر بولا..... ریت پر دوڑا نہیں جاسکتا..... خبردار، دوڑنے کی کوشش نہ کرنا۔ ”در نہ پانی میں جا کرے گا۔“

سامنے ہی ریت کا ایک ٹیلہ تھا۔ اسے پار کرتے ہی دیکھا بہت دور پانی کے کنارے چھ سات کتے کھڑے کھڑے بھونک رہے ہیں۔ جہاں تک نگاہ گئی چند کتوں کو چھوڑ کر بھیڑ یا تو دور کنار کوئی گیدڑ تک نظر نہ آیا۔ احتیاط سے کچھ اور آگے بڑھنے پر معلوم ہوا کوئی ایک سیاہی چیز پانی میں پڑی ہے اور وہ اس کا پہرہ دے رہے ہیں۔ اندر چلا اٹھا..... ”نوین بھیا!“

نوین بھیا گلے تک پانی میں کھڑے ہوئے ناقابل فہم لہجہ میں رو پڑے..... ”یہاں ہوں میں!“

ہم دونوں پوری طاقت سے دوڑ پڑے۔ کتے ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور اندر جھٹ پٹ کوڈر گلے تک ڈوبے ہوئے نیم بے ہوش اپنے موسیرے بھائی کو کھینچ کر کنارے پر اٹھالایا۔ اس وقت بھی ان کے ایک پاؤں میں بیش قیمت پمپ شو جیم اور کوٹ، ہاتھ میں دستانے، گلے میں گلوبند اور سر پر ٹوپی

اتھاہ ہوتی ہے۔ یہ ان لوگوں کو لکھ کر بتائی نہیں جاسکتی جنہیں خود اس کا تجربہ نہ ہو۔ یہ لوگ تو نکلے اور بیمار زمیندار ہیں اور نہ بہت بوجھ سے دبے ہوئے بڑکی کی شادی کے جینز کی فکر میں مبتلا بنگالی گزہستی۔ اس لئے سونا جانتے ہیں۔ دن بھر محنت شاقہ کرنے کے بعد جو نبی انہوں نے چار پائی پکڑی کہ پھر گھر میں آگ لگائے بغیر صرف چلا کر یاد روزہ کھٹکھا کر انہیں جگا دوں گا..... ایسا عہدا اگر خود ہمیشہ سچ بولنے والے ارجن بھی، جیدر تھ کو مارنے کی بجائے کر بیٹھتے تو یہ بات قسم کھا کر کہی جاسکتی ہے کہ انہیں بھی جھوٹے عہد کے لئے جل کر مر جانا پڑتا۔

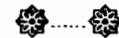
ہم دونوں باہر کھڑے ہو کر اونچی آواز میں چلا کر اور جس قدر بھی مکر و فریب انسانی دماغ میں آسکتے ہیں ان سب کو یکے بعد دیگرے آزما کر آدھے گھنٹے کے بعد خالی ہاتھ واپس آگئے۔ مگر گھاٹ پر آ کر دیکھا تو وہاں آدم نہ آدم زاد۔ چاندنی میں جہاں تک نظر دوڑتی تھی۔ وہاں تک کوئی بھی نظر نہ آتا تھا۔ ”درزی پاڑے“ کا کہیں کوئی نشان نہ تھا۔ ناؤ بدستور پڑی ہوئی تھی..... پھر بابو صاحب کہاں گئے؟ ہم دونوں پوری طاقت سے چلا اٹھے..... ”نوین بھیا!“ مگر کہیں کوئی نہیں، ہم لوگوں کی اضطراب بھری پکار بائیں اور دائیں طرف کے خوب اونچے کناروں سے ٹکرا کر ناپید ہوتی ہوئی بار بار واپس آنے لگی۔ قریب کے رقبہ میں، سردی کی وجہ سے گاہے گاہے بھیڑیوں کی آنے کی بات بھی سنی جاتی تھی اور یہاں کے کسان بھیڑیوں کے اس گروہ کی مصیبت سے پریشان تھے۔ اچانک اندر نے اسی بات کو دودھرایا۔ ”کہیں کوئی بھیڑیا تو اٹھا نہیں لے گیا؟“ ڈر کے مارے میرے روٹنے کھڑے ہو گئے..... یہ کیا کہتے ہو؟ اس سے پہلے ان کے نارد اور غیر مہذب سلوک سے میں سچ بچ ہی خفا ہوا تھا تھا۔ لیکن اتنی بڑی بددعا تو میں نے انہیں نہ دی تھی۔ دفعہ ہم دونوں کی نظر کچھ دور ریت پر پڑی ہوئی کسی چمکتی ہوئی شے پر گئی۔ قریب جا کر دیکھا تو ان کے بیش قیمت پمپ شو کا ایک فرد ہے۔ اندر گیلی ریت پر لوٹ گیا۔ ”ہائے شری نانت ان کے ساتھ موسی بھی تو آئی ہیں۔ اب میں گھر واپس نہ جاؤں گا۔“ اب آہستہ آہستہ سب بات آف ہونے لگی۔ جس وقت ہم لوگ مووی کی دکان پر اسے جگانے کی فضول کوشش کر رہے تھے۔ اسی وقت اس طرف کتوں کا ایک جھنڈا کٹھا ہو کر شور مچا کر کے اس حادثہ کی خبر ہمارے گوش گزار کرنے کے لئے بیکار محنت کر رہا تھا۔ یہ بات اب بالکل صاف ہو گئی۔ اس وقت بھی دور کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس لئے اس میں کوئی شبہ نہ رہا کہ بھیڑیے انہیں کھینچ لے جا کر جس جگہ انہیں کھا رہے ہیں وہیں آس پاس کھڑے ہو کر یہ کتے بھونک رہے ہیں۔

اچانک اندر سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا اور بولا..... ”میں وہاں جاؤں گا“ میں نے ڈر کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا..... ”پاگل ہو گئے ہو بھیا۔“ اندر نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ ناؤ پر جا کر اس نے

تھی۔ بھلنے کی وجہ سے پھول کر وہ ڈھول ہو گئے تھے۔ ہمارے جاتے وقت ہاتھ سے تالی دے کر جو عمدہ تان چھڑی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ گانے کی اسی تان سے محو ہو کر گاؤں کے کتے گردہ باندھ کر وہاں آ پہنچے تھے۔ اور اس دلکش گیت اور بے مثل پوشاک کی شان سے مرعوب ہو کر اس خاص الخاص شخصیت کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ چچا چھڑانے کی غرض سے اتنی دور بھاگنے پر بھی جب انہیں اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر نظر نہ آئی تو بالآخر جھٹ سے پانی میں کود پڑے اور اس نہایت ہی سردرات میں، نہایت ٹھنڈے پانی میں آدھے گھنٹے تک ڈوبے رہ کر اپنے گزشتہ اعمالوں کی سزا بھگتتے رہے۔ مگر اس مصیبت کو دور کر کے انہیں پھر سے اچھا کرنے میں بھی ہمیں کم محنت نہ کرنی پڑی۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہوئی کہ بابو صاحب نے زمین پر قدم رکھتے ہی پہلی بات یہ پوچھی۔ ”ہمارا ایک پپ شو کہاں گیا؟“

”وہ وہاں پڑا ہوا ہے۔“ یہ سنتے ہی وہ تمام دکھ بھول کر اسے جلدی اٹھالانے کے لئے سیدھے کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد کوٹ کے لئے، گلوبند کے لئے، موزے کے لئے، دستانے کے لئے، باری باری سے ایک ایک کے لئے افسوس ظاہر کرنے لگے اور اس رات کو جب تک ہم لوگ لوٹ کر اپنے گھاٹ پر نہ پہنچ گئے لگا تار یہی کہتے رہے کہ کیوں ہم نے جاہلوں کی طرح ان کے جسم پر سے ان سب چیزوں کو جلدی جلدی اتار ڈالا۔ نہ اتارنا ہوتا تو اس طرح مٹی لگ کر وہ کیوں خراب ہوتے۔ ہم دونوں غیر مہذب لوگوں میں رہنے والے دیہاتی کسان ہیں۔ ہم لوگوں نے ان تمام چیزوں کو پہلے کبھی آنکھوں سے دیکھا نہ ہوگا۔ یہ سب وہ برابر کہتے رہے جس جسم پر وہ اس سے پہلے ایک بوند پانی گرنے سے بے قرار ہوا تھتے تھے۔ کپڑے لتوں کے غم میں وہ اس جسم کو بھی بھول گئے غیر ضروری چیز اصل شے کو بھی کس طرح کٹی گنا ہو کر دبا دیتی ہے۔ یہ بات اگر ایسے لوگوں کے تعلق میں نہ آیا جائے تو اس طرح صاف ظاہر نہیں ہوتی۔

رات کے دو بجے کے بعد ہماری کشتی گھاٹ پر آ گئی۔ میرے جس رہبر کی سخت بدبو سے کلکتے کے بابو صاحب اس سے پیشتر بے ہوش ہوئے جاتے تھے اسی کو اپنے جسم سے لپیٹ کر اس کی برائی کرتے ہوئے..... اور پاؤں صاف کرنے میں بھی نفرت ہوتی ہے..... یہ بار بار سناتے ہوئے بھی اندر کو الوان اوڑھ کر اس سفر میں جان بچاتے ہوئے گھر گئے۔ کچھ بھی ہم لوگوں پر رحم کھا کر جو وہ زندہ واپس لوٹ آئے۔ ان کی اسی عنایت کی مسرت سے ہم معمور ہو رہے تھے۔ اتنی مشکلوں اور مصیبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کر کے اور آج ناؤ پر چڑھنے کا خاتمہ کر کے اس خطرناک سردی کی رات صرف ایک دھوپ کا سہارا لیے ہوئے کانپتے کانپتے ہم لوگ گھر لوٹ آئے۔



لکھنے بیٹھتے ہی میں بہت دفعہ حیرت سے سوچتا ہوں کہ اس قسم کے بے سلسلہ واقعات میرے دماغ میں نہایت ہوشیاری سے کس نے قرینے سے سجا کر رکھ دیئے ہیں۔ جس ترتیب سے میں لکھ رہا ہوں اس ترتیب سے تو وہ ایک کے بعد ایک سلسلہ وار ظہور پذیر نہیں ہوئے اور اس کے علاوہ زنجیر کی کیا تمام کڑیاں مکمل بنی ہوئی ہیں یہ بھی تو نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ کتنے ہی واقعات تو بھول چکے ہیں۔ لیکن پھر بھی تو وہ سلسلہ نہیں توٹتا۔ حیرت تو یہ ہے کہ انہیں پھر سے تازہ کر کے کون جوڑ دیتا ہے۔

اور بھی ایک تعجب کی بات ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بڑوں کے بوجھ سے چھوٹے پس جاتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہی ہوتا تو پھر زندگی کے خاص اور اہم واقعات تو ضرور ہی یاد رکھنے کی چیزیں ہوتیں۔ لیکن یہ بھی تو نہیں دیکھتا ہوں بچپن کی باتیں کہتے وقت یکا یک میں نے دیکھا کہ تصور کے مندر میں بہت سے حقیر اور غیر ضروری واقعات بھی نامعلوم کس طرح بہت بڑے ہو کر ٹھاٹھ سے بیٹھ گئے ہیں اور بڑے بڑے واقعات حقیر بن کر نامعلوم کب کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ اس لئے کہتے وقت بھی یہی بات صادق آتی ہے حقیر باتیں بڑی ہو کر دکھائی دیتی ہیں۔ اور بڑی باتیں یاد بھی نہیں رہتیں۔ اور ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل بھی قارئین سے بیان نہیں کر سکتا۔ جو کچھ ہوتا ہے صرف اسے ہی میں نے عرض کر دیا ہے۔

اس قسم کی ایک حقیر سی بات جو دل کے اندر اتنے دنوں تک چپ چاپ پوشیدہ رہ کر اتنی بڑی ہوا بھٹی ہے کہ آج اس کو دیکھ کر میں خود بھی بہت حیران ہو رہا ہوں۔ وہی بات میں آج اپنے قارئین سے عرض کر دوں گا۔ مگر بات ٹھیک ٹھیک کیا ہے؟ اس بات کے متعلق اگر اس کی پوری روداد و سنادوں تو اس کی صورت اچھی طرح ظاہر نہ ہوگی۔ کیونکہ اگر میں شروع میں ہی یہ کہہ دوں کہ وہ ایک داستان محبت ہے تو اس سے اگر چہ دروغ گوئی کا گناہ نہ ہوگا۔ تاہم وہ واقعات اپنی کوشش سے جتنا بڑھا ہوا ہے میری زبان شاید اس کی حدود سے بھی تجاوز کر جائے گی۔ اس لیے نہایت محتاط ہو کر کہنے کی ضرورت ہے۔

اور گانے میں لا جواب تھیں۔

میرے داخل ہوتے ہی گانا ختم کیا۔ اس لیے باموقع مناسب گفتگو اور ادب سے قاعدے کا کام ختم ہونے میں بھی کچھ وقت گزر گیا۔ راجکار نے بعد ہو کر مجھ سے گانے کی فرمائش کرنے کا اصرار کیا۔ راجا کا حکم پا کر پہلے تو میں پریشان ہوا تھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد معلوم ہو گیا کہ نغمہ کی اس محفل میں صرف میں ہی کچھ دھندلا سا دیکھ سکتا ہوں۔ باقی تمام کے تمام چھوندر کے مانند اندھے ہیں۔

بائی جی کھل انہیں۔ دولت کے لالچ سے بہت سے کام کئے جاسکتے ہیں۔ یہ میں اس وقت بھی جانتا تھا لیکن ان جاہلوں کے دربار میں بیجا بجانا درحقیقت ہی اتنی دیر تک اسے بڑا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ ایک دفعہ ایک سمجھدار انسان پا کر گویا وہ سچ گئیں۔ اس کے بعد رات کو دیر تک محض میرے ہی لیے انہوں نے اپنے کمال فن اور حسن و جمال کی تمام تر دل آویزیوں کے ساتھ کئے کہ انتہائی شیرینی میں اطراف و جوانب کو ڈبو دیا اور بالآخر خاموش ہو گئیں۔

بائی جی پڑنے کی رہنے والی تھیں۔ نام تھا پیاری۔ اس رات انہوں نے جس طرح اپنی تمام تر طاقت لگا کر گانا سنایا اس طرح شاید پہلے کبھی نہ سنایا ہوگا۔ میں تو محسوس ہو گیا۔ گانا ختم ہوتے ہی میرے منہ سے بے اختیار صرف اتنا ہی نکلا..... ”واہ بہت خوب“

پیاری نے سر نیچا کر کے ہنس دیا۔ اس کے بعد دونوں ہاتھوں کو پیشانی سے لگا کر پر نام کیا..... سلام نہیں۔ مجلس اس رات کے لیے برخاست ہو گئی۔

اس وقت تماشائیوں میں سے کوئی سو رہا تھا کوئی نیم خوابی کی حالت میں تھا اور اکثر بے ہوش تھے۔ اپنے خیمہ میں جانے کے لیے جب بائی جی اپنے لاؤ لٹکر کے ساتھ نکل رہی تھیں تو میں مسرت سے جوش میں ہندی میں کہہ اٹھا..... ”بائی جی میری خوش نصیبی ہے کہ تمہارا گانا دو جھٹے تک ضرور سننے کا موقع ملے گا۔“

بائی جی پہلے تو ٹھٹھک کر کھڑی رہیں لیکن دوسرے ہی لمحے نزدیک آ کر نہایت نازک لہجہ میں خالص بنگالی زبان میں بولیں..... ”روپے لیے ہیں اس لیے مجھے گانا ہی پڑے گا۔ لیکن کیا آپ بھی پندرہ سولہ دنوں تک ان کی مصاحبی کرتے رہیں گے؟ جیسے کل ہی آپ اپنے گھر چلے جائیے۔“

یہ بات سن کر میں حواس باختہ ہو گیا اور سوچتا رہا کہ اس کا کیا جواب دوں لیکن بائی جی خیمہ سے باہر جا چکی تھیں۔

صبح شور و غل مچا کر کار صاحب شکار کے لیے باہر نکلے۔ بے نوشی اور گوشت خوری کی تیاری ہی سب سے زیادہ تھی۔ دس بارہ شکاری نوکر ساتھ تھے۔ پندرہ بندو قیں تھیں۔ جن میں رافیلین تھیں۔

وہ بہت بعد کی بات ہے۔ چینی کی یاد بھی اس وقت دھندلی ہو چکی تھی۔ جن کا چہرہ تصور میں آتے ہی نامعلوم طاقت سے شباب کی چیتائیاں خود بخود سر جھکا لیتی ہیں۔ ان چینی کی یاد اس وقت اس طرح نہ آتی تھی۔ یہ اس وقت کی کہانی ہے ایک راجکار کی طرف سے مدعو ہو کر میں اس کی شکار پارٹی میں شامل ہوا تھا۔ اس کے ساتھ بہت عرصہ میں سکول میں پڑھا کرتا تھا۔ پوشیدہ طور پر کئی بار اس کے حساب کے سوال حل کر دیئے تھے۔ اس لئے وہ مجھے خوب چاہتا تھا۔ اس کے بعد انٹرنس کی جماعت میں ہم دونوں الگ ہو گئے۔ میں جانتا ہوں کہ لڑکوں کی یادداشت بہت کم ہوا کرتی ہے لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ مجھے یاد کر کے خط و کتابت کرنا شروع کر دے گا۔ ایک دن ایک اس سے ملاقات ہو گئی۔ اس وقت وہ بالغ ہوا تھا۔ بہت سارے دوست اس کے ہاتھ لگا اور اس کے بعد..... وغیرہ وغیرہ۔

راجہ کے کانوں میں بات پہنچی اور پہنچی بھی کافی مبالغہ کے ساتھ۔ کہ میں رافیل چلانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اور اس کے علاوہ اس دوران میں اور بھی بہت سی خوبیاں مجھ میں آ گئی ہیں۔ اور میری ان تمام صفات نے مل کر مجھے کسی راجہ کے اکلوتے اور بالغ راجکار کا جگری دوست بننے کے قابل بنا دیا ہے۔ اپنے عزیز و اقارب تو اپنے آدمی کی تعریف تو کچھ مبالغہ آمیزی سے ہی کرتے ہیں ورنہ سچ کچ میں ہی میں اتنا زیادہ قابل اتنی چھوٹی سی عمر میں ہو گیا تھا۔ یہ غرور مجھے زیب نہیں دیتا۔ کم از کم کچھ عجز تو رکھنا ہی چاہئے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ عالموں نے کہا ہے راجے ریاستوں کی دعوت کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا چاہئے۔ ہندو کا بیٹا ہو کر اپنے شاستر کے عالموں کی رائے کے خلاف عمل کس طرح کرتا؟ لہذا میں چلا گیا سیشن سے دس بارہ کوس ہاتھی پر بیٹھ گیا۔ دیکھا کہ بلاشبہ راجا کے لڑکے میں بالغ ہونے کے سب آثار موجود ہیں۔ کوئی پانچ خیمے ہیں ایک خود ان کا، ایک وزیر صاحب کا، ایک مصاحبوں کا، ایک نوکروں کا ایک رسوئی کا، ان کے علاوہ ایک خیمہ کچھ فاصلے پر نصب تھا..... اس کے دو حصے کر کے ان میں دو راقصائیں اور ان کے سازندے اڑھ جمائے ہوئے تھے۔

شام ہو چکی تھی۔ داخل ہوتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ راجکار کے خاص کمرے میں محفل رقص و نغمہ جی ہوئی ہے۔ راجکار نے عزت سے میرا خیر مقدم کیا۔ حتیٰ کہ احترام سے کھڑے ہونے کو تیار ہو کر وہ نیکی کے سہارے لیٹ گئے۔ دوست احباب پر تپاک لہجہ میں آئیے، آئیے، تشریف لائیے کہہ کر گرمجوش سے استقبال کرنے لگے۔ میں بالکل اجنبی تھا۔ مگر ان تمام لوگوں کی جو حالت تھی اس سے مجھے کسی قسم کی جھجک کا احساس نہ ہوا۔

یہ بائی جی، پڑنے سے بہت سارے بیہ حاصل کرنے کی شرط پر دو جھٹے کے لیے آئی تھیں۔ اس انتخاب کے لیے راجکار کی صحیح قدر دانی کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ بائی جی نہایت حسین

”میں بائی جی کا خانا ماں ہوں۔“

”بنگالی ہو؟“

”جی ہاں، ذات کانا ئی ہوں۔ میرا نام رتن ہے۔“

”بائی جی ہندو ہیں؟“

رتن ہنس کر بولا۔ ”نہ ہوتیں تو اب تک میں کیسے رہتا بابو جی؟“

مجھے ساتھ لے جا کر اور خیمے کا دروازہ دکھا کر رتن چلا گیا۔ پردہ اٹھا کر اندر دیکھا کہ بائی جی اکیلی بیٹھی ہوئی انتظار کر رہی ہیں۔ کل رات پشو از اور ادھنی کی وجہ سے میں اچھی طرح پہچان نہ سکا تھا۔ لیکن آج دیکھتے ہی پہچان گیا کہ خواہ کوئی بھی ہوں مگر بائی جی ہیں بنگال کی ہی لڑکی۔ بائی جی ریشمی ساڑھی زیب تن کئے بیش قیمت کارپٹ پر بیٹھی تھیں۔ بھیکے منتشر بال پیٹھ پر پھیل رہے تھے۔ ہاتھوں کے قریب ہی پاندان رکھا تھا۔ اور سامنے حقہ۔ مجھے دیکھ کر کھڑی ہو گئیں اور مسکرا کر سامنے رکھے ہوئے آسن کی طرف اشارہ کر کے بولیں۔ ”بیٹھے، آپ کے سامنے اب تمباکو نہ بیوں گی۔ ارے رتن، حقہ اٹھا لے جا۔ یہ کیا کھڑے کیوں ہیں؟ بیٹھ جائیے نا۔“

رتن آ کر حقہ لے گیا۔ بائی جی بولیں۔ ”آپ تمباکو پیتے ہیں۔ یہ مجھے معلوم ہے لیکن دوں کس طرح؟ دوسری جگہ آپ چاہیں جو کر لیں مگر دیدہ دانستہ تو میں آپ کو اپنا حقہ نہ دے سکوں گی۔ اچھا چرٹ لائے دیتی ہوں۔ ارے او۔۔۔۔۔“

”مٹھر وٹھر، ضرورت نہیں۔ میری جیب میں ہی چرٹ ہیں۔“

”ہیں؟ اچھا تو اطمینان سے ذرا بیٹھ جائیے۔ بہت سی باتیں کرنا ہے۔ بھگوان کب کس سے ملا دیتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ شکار کے لیے گئے تھے یا ایک لوٹ کیوں آئے؟“

”جی نہیں لگا۔“

”نہ لگنے کی ہی بات ہے۔ کیسی بے رحم ہے مردوں کی یہ نسل۔ فضول ہی جانوروں کا خون بہانے میں انہیں کیا مزہ آتا ہے۔ یہی ہی جانیں۔ بابو جی تو اچھے ہیں؟“

”بابو جی تو چل بے۔“

”ہیں چل بے! اور ماں؟“

”وہ تو ان سے بھی پہلے چل بسی تھیں۔“

”اوہ، اسی لیے تو۔“ کہہ کر بائی جی ایک طویل آدھ کر میری طرف دیکھتی رہ گئیں ایک دفعہ تو معلوم ہوا گویا ان کی آنکھیں چھلچھلا آئی ہیں۔ مگر شاید وہ میری بھول ہو۔ دوسرے ہی لمحہ وہ بولیں تو بھول

شکار کا موقعہ ایک ادھ سوکھی ندی کے دونوں ساحل۔۔۔۔۔ اس پار گاؤں تھا اور اس پار ریت کا ٹیلہ تھا۔ اس پار کوس بھر تک سیر کے درخت تھے اور اس پار ریت پر جا بجا کائی اور دوب کے جھرمٹ۔ یہاں ہی ان پندرہ ہندوؤں کو لے کر شکار کیا جائے گا۔ سیر کے درختوں پر مجھے کبوتر کی نسل کے کچھ جانور نظر آئے۔ اور اس آدھی خشک ندی کے موڑ کے پاس چکپا چکوی تیر رہے ہیں ایسا معلوم ہوا۔ کون کس طرح جائے۔ اس پر نہایت گرجوٹی کے ساتھ تبادلہ خیالات ہونے لگا۔۔۔۔۔ اور سب نے ہی دو دو پیالے چڑھا کر جسم اور دل کو بہادری کی طرح بتالیا۔ میں نے ہندوؤں کی رنجی۔ ایک تو بائی جی کی طفر کی چوٹ کھا کر راہ میں ہی دل بے قرار ہو رہا تھا۔ اور شکار کا یہ میدان دیکھ کر تو تمام جسم ہی جل اٹھا۔

کمار نے پوچھا۔۔۔۔۔ کیوں جی کانت! تم تو بڑے گم صم ہو رہے ہو؟ ارے یہ کیا ہندوؤں کی رکھ دی؟

”میں پرندوں کا شکار نہیں کرتا۔“

”یہ کیا جی؟ کیوں، کیوں؟“

”چہرے پر چپکے نکلنے کے بعد میں نے چہرے والی ہندوؤں نہیں چلائی۔۔۔۔۔ میں اسے چلانا بھول گیا ہوں۔“

کمار صاحب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ لیکن اس ہنسی کا کس خوبی سے کتنا تعلق ہے یہ ضرور علیحدہ بات تھی۔

سرجو کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہوا تھیں۔ وہ نمکاریوں کے ساتھ اس گروہ کا سرغندہ اور را بکمار کا خاص مصاحب تھا۔ ان کے بے خطا نشانہ کی شہرت میں نے آتے ہی سن لی تھی۔ وہ ناراض ہو کر بولے۔۔۔۔۔ چڑیوں کا شکار کیا کچھ شرم کی بات ہے؟

میرا مزاج ابھی ٹھکانے نہیں تھا۔ اس لیے جواب دیا۔ ”ہر ایک کے لیے نہیں مگر میرے لیے تو ہے۔۔۔۔۔ خیر، کمار صاحب میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں کہہ کر میں اپنے خیمے میں واپس لوٹ آیا۔ اس پر کون ہنسا، کس نے آنکھ چمکائی، کس نے منہ بنایا۔ میں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔“

خیمے میں واپس لوٹ کر میں فرش پر چت لیٹا ہی تھا اور ایک پیالہ چائے تیار کرنے کا حکم دے کر ایک سگریٹ پی رہا تھا۔ کہ بہرے نے آ کر ادب کے ساتھ کہا۔ ”بائی جی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“ بالکل اسی بات کی امید میں کر رہا تھا۔ اور فکر بھی۔ پوچھا۔۔۔۔۔ ”کیوں ملنا چاہتی ہیں؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا؟“

”تم کون ہو؟“

میں نامعلوم کس طرح مجھے احساس ہوا کہ اس نے اپنی حالت کو سنبھال لیا ہے۔ ہنس کر کہا..... ”نہیں مہاراج! تمہیں جتنا بھولا سمجھا تھا اتنے بھولے تم نہیں ہو میرے کہنے کا جو طریقہ ہے اس کو تم نے سمجھ لیا ہے مگر یہ بھی عرض کر دوں۔ کہ تمہاری نسبت زیادہ عقلمند کہلانے والے بھی اس پر یقین کر لیتے ہیں۔ پس اگر اتنے زیادہ دور اندیش اور تیز فہم ہیں تو مصاحبی کا یہ کاروبار کیوں اختیار کیا ہے؟ یہ نوکری تو آپ جیسے انسان سے نہ ہوگی۔ جاؤ یہاں سے فوراً کھسک جاؤ۔“

مارے غصہ کے میرا خون کھول اٹھا۔ لیکن میں نے اس کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ قدرتی لہجے میں کہا..... ”نوکری جتنے دن ہو سکے غنیمت ہے۔ بیکار سے بیکار بھلی۔ سمجھیں نا؟ اچھا اب میں جاتا ہوں باہر کے لوگ شاید کچھ اور ہی سمجھ بیٹھیں۔“

پیاری نے جواب دیا۔ ”سمجھ بیٹھیں تو یہ تمہارے لیے خوش نصیبی کی بات ہے مہاراج؟ آپ کو افسوس نہیں ہونا چاہئے۔“

جواب دے بغیر ہی جب میں دروازے پر آکھڑا ہوا تو وہ دفعۃً قہقہہ مار کر اٹھی اور بولی..... ”دیکھو بابو، میری آنکھوں کے آنسوؤں کی بات بھول مت جانا۔ دوست احباب میں، کمار صاحب کے دربار میں، ظاہر کر دو گے تو ممکن ہے تمہاری تقدیر کھل جائے۔“

میں جواب دے بغیر باہر ہو گیا۔ لیکن اس بے حیا کی ہنسی اور بھی زیادہ آزار کے ساتھ کچھو کے کانٹے کی طرح جسم میں جلن پیدا کرنے لگی۔

اپنے ڈیرہ پر آ کر اور ایک پیالہ پائے پی کر چرٹ منہ میں دبا کر اور اپنے آپ کو امکان بھر اطمینان کے ساتھ ٹھنڈا کر کے سوچنے لگا..... یہ کون ہے؟ میں اپنی پانچ چھ سال کی عمر تک کے تمام واقعات صاف طور پر یاد کر سکتا ہوں۔ مگر ماضی کے پردہ پر جہاں تک نظر جا سکتی تھی اتنی دور تک میں نے خوب چھان بین کر دیکھا۔ لیکن کہیں بھی اس پیاری کا کھون نہ ملا۔ پھر بھی یہ مجھے خوب پہچانتی ہے۔ بوا تک کی بات جانتی ہے۔ میں غریب ہوں یہ بھی اس سے مخفی نہیں اس لیے اور تو کوئی گہری چال اس میں نہیں ہو سکتی۔ تاہم جس طرح بھی ہو مجھے یہاں سے جلد از جلد بھگا دینا چاہتی ہے۔ مگر یہ کس لئے؟ میرے لیے یہاں رہنے نہ رہنے سے اس کو کیا مطلب؟ باتوں ہی باتوں میں اس نے کہا تھا..... دنیا میں نفع و نقصان ہی کیا سب کچھ ہے۔ پیار محبت کچھ نہیں؟ میں نے جس کو آنکھوں سے پہلے کبھی نہیں دیکھا اس کے منہ کی یہ بات یاد کر کے ہی مجھے ہنسی آگئی لیکن تمام گفتگو دوبار اس کا آخری طعنے مجھے چسیدنے لگا۔

شام کو شکاریوں کا گروہ واپس لوٹ آیا۔ نوکروں کی زبانی سنا۔ آٹھ پرندے مار کر لائے گئے

کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس کا چنچل اور حاضر جواب لہجہ درحقیقت اضطراب سے بھرا تھا۔ بواجی کے پاس ہی رہتے ہونا؟..... اور کہاں رہو گے؟ شادی ہوئی نہیں..... یہ تو میں دیکھ ہی رہی ہوں۔ پڑھتے لکھتے ہو یا وہ بھی اس کے ساتھ ہی ختم کر دیا؟“

اب تک تو میں اس کی پریشانی اور سوالات کے سلسلے کو کسی نہ کسی طرح برداشت کرتا رہا۔ مگر نامعلوم کیوں آخری بات مجھے گویا ناقابل برداشت معلوم ہوئی۔ میں نے چڑ کر خشک لہجے میں کہا..... ”اچھا کون ہوتم؟ زندگی میں تمہیں کہیں دیکھا ہے۔ یہ تو یاد آتا نہیں۔ میرے متعلق تم اتنی باتیں معلوم کرنا کیوں چاہتی ہو اور معلوم کرنے سے فائدہ ہی کیا ہے؟“

بائی جی کو غصہ نہ آیا وہ ہنس کر بولیں..... ”نفع و نقصان ہی دنیا میں کیا سب کچھ ہے۔ مایا، ممتا پیار محبت کچھ نہیں..... میرا نام ہے پیاری..... لیکن جب میری شکل دیکھ کر بھی نہ پہچان سکے، تو بچپن کا نام سن کر بھی کیسے پہچان لو گے؟ اس کے علاوہ میں تمہارے اس گاؤں کی لڑکی بھی تو نہیں ہوں۔“

”اچھا، تمہارا گھر کہاں ہے؟“

”نہیں یہ میں نہ بتاؤں گی۔“

”تو پھر اپنے باپ کا نام ہی بتا دو؟“

بائی جی زبان کاٹ کر بولیں..... وہ سورگ چلے گئے ہیں۔ رام رام کیا ان کا نام اس گنہگار زبان سے لے سکتی ہوں۔

میں بے قرار ہوا ٹھا بولا..... ”اگر نہیں لے سکتی تو پھر مجھے تم نے پہچانا کس طرح۔ یہی بتاؤ؟ شاید یہ بتانے میں کوئی حرج نہ ہوگا؟“

پیاری نے میرے دلی جذبات کو بھانپ کر مسکرا دیا کہا..... ”نہیں اس میں کوئی حرج نہیں..... لیکن کیا تم یقین کر سکو گے؟“

”کہہ دو نا۔“

پیاری نے کہا..... ”تمہیں پہچانا تھا مہاراج بدھ مت کی مار سے، اور کس طرح؟ تم نے میری آنکھوں میں جتنا پانی بہایا ہے۔ خوش قسمتی سے سورج نے اس خشک کر دیا ہے ورنہ آنکھوں کے اس کھارے پانی سے ایک تالا بھر گیا ہوتا۔ پوچھتی ہوں کیا اس پر یقین کرو گے؟“

اور میں سچ جی ہی یقین نہ کر سکا۔ لیکن یہ میری غلطی تھی۔ اس وقت کسی طرح بھی خیال نہ آیا۔ کہ پیاری کے ہونٹوں کی بناوٹ کچھ اس قسم کی ہے۔ کہ ہر بات وہ مذاق میں ہی کہتی ہے اور دل ہی دل میں ہنستی ہے۔ میں خاموش رہ گیا۔ وہ بھی کچھ دیر خاموش رہ کر سچ جی ہی ہنس پڑی۔ مگر صرف اتنی ہی دیر

”نہیں“

”تو پھر؟ اس گاؤں میں ہی دو ایک ایسے سدھ ہیں جنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ پھر بھی آپ اگر یقین نہیں کرتے، منہ پر ہتے ہیں تو یہ صرف دو ورق انگریزی پڑھ لینے کا نتیجہ ہے۔ خصوصاً بنگال کے لوگ تو ناستک ملیچھ ہو گئے ہیں۔“ کہاں کی بات کہاں آپڑی، دیکھ کر میں ششدر رہ گیا ہوا..... ”دیکھئے اس کے متعلق میں کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میرا یقین میرے پاس ہے۔ میں خواہ ناستک ہوں یا ملیچھ ہوں۔ لیکن میں بھوت کو نہیں مانتا۔ جو کہتے ہیں کہ ہم نے آنکھوں سے دیکھا ہے وہ یا تو دھوکہ کھا گئے ہیں یا جھوٹے ہیں۔ یہی میرا خیال ہے۔“

اس بھلے انسان نے جھٹ میرے دائیں ہاتھ کو پکڑ کر کہا..... ”کیا آپ آج رات کو شمشان جاسکتے ہیں؟“

میں ہنس کر بولا، ”جاسکتا ہوں، بچپن سے ہی میں بے شمار راتوں میں لا تعداد شمشانوں میں گیا ہوں۔“ بوڑھا چکر بول اٹھا..... ”آپ سخی مت بگھاڑیئے بابو۔“ اتنا کہہ کر اس نے اس شمشان کا تمام سامعین کو حیرت میں ڈال دینے والا تذکرہ شروع کر دیا۔ ”وہ شمشان کچھ ایسی ویسی جگہ نہیں ہے۔ یہ عظیم (مہان) شمشان ہے۔ یہاں ہزاروں انسانی کھوپڑیاں شمار کی جاسکتی ہیں۔ اس شمشان میں ہر رات مہا بھیروی اپنے ہمراہیوں کیساتھ انسانی کھوپڑیوں سے گیند کھیلتی ہے۔ اور ناچتی ہوئی گھومتی ہے۔ ان کے کھکھلا کر ہنسنے کی مہیب آواز سے کتنی ہی مرتبہ کتنے ہی بے اعتقاد انگریز بچوں، مجسٹریٹوں کے بھی دل کی دھڑکن بند ہو گئی ہے۔“ اس قسم کی لرزہ خیز اور روٹنے کھڑے کر دینے والی کہانی وہ اس طرح بیان کرنے لگا۔ کہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں دن کے وقت خیمے کے اندر بیٹھے ہوئے بھی بہت سے لوگوں کے سر کے بال تک کھڑے ہو گئے۔ ترجمہی نظر سے میں نے دیکھا کہ پیاری ما معلوم کب پاس آ کر بیٹھ گئی ہے۔ اور ان باتوں کو ہمہ تن گوش ہو کر سن رہی ہے۔

اس طرح جب اس مہاشمشان کی داستان ختم ہوئی تو مقرر صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا..... ”کیوں بابو جی! آپ جائیں گے؟“

”جاؤں گا کیوں نہیں؟“

”جاؤ گے اچھا آپ کی مرضی جان جانے پر.....“

میں ہنس کر بولا..... ”نہیں صاحب نہیں، جان جانے پر بھی تمہیں الزام نہیں دیا جائے گا۔ تم اس کے لیے مت ڈرو۔ لیکن انجانی جگہ پر میں بھی خالی ہاتھ نہ جاؤں گا۔ بندوق ساتھ ہوگی۔“

بحث زیادہ زوردار ہو چکی ہے اس کا احساس کر کے میں وہاں سے اٹھ آیا۔ ”پرندہ مارنے کی تو

ہیں۔ کمار نے مجھے بلا بھیجا۔ طبیعت درست نہ ہونے کا بہانہ کر کے میں بستر پر ہی پڑا رہا۔ اور اسی طرح پڑے پڑے رات کو دیر تک پیاری کار قص و فغہ اور مے خواروں کی واہ واہ سنتا رہا۔

اس کے بعد تین چار دن بدستور ایک ہی طرح سے کٹ گئے۔ بدستور اس لیے کہتا ہوں کہ صرف شکار کو چھوڑ کر اور سب باتیں ہر روز ایک سی ہوتی تھیں۔ پیاری کی بدو عاشا پنا اثر کر چکی ہو۔ جانداروں کے خون کے متعلق کسی میں کچھ بھی جوش و خروش میں نے پھر نہیں دیکھا۔ کوئی خیمے کے باہر بھی نکلتا نہیں چاہتا۔ پھر بھی انہوں نے مجھے نہ چھوڑا۔ میرے وہاں سے بھاگ جانے کی کوئی خاص اور مقبول وجہ نہ تھی۔ مگر اس بابائی جی سے مجھے کچھ نفرت سی ہو گئی۔ وہ جب حاضر ہوتی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا گویا کوئی مجھے مار رہا ہو۔ اٹھ کر جب وہاں سے چلا جاتا تو کچھ سکون ملتا، اور اگر اٹھ نہ سکتا تو کسی دوسری طرف منہ پھیر کر کسی کے ساتھ باتیں کرتے کرتے جھوٹے ہونے کا سوا گنا بھرتا۔ اس وقت بھی وہ مجھ سے آنکھ ملانے کی ہزار کوشش کیا کرتی یہ بھی میں محسوس کرتا۔ شروع شروع میں دو تین دن اس نے مجھے مخاطب کر کے مذاق کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن میرے رویہ کو دیکھ کر وہ یک دم من ہو رہی۔

سنجر کا دن تھا۔ اب کسی طرح بھی میں ٹھہر نہیں سکتا۔ کھاپی پکنے کے بعد بھی آج روانہ ہو جاؤں گا۔ اس بات کا فیصلہ ہو جانے کی وجہ سے آج صبح سے ہی گانے بجانے کی بیٹھک جم گئی تھی۔ تھک کر بابائی جی نے گانا بند کیا ہی تھا کہ اچانک تمام داستانوں سے افضل بھوتوں کی داستان شروع ہو گئی۔ پل بھر میں ہی جو جہاں تھا اس نے وہیں داستان سرا کو گھیر لیا۔

پہلے تو میں لا پراہی سے سنتا رہا۔ لیکن آخر کار میں بیقرار ہو کر بیٹھ گیا۔ کہانی سنانے والے گاؤں کے ایک بوڑھے ہندوستانی تھے۔ کہانی کو کس طرح بیان کرنا چاہئے اس بات کو وہ بخوبی سمجھتے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ”بھوت پریت کے متعلق اگر کسی کو شبہ ہو تو وہ آج اس سنجر کی اماؤں کو اس گاؤں میں آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنے کانوں سے سنے۔ وہ خواہ کسی بھی ذات کا ہو اور خواہ میسا بھی آدمی ہو اور خواہ کتنے ہی آدمیوں کو ساتھ لے کر جائے۔ آج کی رات اس کا شمشان جانا بیکار نہیں ہوگا آج کی تاریک رات اطمینان میں رہنے والے اس پریت کو نہ صرف آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے بلکہ اس کی آواز بھی سنی جاسکتی ہے۔ اور اگر خواہش ہو تو اس سے بات چیت بھی کی جاسکتی ہے۔“ میں اپنے بچپن کی باتیں یاد کر کے ہنس دیا۔ بوڑھا اسے دیکھ کر بولا..... ”آپ میرے پاس آئیے۔“ میں اس کے نزدیک کھسک گیا۔ اس نے پوچھا..... ”آپ یقین نہیں کرتے؟“

”نہیں“

”کیوں نہیں کرتے؟ نہ کرنے کی کوئی خاص وجہ ہے؟“

اس سلسلہ میں اپنے دل کے ساتھ بحث و تمحیص کر کے دیکھ رہا تھا کہ حالات دراصل کیا ہو سکتے ہیں؟ اس قسم کے معاملات میں بھی جن کا شاگرد تھا انہیں بھوت کا بالکل ڈر نہیں تھا۔ لڑکپن کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس رات جب اندر نے کہا..... ”شری کانت، دل ہی دل میں رام نام لیتا رہ، دھڑکا میرے پیچھے بیٹھا ہوا تھا..... صرف اسی دن میں ڈر کے مارے بیہوش ہو گیا تھا۔ اور کسی دن نہیں۔ پھر ڈرنے کا موقع ہی نہ آیا۔ اگر آج کی بات سچ ہو، تو وہ شے ہے کیا؟ خواہ اندر کو بھوت کی ہستی میں اعتقاد تھا۔ لیکن اس نے بھی کبھی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ میں بھی خواہ اپنے دل میں جتنا بھی انکار کیوں نہ کروں مقام اور وقت کے اثر سے اس وقت میں جسم میں سنسنی پیدا ضرور ہوگی دفعۃً سامنے اماؤس کی اس لامحدود تاریکی کی طرف دیکھ کر مجھے کسی گزرتی ہوئی اماؤس کی رات یاد آ گئی۔ وہ بھی ایسا ہی ایک سنچر تھا۔

پانچ چھ سال پیشتر، ہماری پڑوسن نیر وجی کی کم سنی میں بیوہ ہو کر جب پرسوت کی بیماری میں مبتلا ہو کر اور چھ مہینے تک دکھ برداشت کرتے رہنے کے بعد مر گئی۔ تو ان کے بستر مرگ کے پاس میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ باغ کے درمیان مٹی کے ایک مکان میں وہ تنہا رہتی تھیں۔ ہر ایک کی دکھ تکلیف میں، مشکل اور مصیبت میں اتنی خدمت کرنے والی، بے غرض اور نیک عورت محلے بھر میں اور کوئی نہ تھی۔ کتنی ہی عورتوں کو پڑھا لکھا کر، سوئی کا کام سکھا کر، اور خانہ داری کے مشکل امور اور راز سمجھا کر انہوں نے انسان بنادیا تھا۔ اس کا شمار نہ تھا۔ نہایت متین اور سنجیدہ مزاج اور پاکیزہ اخلاق کی بدولت محلہ بھر کے لوگوں کو ان سے بے حد پیار تھا۔ لیکن ان نیر وجی کا جب دفعۃً تیس سال کی عمر میں پاؤں پھسل گیا اور بھگوان نے اس بے موقعہ غنیمت اور شرمندگی سے ان کا زندگی بھر کا اونچا سرمئی میں ملا دیا تو محلے کے کسی بھی آدمی نے اس بد نصیب کو پناہ دینے کے لیے ہاتھ نہ بڑھایا اور گناہ کے نام سے بھی دور بھاگنے والی ہندو سوسائٹی نے اس کے سامنے ہی اپنے کھڑکی کے دروازے بند کر لیے اور اس محلہ میں جہاں شاید ایک بھی فرد ایسا نہ تھا جس نے ضرورت اور تکلیف کے موقع پر کسی نہ کسی طرح نیر وجی کی خدمت سے استفادہ حاصل نہ کیا ہوا۔ اسی محلے کے ایک کونے میں اپنی آخری سچ بچھا کر وہ بد نصیب نفرت اور شرم کے مارے سر نیچا کئے ہوئے تنہا ایک ایک دن شمار کرتی ہوئی طویل چھ مہینوں تک بلا علاج پڑی رہی۔ اپنے پاؤں پھسلنے کا کفارہ ادا کرنے کے بعد، ساون مہینے کی ایک نیم شب میں یہ دنیا چھوڑ کر جس دنیا میں وہ چلی گئی۔ اس کی صحیح تفصیل کسی بھی دھرماتما پنڈت سے دریافت کی جاسکتی ہے۔

میری بوا نہایت ہی پوشیدہ طور پر ان کی مدد کیا کرتی تھیں۔ یہ بات میں اور میرے گھر کی ایک بڑی نوکرانی کے علاوہ اور کوئی نہ جانتا تھا۔ بوائے ایک دن مجھے تنہائی میں بلا کر کہا۔

”بھیا شری کانت، تو تو اس طرح بیمار ہو رہا ہے، اور دکھ میں بہتوں کی خبر لیا کرتا ہے، اس چھو کر کی

ہمت نہیں پڑتی، بندوق کی گولی سے بھوت ماریں گے صاحب!..... بنگالی لوگ انگریزی پڑھ کر ہندو شاستروں کو نہیں مانتے۔ یہ مرغی تک کھا جاتے ہیں..... منہ سے یہ لوگ کتنی ہی سخی، کیوں بھگاریں کام کے وقت بھاگ کھڑے ہوتے ہیں..... ایک معمولی دھونس پڑتے ہی نانی یاد آ جاتی ہے“ اس قسم کی تنقید شروع ہوئی۔ یعنی جن رلیف دلائل اور اچھوتے خیالات کے اظہار سے راجا ریوس کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اور جوان کے دماغ کو پریشان نہیں کر سکتے یعنی جن پر وہ خود بھی شامل ہو کر چند الفاظ کہہ سکتے ہیں۔ اسی قسم کے وہ تمام دلائل تھے۔

ان لوگوں میں صرف ایک آدمی ایسا تھا جس نے تسلیم کیا کہ میں شکار کرنا نہیں جانتا۔ یہ شخص عموماً کم گو تھا اور شراب بھی بہت کم پیتا تھا۔ اس کا نام پرشونم تھا۔ شام کے وقت آ کر اس نے مجھے پکڑ لیا اور کہا..... ”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا کیونکہ اس سے پیشتر میں نے کبھی بھوت نہیں دیکھا۔ اس لئے آج جب ایسا موقع ملا ہے تو میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا“..... یہ کہہ کر وہ خوب ہنسنے لگا۔

میں نے پوچھا..... ”کیا تم بھی بھوتوں کی ہستی کو تسلیم نہیں کرتے؟“

”بالکل نہیں۔“

”کیوں نہیں؟“

”اس لیے کہ بھوت نہیں ہیں؟ اتنا کہہ کر وہ مروجہ اعتراضات اٹھا اٹھا کر بار بار انکار کرنے لگا۔ میں اتنی آسانی سے اپنے ساتھ لے جانے پر رضامند نہ ہوا۔ کیونکہ بہت دنوں کے تجربے کے بعد میں نے سیکھ لیا تھا کہ یہ سب دلیل اور اعتراض کا معاملہ نہیں۔ یہ تو فطرت کا تقاضا ہے عقل کی بنا پر جو کسی ایک بات کو تسلیم نہیں کرتے وہ بھی ڈر اور خطرہ کے درپیش آ جانے پر خوف کے مارے ہوش گم کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن پرشونم اس طرح آسانی سے چھوڑنے والی آدمی نہ تھا۔ وہ لاٹک کس کر اور کپکے بانس کی لکڑی کندھے پر رکھ کر بولا..... ”شری کانت بابو! آپ کی خواہش ہو تو آپ بے شک بندوق لے چلیں مگر اپنے ہاتھ میں جب تک لاٹھی ہے۔ بھوت ہو خواہ پریت۔ میں کسی کو بھی نزدیک پھٹکنے نہ دوں گا۔“

”لیکن کیا وقت پر ہاتھ میں لاٹھی رہے گی بھی؟“

”بالکل اسی طرح رہے گی بابو، آپ اس وقت دیکھ لینا۔ کون بھر کا راستہ ہے۔ رات کو گیارہ بجے سے پہلے ہی روانہ ہونا چاہئے۔“

میں نے محسوس کیا کہ، اس کا اصرار وزن دار ہے۔

جانے کے لیے اس وقت بھی تقریباً گھنٹہ بھر کی دیر تھی۔ میں خیمے کے باہر چہل قدمی کرتا ہوا

ایک آدھ دفعہ کیوں نہیں دیکھ آیا کرتا؟“ اس دن سے متواتر گاہے گاہے میں جا کر انہیں دیکھ آیا کرتا اور بوا کے پیروں سے یہ چیز، وہ چیز خرید کے دے آیا کرتا۔ ان کی موت کے وقت صرف اکیلا میں ہی ان کے پاس تھا۔ کسی شے کا قائل نہ ہونے پر بھی خوف کے مارے جسم میں جو سنسنی پھیل جاتی ہے۔ اس کی مثال کے طور پر میں یہ واقعہ بیان کر رہا ہوں۔

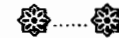
اس دن بھی سادوں کی اماوس تھی۔ رات کے بارے بچے کے بعد آدھی اور طوفان کے زور سے زمین اپنی جگہ سے ہل جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ میں کھاٹ کے پاس ہی ایک بہت پرانی ٹوٹی ہوئی زام کپڑی پر لیٹا ہوا تھا۔ نیرونجی نے اپنے مخصوص نرم لہجہ میں مجھے اپنے بلا کر ہاتھ اٹھا کر میرا کان اپنے منہ پر لا کر آہستہ سے کہا..... ”شری کانت، تو اپنے گھر جا۔“

”یہ کیوں جیجی، ایسی آدھی اور طوفان میں؟“

”رہنے دے آدھی اور طوفان، جان تو پہلے ہے۔“ وہ ہم میں بڑبڑا رہی ہیں۔ یہ سمجھ کر میں نے کہا..... ”اچھا جاتا ہوں، بارش ذرا تھم لینے دو۔ نیرونجی نہایت متفکر ہو انھیں۔“ نہیں نہیں شری کانت، تو جا، جا بھائی جا..... اب ذرا سا بھی مت ٹھہر..... جلدی بھاگ جا۔“ اس دفعہ ان کے گلے کی آواز سے میرے سینے کا اندرونی حصہ تک لرز اٹھا۔ میں بولا..... ”مجھ سے جانے کے لیے کیوں کہہ رہی ہو؟“

جواب میں میرا ہاتھ کھینچ کر اور بند کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے وہ چلا انھیں۔ ”جایگا نہیں تو کیا جانے گا؟ دیکھتا نہیں، مجھے لے جانے کے لیے وہ کالے کالے سپاہی آئے ہیں۔ تو یہاں موجود ہے۔ اس لیے وہ کھڑکی میں سے مجھے ڈرا رہے ہیں۔“

اس کے بعد انہوں نے کہنا شروع کیا..... ”وہ اس کھاٹ کے نیچے ہیں۔ وہ سر کے اوپر ہیں۔ وہ مارنے آرہے ہیں۔ وہ پکڑ لیا۔“ رات کے آخری حصہ میں ان کی یہ چیخ و پکار اسی وقت ختم ہوئی۔ جب ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔



وہ واقعہ آج بھی میرے سینے میں نقش ہے۔ اس رات مجھے معلوم ہوا تھا۔ لورایا بھی یاد آتا ہے کہ کچھ چہرے بھی دیکھے تھے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس وقت اس واقعہ کی یاد آنے سے ہنسی آتی ہے۔ لیکن اس وقت اگر اس بات کا مجھے یقین نہ ہوتا کہ دروازہ کھول کر باہر ہوتے ہی نیرونجی کے کالے کالے سپاہی سنتریوں کی بھیڑ میں جا کر محصور ہو جاؤں گا تو اس دن اماوس کی اس تیرگی کو حقیر سمجھ کر بھی میں بھاگ کھڑا ہوتا۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سب کچھ بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے بلکہ دم توڑنے والا انسان موت کی بیہوشی میں ہی چلا رہا ہے۔ اس کو بھی میں سمجھتا تھا..... اسی دوران میں.....

”بابو؟“

چوک کر مڑ کر میں نے دیکھا، رتن ہے۔

”کیا ہے رے؟“

”بائی جی نے پرنام کہا ہے۔“

میں جتنا حیران ہوا اتنا ہی پریشان بھی۔ اتنی رات گئے اچانک بلا بھیجنا صرف اپنی توہین ہی نہیں بلکہ گزشتہ تین چار دنوں کے دونوں طرف کے رویہ کو دیکھ کر مجھے بالکل بے ہودہ معلوم ہوا۔ مگر اس نتیجے کے طور پر نوکروں کے روبرو کسی طرح کا جوش ظاہر نہ ہو جائے۔ اس خیال سے میں نے ضبط کر کے کہا..... ”آج میرے پاس وقت نہیں ہے رتن، مجھے باہر جانا ہے کل مل سکوں گا۔“

رتن سکھایا پڑھایا نوکر تھا۔ ادب قاعدے میں پکا۔ مودب اور شیریں لہجے میں بولا..... ”بڑی ضرورت ہے بابو جی، ایک دفعہ اپنے قدموں کی خاک دینی ہوگی ورنہ بائی جی نے کہا ہے کہ وہ خود ہی آ جائیں گی۔“

تجاہی، اس خیمہ میں رات کو اتنے لوگوں کی موجودگی میں۔ میں نے کہا۔ ”تو سمجھا دینا رتن! آج نہیں کل صبح ہی مل لوں گا۔ آج تو میں کسی طرف بھی نہیں جاسکتا۔“ رتن نے جواب دیا۔ ”تو پھر وہ ہی

سوچنے کی قیمت کیا ہے۔“ یہ تو تم خود بھی جانتی ہو۔ اور تم بھی اتنا گرجاؤ گی کیا کبھی کسی نے سوچا تھا۔“
 لمحہ بھر تک پیاری کے چہرہ پر موسم سرما کی ابر آلود چاندنی کی مانند تبسم کا ایک خط جھلک اٹھا۔
 مگر وہ لمحہ بھر کے لیے ہی تھا۔ دوسرے ہی لمحہ۔ اس نے بے خوف لہجہ میں کہا۔۔۔۔۔ ”میرے متعلق تم کیا جانتے ہو؟ کون ہوں میں، بتاؤ؟“

”تم ہو پیاری“

”یہ تو سبھی جانتے ہیں۔“

”جس بات کو سب لوگ نہیں جانتے وہ بھی میں جانتا ہوں۔ اسے سن کر کیا تم خوش ہوگی؟ اگر خوش ہو، تو خود ہی اپنا تعارف کرادیتیں۔ لیکن جس حالت میں تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا تو میرے منہ سے بھی کوئی بات نہ سن سکو گی۔ سوچ کر دیکھو اپنے آپ کو ظاہر کر سکو گی یا نہیں؟ مگر اب وقت نہیں ہے۔۔۔۔۔ میں جاتا ہوں۔“

پیاری نے برق کی سی تیزی کے ساتھ میرا راستہ روک کر کہا۔۔۔۔۔ ”اگر نہ جانے دوں تو کیا زبردستی چلے جاؤ گے۔“

”لیکن جانے ہی کیوں نہ دو گی؟“

پیاری بولی۔۔۔۔۔ ”جانے دوں؟ سچ ہی کیا جھوٹ نہیں ہوتے جو تمہارے صرف جانے دو، کہنے سے ہی جانے دوں گی؟ میں کہے دیتی ہوں کہ میں بات کی بات میں ”پیاری میا، چلا کر بھیڑ جمع کر دوں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے بندوق چھین لینے کی کوشش کی۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ لمحوں سے میری ناراضگی ہنسی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس دفعہ خوب ہنس کر کہہ دیا۔۔۔۔۔ ”سچ ہی کہتے ہو تو ہیں یا نہیں۔ یہ تو میں نہیں جانتا لیکن جھوٹ موٹ کے بھوت ضرور ہوتے ہیں وہ سامنے کھڑے ہو کر بات چیت کرتے ہیں، روتے ہیں، راستہ روکتے ہیں اور ایسے ایسے کتنے ہی شہرت کے کام کرتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر گردن دبوچ کر کھا بھی جاتے ہیں۔“ پیاری اداس ہو گئی اور چشم زدن کے لیے شاید سوچ نہ سکی کہ کیا کہے۔ اس کے بعد بولی۔۔۔۔۔ ”اگر یہ بات ہے تو جو تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم نے مجھے پہچان لیا، یہ تمہاری غلطی ہے۔ وہ بے شمار شہرت کے کام کرتے ہیں یہ سچ ہے مگر گردن دبوچنے کے لیے راستہ روک کر کھڑے نہیں ہوتے۔ انہیں اپنے پرانے کی تیز ہوتی ہے۔ میں نے پھر ہنس کر سوال کیا۔ یہ تو ہوئی تمہاری اپنی بات لیکن کیا تم بھوت ہو؟“

پیاری بولی۔۔۔۔۔ ”بھوت ہی تو ہوں اور نہیں تو کیا؟ جو لوگ مر کر بھی نہیں مرتے وہی تو بھوت ہیں۔ یہی تو تمہارے کہنے کا مطلب ہے تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ خود ہی پھر کہنے لگی۔ ”ایک حساب سے تو، جو

آجائیں گی باپو جی، میں گزشتہ پانچ سال سے دیکھ رہا ہوں کہ بائی جی کی بات میں کبھی ذرا سا بھی فرق نہیں پڑتا۔ آپ نہیں چلے گئے تو وہ یقیناً ہی آجائیں گی۔“

اس بے موقعہ اور بے فائدہ ضد کو دیکھ کر میں ایزی سے چوٹی تک جل اٹھا ہوا۔۔۔۔۔ ”اچھا ٹھہرو، میں آتا ہوں۔“ خیمے کے اندر دیکھا، شراب کی عنایت سے جاگتا کوئی نہیں۔ پر شوم بھی بے ہوش ہے۔ نوکروں کے خیمے میں صرف دو چار آدمی بھاگ رہے ہیں۔ جھٹ پٹ، بوٹ پٹن کر ایک کوٹ جسم پر ڈال دیا۔ راکفل تیار رکھی تھی۔ اس کو ہاتھ میں لے کر رتن کے ساتھ ساتھ بائی جی کے خیمہ میں پہنچا۔ پیاری سامنے ہی کھڑی تھی۔ مجھے جھکے ہوئے سر سے بار بار دیکھتے ہوئے کسی قسم کی تمہید باندھے بغیر ہی غصہ آمیز لہجہ میں بولی۔۔۔۔۔ ”شمشان وغیرہ میں تمہارا جانا نہ ہو سکے گا۔ کسی طرح بھی نہیں۔“

بہت زیادہ متعجب ہو کر میں بولا۔۔۔۔۔ ”کیوں؟“

”کیوں اور کیا؟ کیا بھوت پریت نہیں ہیں۔ جو اس سنچر کی اماوس کو تم شمشان جاؤ گے۔ کیا تم جان سلامت لے کر واپس آ سکو گے وہاں سے؟“

اتنا کہہ کر پیاری یکا یک رونے لگی اور آنسوؤں کی مسلسل جھڑی لگا دی۔ میں چپ چاپ اضطراب سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ کیا کروں، کیا جواب دوں، کچھ سوچ بھی نہ سکا۔ اور اس سوچ نہ سکنے میں تعجب ہی کیا تھا؟ جس سے جان نہیں، پہچان نہیں وہ اگر ہمدردی سے آدمی رات کو بلا کر خواہ مخواہ رونا شروع کر دے تو کون ایسا ہے جو اس باختہ نہ ہو جائے۔ میری طرف سے جواب نہ پا کر آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ”تم کیا کسی دن بھی آرام اور چین سے نہ بیٹھو گے؟ ایسے ضدی بن کر ہی زندگی گزار دو گے؟ جاؤ، دیکھوں، تم کس طرح جاتے ہو؟ پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے شال اٹھا کر اپنے جسم پر ڈالنے کی تیاری کر دی۔

میں نے اختصار کے ساتھ کہا۔۔۔۔۔ ”اچھا ہے چلو، میرے اس پوشیدہ طنز سے جل بھن کر پیاری بولی۔۔۔۔۔ ”آہا، نزدیک و دور پھر تو تمہاری نیک نامی کی حد نہ رہے گی۔ بابوشکار کیلئے کے لیے آئے تھے اور ایک رقاصہ کو ساتھ لے کر آدمی رات بھوت دیکھنے گئے تھے واہ! میں پوچھتی ہوں گھر سے کیا بالکل ہی اوٹ، ہو کر آئے ہو؟ نفرت، بے اعتنائی، لاج شرم وغیرہ کیا کچھ باقی نہیں رہ گئی۔“ کہتے کہتے اس کا تیز لب و لہجہ گویا بے قرار ہو کر بھاری ہو گیا، بولی۔۔۔۔۔ ”پہلے تو تم ایسے نہ تھے۔ تم اتنے گرجاؤ گے یہ تو کسی نے کبھی سوچا نہ تھا۔“ اس کے آخری جملہ پر اگر اور کوئی وقت ہوتا تو میں اتنا ناراض ہوا ہوتا جس کی حد نہ رہتی۔ لیکن اس وقت غصہ نہ آیا۔ دل ہی دل میں ایسا محسوس ہوا گویا میں نے پیاری کو پہچان لیا ہے اور دل میں یہ بات کیوں آئی اس کا ذکر پھر کروں گا۔ اس وقت تو یہی کہہ سکا۔ ”لوگوں کے سمجھنے

دیکھ لیجئے۔ بچاس اور ایک روپے میں تو ایک جوڑی بڑے بکرے بھی نہیں ملتے۔ اور ایک اس رقم میں داماد خرید رہے ہیں۔ ایک سو ایک روپے دو تو ایک دفعہ اس پانے پر اور ایک اس پانے پر بیٹھ کر دو پھول چھوڑ دوں گا دونوں ہی بہنیں ایک ساتھ پار ہو جائیں گی۔ کیا ایک سو ایک روپے..... دو ساڈ خریدنے کا خرچ..... بھی آپ نہ دیں گے؟“ بات کچھ غیر مناسب بھی نہ تھی۔ پھر بھی کافی مول تول اور بڑی منت سفارش کے بعد ستر روپے میں طے ہو کر ایک ہی رات میں ایک ساتھ سرکش اور راج کشمی کی شادی ہو گئی۔ دو دن بعد ستر روپے نقد لے کر دو پشت کا دو خاندان برآمن داماد باکرا چل دیا۔ اس کے بعد پھر کسی نے اسے نہ دیکھا۔ ڈیڑھ سال بعد پلگ کے بخار سے سرکش میمرنگی اور اس کے بھی ڈیڑھ سال بعد اس راج کشمی نے کاشی میں مرکز روان حاصل کیا۔ یہی ہے پیاری بانی کی مختصر سوانح حیات۔

بالی جی نے کہا..... ”تم کیا سوچ رہے ہو، بتاؤں بھلا؟“

”کیا سوچ رہا ہوں؟“

”تم سوچ رہے ہو۔ آہا لڑکین میں میں نے اسے کتنی تکلیف دی تھی۔ کانٹے دار جھاڑیوں میں بھیج کر روز روز کر دندے منگوا تا تھا۔ اور اس کے عوض مار پیٹ ہی کرتا رہا ہوں۔ مارکھا کر یہ گپ چپ ہمیشہ رویا ہی کی ہے۔ لیکن کسی شے کی بھی خواہش نہ کی۔ آج اگر یہ کوئی بات کہتی ہے تو سن لینے میں کیا حرج ہے۔ نہ سہی، نہ گیا آج شمشان کو..... یہی نا۔“

میں ہنس پڑا۔

پیاری نے بھی ہنس کر کہا..... ”یہ تو ہونا ہی چاہئے۔ بچپن میں جس سے ایک مرتبہ پیار کیا جاتا ہے کیا وہ کبھی بھولتا ہے؟ اور اگر اصرار کرے تو پھر اسے کیا پاؤں سے ٹھوکر مار کر ٹالا جاسکتا ہے؟ دنیا میں کون اتنا سنگدل ہے؟ چلو ذرا بیٹھ لو۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ رتن، بابو جی کے جوتے تو کھول دے..... ارے ہنستے ہو؟“

”ہنستا ہوں یہ دیکھ کر تم لوگ انسان کو پھسلا کر کس طرح قابو میں کر لیا کرتی ہو؟“

پیاری بھی مسکرا دی۔ بولی..... ”یہ دیکھ کر ہنستے ہو، اوروں کو تو باتوں میں بھلا کر قابو میں کیا جاسکتا ہے لیکن ہوش میں آتے ہی جس کے قابو میں رہی ہوں اسے بھی کیا باتوں میں بھلایا جاسکتا ہے۔ اچھا، آج تو جیسے میں بات کرتی ہوں مگر ہر روز جب کانٹوں میں الجھ کر ہار گونہہ دیتی تھی۔ اس وقت کتنی بات کیا کرتی تھی کہو نا؟ وہ کیا تمہاری مار کے خوف سے، یہ بات بھول کر بھی اپنے دل میں ملتا نا۔ راج کشمی ایسی نہیں ہے۔ لیکن رام رام! تم تو مجھے بالکل ہی بھول چکے تھے۔ دیکھ کر پہچان بھی نہ سکے۔“

میں نے جواب دیا۔ ”میں نے تمہیں اپنے دل میں جگہ ہی کب دی تھی۔ جو بھولتا نہ؟ بلکہ آج

میں مریجی ہوں یہ سچ ہے لیکن سچ ہو خواہ جھوٹ اپنے مرنے کی خبر میں نے مشہور نہیں کی۔ ماما کے ذریعہ ماں نے پھیلائی تھی۔ سننا چاہتے ہو سب حال؟“

مرنے کی یہ بات سنتے ہی میرا تمام شک رفع ہو گیا۔ میں نے اچھی طرح جان لیا کہ یہ راج کشمی ہے۔ بہت عرصہ پہلے وہ اپنی ماں کے ساتھ تیرتھ یا ترا کرنے گئی تھی۔ اور پھر واپس لوٹ کر نہ آئی۔ ماں نے گاؤں میں آ کر یہ بات مشہور کر دی کہ کاشی میں بیٹے کی بیماری سے وہ مر گئی ہے..... اسے میں نے کبھی دیکھا ہے یہ بات مجھے یاد نہ آتی تھی۔ مگر اس کی ایک عادت پر میں جب سے یہاں آیا تھا اسی وقت سے غور کر رہا تھا۔ یعنی جب وہ غصے میں ہوتی تھی تو اپنے ہونٹ دانتوں کے نیچے دبایا کرتی تھی۔ کبھی کہیں کسی کو بالکل ایسا کرتے ہی یاد دیکھا ہے صرف یہی بات بار بار یاد آتی تھی۔ وہ کون تھا؟ کہاں دیکھا تھا؟ کب دیکھا تھا؟ اس کے متعلق کچھ بھی یاد نہ آتا تھا۔ وہی راج کشمی آج ایسی ہو گئی ہے، یہ دیکھ کر میں حیرت و استعجاب سے دم بخود رہ گیا۔ جس وقت میں اپنے گاؤں کے پنڈت منسا کی پاٹھ شالہ میں سب طالب علموں کا سردار تھا تو اس کے دو پشت کے معزز باپ نے اپنی دوسری شادی کر کے اس کی ماں کو گھر سے نکال دیا۔ شوہر سے ٹھکرائی ہوئی ماں، سرکش اور راج کشمی نام کی دو لڑکیوں کو لے کر اپنے باپ کے گھر چلی آئی۔ اس کی عمر اس وقت آٹھ نو سال کی ہوگی۔ اور سرکش کی بارہ تیرہ سال۔ اس کا رنگ تو ضرور ہی خوب گورا تھا۔ لیکن طیریا اور تلی کی بیماری سے پیٹ منکے کی طرح، ہاتھ پاؤں سوکھی لکڑی کی طرح اور سر کے بال تانبے کی سلاخوں کی طرح تھے۔ اور کتنے تھے یہ بھی گنے جاسکتے تھے۔ میری مار کے ڈر سے یہ لڑکی کروندے کی جھاڑی میں گھس کر کروندوں کا ہار بنا کر مجھے دیا کرتی تھی۔ اگر وہ ہار کسی دن چھوٹا ہوتا تو میں اپنا پرانا سبق پوچھ کر اسے جی بھر کر چپٹا کرتا تھا۔ مارکھا کر یہ لڑکی ہونٹ چباتی ہوئی گم سم ہو کر بیٹھ رہتی۔ لیکن کسی طرح بھی یہ نہ کہہ سکتی کہ روز روز کروندے جمع کرنا اس کے لیے کتنا مشکل ہے۔ جو کچھ بھی ہوا اتنے روز تک تو میں یہی سمجھتا تھا کہ وہ مار کے خوف سے اتنی تکلیف برداشت کرتی تھی۔ لیکن آج دفعہ کچھ شک پیدا ہو گیا۔ خیر جانے دو۔ اس کے بعد اس کی شادی ہو گئی۔ یہ شادی بھی ایک عجیب یو پار تھا۔ بچارا ماہا بھانجیوں کے بیاہ کی فکر میں مرا جا رہا تھا۔ کارے قضا سے کہیں نہ خبر آئی۔ درجنی دت کارو نیا اونچے خاندان کی اولاد ہے دت صاحب باکڑے سے اپنی تبدیلی ہوتے وقت اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ درجنی دت کے دروازہ پر ماہا دھرنادے کر بیٹھ گئے۔ برہمن کی قوی حفاظت کرنی ہو گئی۔ ابھی تک ہر ایک یہی جانتا تھا، دت صاحب کارو نیا سیدھا سادہ اور نیک انسان ہے مگر مطلب کے موقع پر دیکھا گیا کہ رسو نیا مہاراج دنیاوی عقل میں کسی سے رتی بھر بھی کم نہیں۔ صرف اکیاون روپے ہتھ کی بات سنتے ہی وہ زور سے سر ہلا کر بولے..... ”صاحب! اتنے سستے تو نہیں ہو سکتا۔ بازار کا بھاؤ

پیاری بولی..... ”رام رام! ایسی بات مت کہو، اچھے بھلے لوٹ آؤ۔ اس صداقت کی آزمائش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میری ایسی تقدیر کہاں کہ وقت موقع پر اپنے ہاتھ پاؤں ہلا جلا کر تمہیں تندرست و توانا بنا سکوں اگر یہ ہو تو سمجھوں گی کہ اس زندگی کے ایک اہم فرض کو ادا کر ڈالا۔“ اتنا کہہ کر اور منہ پھیر کر اس نے اپنے آنسو چھپائے۔ یہ ہری کین کی مدہم روشنی میں بھی اچھی طرح جان گیا۔

”اچھا بھگوان تمہارا یہ ارمان بھی کسی دن پورا کریں۔“ کہہ کر اور مزید تاخیر کے بغیر میں خیمے سے باہر آ کھڑا ہوا۔ کون جانتا تھا کہ ہنسی مذاق میں ہی میری زبان سے ایک خوفناک سچائی نکل جائے گی۔

خیمے کے اندر سے آنسوؤں کی کثرت بھرے ہوئے گلے سے درگا، درگا، کی دردناک پکار کان میں آئی اور میں تیز چال سے چل دیا۔

میرا تمام دل پیاری کی باتوں سے مستور تھا۔ کب میں آم کے باغچے کے نہایت تاریک راستہ کو پار کر گیا اور کب ندی کے ساحل پر سرکاری باندھ کے اوپر آ کھڑا ہوا۔ یہ مجھے معلوم ہی نہیں ہو سکا۔ تمام راستہ بھر محض یہی ایک بات سوچتا رہا کہ عورت کا دل کیسا عظیم اچھا ہے۔ اس تلی کی مریض لڑکی نے اپنے منکے سے پیٹ اور لکڑی جیسے ہاتھ پاؤں لے کر پہلی مرتبہ کس وقت مجھے چاہا تھا اور کدندوں کی مالا سے اپنی غریبانہ پرستش کو کامیاب بنایا تھا۔ یہ میں بالکل ہی جان نہ سکا اور آج جب مجھے اس کا احساس ہوا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ حیرت کچھ اس لیے بھی تھی کہ ناول اور ناولوں میں بچپن کی محبت کی بے شمار کہانیاں پڑھی ہیں۔ لیکن جس شے کو فخر کے ساتھ، اپنی خداداد دولت کہہ کر ظاہر کرتے ہوئے بھی اسے جھجک نہیں ہوئی۔ اس کو اس نے اتنے دنوں تک اپنی اس نفرت آمیز زندگی کے سینکڑوں جھوٹے پیاروں کی موجودگی میں کس کونے میں زندہ رکھ چھوڑا تھا۔ کس جگہ سے اس کے لیے خوراک بہم پہنچاتی رہی؟ کس راستے داخل ہو کر وہ اس کی پرورش کرتی رہی؟

”باپ“

میں یک دم چونک پڑا۔ سامنے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ بھوڑے رنگ کی ریت کا ایک وسیع میدان ہے اور اسے چیرتی ہوئی ندی کی بل کھاتی ہوئی دھار ٹیڑھی میڑھی ہو کر بہت دور جا کر ناپید ہو گئی ہے۔ تمام میدان میں جا بجا کائی کے جھنڈا لگے ہیں۔ تاریکی میں یکا یک ایسا معلوم ہوا وہ تمام جھنڈا ایک ایک آدمی ہیں جو آج کی اس تیرہ دھار مادہ سائیرات کو بھوت روحوں کا قص دیکھنے کے لیے مدعو ہو کر آئے ہیں۔ اور ریت کے بچے ہوئے فرش پر اپنی اپنی مسند لگائے سناٹے میں انتظار کر رہے ہیں۔ سر پر گھنے کالے آسمان میں لاتعداد ستارے بھی بے تابی کے ساتھ اپنی آنکھوں کو ایک ساتھ کھولے ہوئے

میں نے تمہیں پہچان لیا ہے یہ دیکھ کر مجھے خود ہی حیرت ہو رہی ہے۔ اچھا بارہنچ چکے..... جاتا ہوں۔“ پیاری کا ہنستا چہرہ آن واحد میں بالکل پھیکا پڑ گیا۔ قدرے سنسہل کر اس نے کہا..... ”اچھا تم بھوت پریت کے قائل نہ بنو۔ لیکن سانپ، بچھو، بھیڑیے، شیر، جنگلی سور وغیرہ تو بن جنگل میں اندھیری راتوں کو پھرا ہی کرتے ہیں انہیں تو ماننا چاہئے۔“

میں نے کہا..... ”ان کو تو میں مانتا ہی ہوں۔ اور ان سے خوب محتاط ہو کر چلتا ہوں۔“ مجھے جانے کے لیے تیار دیکھ کر وہ آہستہ سے بولی..... ”تم جس دھات کے بنے ہوئے انسان ہو۔ مجھے معلوم ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہیں روک نہ سکوں گی۔ یہ اندیشہ مجھے خوب ہی ہو رہا تھا تاہم میں نے سوچا کہ رو دھو کر ہاتھ پاؤں جوڑ کر آخری لمحہ تک شاید تمہیں روک سکوں۔ مگر دیکھتی ہوں کہ رونا ہی کامیاب رہا۔“ مجھے جواب نہ دیتے دیکھ کر وہ پھر بولی۔ ”اچھا جاؤ، پیچھے لوٹا کر اب اور بدشگونی نہ کروں گی۔ لیکن اگر کچھ ہو گیا تو اس پردیس میں، غیر جگہ، راجے راجوڑے یا دوست احباب کسی بھی کام نہ آئیں گے۔ یہ تو سب مجھے ہی بھگتنا پڑے گا۔ مجھے پہچان نہیں سکتے۔ یہ میرے منہ پر ہی کہہ کر تم تو اپنی مرداگی کی ڈیگ ہانک کر چل دیے مگر ہمارا دل تو نسوانی ہے مصیبت کے وقت میں تو یہ نہ کہہ سکوں گی۔ کہ میں تمہیں پہچانتی ہی نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک گہری آہ دہائی۔ جاتے جاتے میں نے واپس مڑ کر کھڑے ہو کر ہنس دیا۔ نامعلوم مجھے کسی قدر کوفت ہوئی۔ میں بولا..... ”اچھا ہی ہے بائی جی، یہ تو مجھے ایک بہت بڑا فائدہ ہوگا۔ میرا تو کوئی ہے ہی نہیں۔ اس لیے میں جانہ سکوں گا۔ کیونکہ اس وقت میں یہی خیال کروں گا کہ میرا بھی کہیں کوئی ہے جسے چھوڑ کر جانیں سکتا۔“

پیاری نے جواب دیا۔ ”یہ کیا تم جانتے نہیں ہو؟ ایک سو ایک بار بائی جی، کہہ کر تم خواہ میری کتنی ہی تو ہیں کیوں نہ کرو، راج لکشی تمہیں چھوڑ کر نہ جاسکے گی۔ اس بات کو کیا تم دل سے نہیں جانتے۔ لیکن بغرض محال اگر میں تم کو چھوڑ کر جاسکتی تو اچھا ہی ہوتا۔ تمہیں بھی سبق مل جاتا۔ لیکن کتنی بری ہے عورتوں کی یہ ذات ایک مرتبہ کسی سے پیار کیا کر میں۔“

میں بولا..... ”پیاری بھولے سنیا سی کو بھی بھیک نہیں ملتی، جانتی ہو کیوں؟“

پیاری بولی..... ”جانتی ہوں مگر تمہارے طنز میں اتنی کاٹ نہیں کہ مجھے چھید سکوں۔ یہ میری خداداد دولت ہے۔ اور جس وقت مجھے دنیا کے نیک و بد تک کی تمیز نہ تھی یہ دولت بھی اسی وقت کی ہے آج کی نہیں۔“

میں قدرے نرم ہو کر بولا..... ”اچھی بات ہے چاہتا ہوں کہ آج مجھ پر کوئی آفت آ جائے اور

تمہاری اس خداداد دولت کا ہاتھوں ہاتھ امتحان ہو جائے۔“

تاکر رہے ہیں۔ کوئی ہوائیں کوئی آواز نہیں۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی اپنے سینے کی دھڑکن کے علاوہ کہیں بھی آہٹ محسوس کرنے کی گنجائش نہیں۔ رات کا جو پرندہ، باپ، کہہ کر تھم گیا وہ بھی اور کچھ نہ بولا..... میں آہستہ آہستہ مغرب کی طرف چلا۔ اسی طرح وہ مہاشمشان تھا۔ ایک دن شکار کے لیے آنے پر جس یسر کے جھنڈوں کے جھنڈ کو دیکھ گیا تھا کچھ فاصلہ طے کرنے پر ان کی سیاہی مائل شاخیں اور پتے نظر آنے لگے۔ یہی تھے اس مہاشمشان کے دربان ان ہی کو پار کر کے آگے بڑھنا ہوگا۔ اسی وقت سانس کی قسم سی آہٹ ملنے لگی۔ لیکن یہ ایسی نہ تھی جس سے دل خوش ہو۔ کچھ دور چلنے پر وہ کچھ اور صاف ہوئی۔ کسی ماں کے کبھ کرن کی نیند میں سو جانے پر اس کا نچھڑا پڑے روتے روتے تھک کر اور بے جان سا ہو کر آخر کار جس طرح رہ رہ کر روں روں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوا کہ بالکل اسی طرح شمشان کی غلوت میں کوئی روں روں کر رہا ہے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں۔ کہ جس نے پہلے اس قسم کے رونے کی حقیقت دیکھی سنی نہ ہو۔ وہ اس گہری اندھیری اماوس کی رات میں اکیلا ایک قدم بھی آگے بڑھنا نہ چاہے گا۔ وہ انسان کا بچہ نہیں چگاڑ تھا جو اندھیرے میں اپنی ماں سے بچھڑ کر رہا تھا۔ یہ بات پہلے سمجھے بغیر ممکن نہیں کہ کوئی اپنے آپ یقینی طور پر یہ کہہ سکے کہ یہ آواز انسان کے بچے کی نہیں۔ اور بھی نزدیک جا کر دیکھا ٹھیک یہی بات تھی۔ جھولوں کی طرح سر کی ہر شاخ میں لٹکے ہوئے لاتعداد چگاڑ رات بسر کر رہے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی شیطان بچہ اس طرح بے قرار ہو کر رہ رہا ہے۔

جھاڑی کے اوپر وہ روتا ہی رہا۔ اور اس کے نیچے بڑھتا ہوا میں اس مہاشمشان کے ایک حصے میں جا کھڑا ہوا۔ صبح اس بوڑھے نے جو کہا تھا کہ یہاں لاکھوں انسانی کھوپڑیاں گئی جاسکتی ہیں..... میں نے دیکھا کہ اس بیان میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے۔ تمام میدان انسانی کھوپڑیوں سے بھرا ہوا ہے۔ گیند کھیلنے کے لیے انسانی کھوپڑیاں تو وہاں لاتعداد پڑی ہیں لیکن ابھی تک کوئی بھی کھلاڑی کھیلنے کے لیے نہ آیا تھا۔ میرے علاوہ کوئی اور بغیر جسم کا تماشا ہی حاضر تھا یا نہیں۔ ان دو فانی آنکھوں سے میں دیکھ نہ سکا۔ اس وقت اماوس اپنے پورے جو بن پر تھی۔ اس لیے کھیل شروع ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ یہ سوچ کر میں ریت کے ایک ٹیلے پر جا کر بیٹھ گیا۔ بندوق کھول کر اس کے گھوڑے کی اور ایک بار جانچ کر کے پھر اسے مناسب جگہ لگا کر میں نے اسے گود میں رکھ لیا اور مستعد ہو رہا۔ مگر وائے بد قسمتی، مصیبت کے وقت اس گھوڑے نے کچھ بھی ساتھ نہ دیا۔

پیاری کی بات یاد آگئی۔ اس نے کہا تھا۔ ”اگر تم بھوت کے سچ مچ ہی قائل نہیں ہو تو پھر وہاں کرنے ہی کیا جاتے ہو؟ اور اگر اعتقاد میں اتنا زور نہیں تو پھر بھوت پریت خواہ ہوں یا نہ ہوں تمہیں کسی طرح بھی جانے نہ دوں گی۔“ سچ تو یہ ہے آخر یہاں دیکھنے کیا آیا ہوں؟ محض دکھانے آیا ہوں کہ مجھ

میں کتنی جرأت اور استقلال ہے۔ صبح جن لوگوں نے کہا تھا..... ”بزدل بنگالی کام کے وقت بھاگ جاتے ہیں۔“ مجھے تو ان باتوں کا باثبوت یہی دکھانا ہے کہ بنگالی لوگ بڑے بہادر ہوتے ہیں۔“

میرا یہ مدتوں کا زبردست اعتقاد تھا کہ انسان کے مر جانے پر پھر اس کی کوئی ہستی نہیں رہتی۔ اور اگر رہتی بھی ہے تو شمشان میں اس کے خاکی جسم کو تکلیف اور آزار پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی۔ وہاں اسی جگہ لوٹ کر اپنی ہی کھوپڑی میں مار مار کر اسے لڑھکاتے پھرنے کی خواہش نہ تو قدرتی ہی ہے اور نہ مناسب ہی، کم از کم میں تو اپنے متعلق ایسا ہی خیال کرتا ہوں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ سب انسانوں کا مزاج ایک سا نہیں ہوتا۔ اگر کسی کی ہوتی ہو تو ایسی اعلیٰ رات، رات بھر بیدار رہ کر میرا اتنی دور تک آثار ایگاں نہیں جائے گا۔ اور آج اس بوڑھے نے اس کی بہت بڑی امید دلائی تھی۔

دفعۃً ہوا کا ایک جھونکا کتنا ہی ریت اڑاتا ہوا میرے جسم پر سے ہو کر نکل گیا۔ اور وہ ابھی ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ دوسرا اور پھر تیسرا بھی اوپر سے ہو کر نکل گیا۔ دل میں سوچنے لگا کہ بھلا یہ کیا ہے؟ اب تک تو ذرا سی بھی ہوائ تھی۔ اپنے آپ خواہ کتنا ہی کیوں نہ سمجھوں اور سمجھاؤں تاہم یہ اعتقاد کہ مرنے کے بعد بھی کچھ نامعلوم سارہ جاتا ہے۔ یہ اعتقاد ہمارے گوشت اور پوست میں ملا رہتا ہے۔ اور جب تک گوشت پوست ہے تب تک وہ بھی ہے۔ پھر خواہ میں اسے تسلیم کروں یا نہ کروں اس لیے ہوا کے اس جھونکے نے صرف ریت اور مٹی ہی نہیں اڑائی بلکہ میرے گوشت پوست میں سرایت کئے ہوئے اس اعتقاد کو بھی چوٹ پہنچائی۔ رفتہ رفتہ ہوا کچھ اور زور سے چلنے لگی۔ بہت سے لوگ شاید یہ نہیں جانتے کہ مردہ انسان کی کھوپڑی میں سے ہوا گزرنے سے بالکل گہری سانس چھوڑنے کی سی آواز پیدا ہوتی ہے۔ آن کی آن میں نزدیک و دور، آگے پیچھے چاروں طرف گہری سانوں کی ایک جھری سی لگ گئی۔ بالکل ایسا محسوس ہونے لگا گویا کتنے ہی آدمی مجھے گھیر کر بیٹھے ہیں اور لگا تار زور زور سے ہائے کر کے سانس لے رہے ہیں۔ اور انگریزی میں جسے ”اٹکنی فیلنگ“ (ان منا سا لگنا) کہتے ہیں۔ اسی قسم کے ایک اضطراب یا بے چینی سے تمام جسم لرز اٹھا۔ چگاڑ کا وہ بچہ اب بھی خاموش نہ ہوا تھا۔ بلکہ الٹا اور بھی زور زور سے روں روں کرنے لگا تھا۔ مجھے اب محسوس ہونے لگا کہ میں خوفزدہ ہو رہا ہوں۔ کافی واقفیت کے بل پر یہ خوب جانتا تھا کہ جس جگہ آیا ہوں وہاں پر موقعہ اگر خوف کو دبانے کا تو موت تک واقع ہو جانا ناممکن نہیں۔ درحقیقت اس قسم کی خوفناک جگہ میں اس سے پہلے کبھی تنہا نہ آیا تھا۔ بے خوف ہو کر جو شخص اکیلا آ سکتا تھا وہ اندر تھا۔ میں نہیں۔ کئی مرتبہ اس کے ساتھ کی خوفناک مقامات پر جانے سے میرا خیال ہو گیا تھا کہ خواہش ہونے پر میں خود بھی اس کی مانند ہر ایک جگہ اکیلا جاسکتا ہوں۔ لیکن یہ کتنی بڑی غلطی تھی۔ اور اس وقت میں صرف اسی خط میں اس کی تقلید کرنے چلا تھا۔ ایک ہی لمحہ میں آج سب بات

”چلو! کہہ کر میں آگے ہو لیا۔ راستہ چلتے چلتے رتن کہنے لگا۔ ”بابو جی، کمال ہے آپ کی جرات، ہم چار ہیں پھر بھی جس طرح ڈرتے ڈرتے یہاں آئے ہیں اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔“

”تم آئے ہی کیوں؟“

رتن بولا۔ ”روپوں کے لالچ سے، ہم سب کو ایک مہینے کی تنخواہ جو نقد ملی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ میرے قریب آیا اور دھیمی آواز سے بولا۔ ”آپ کے چلے جانے پر دیکھا۔ ماں بیٹھی بیٹھی رو رہی ہیں۔ مجھ سے بولیں۔ رتن، نہ معلوم کیا ہونے والا ہے بھیا، تم لوگ پیچھے پیچھے جاؤ۔ میں تم سب کو ایک ایک مہینے کی تنخواہ انعام دوں گی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”چھٹولا اور گنیش کو ساتھ لے کر جاسکتا ہوں ماں، لیکن راستہ تو میں نے دیکھا نہیں ہے۔“ اسی وقت چوکیدار نے ہانک دی۔ ماں بولیں۔

”اسے بلا لے رتن، وہ ضرور راستہ جانتا ہوگا۔“ باہر جا کر میں اسے بلا لایا۔ چوکیدار کو جب چھ روپے نقد مل گئے تو راستہ دکھاتا ہوا لے آیا۔ اچھا بابو جی، آپ نے چھوٹے بچے کا رونا سنا ہے؟“ یہ کہہ کر کانپتے ہوئے رتن نے میرے کوٹ کے پچھلے حصہ کو پکڑ لیا۔ کہنے لگا۔ ”ہمارے گنیش پاندے برہمن ہیں اسی لیے ہم لوگ آج بچ گئے ورنہ۔“

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ تردد کر کے کسی کے عقیدہ کو زک پہنچانے کی میری فطرت نہیں۔

سحر خور وہ کی طرح چپ چاپ چلنے لگا۔

کچھ دور چلنے کے بعد رتن نے پوچھا۔ ”آج کچھ دیکھا بابو جی؟“

میں بولا۔ ”نہیں۔“



صاف ہوا ٹھی تھی۔ میرا اتنا فراخ سینہ کہاں؟ میرے پاس رام نام کا وہ زرہ بکتر کہاں؟ میں اندر نہیں ہوں جو بھوتوں کے اس مسکن میں تنہا کھڑا ہوں اور ٹکٹی باندھ کر بھوت روحوں کا گیند کھیلنا دیکھوں۔ دل میں آیا کہ کوئی ایک آدھ زندہ بھیڑیاں یا شیر ہی نظر آ جائے تو شاید زندہ بچ جاؤں۔ یکا یک کسی نے میرے پیچھے کھڑے ہو کر میرے داہنے کان پر سانس ڈالی۔ وہ اتنی سرد تھی کہ برف کے ذرات کی طرح گویا اسی جگہ جم گئی۔ گردن اٹھائے بغیر ہی مجھے صاف صاف معلوم ہوا کہ وہ سانس جس ناک کے بڑے بڑے تنھوں سے ہو کر آئی ہے اس میں نہ گوشت ہے نہ پوست۔ ایک بوند خون بھی نہیں ہے۔ صرف ہڈی اور سوراخ ہی ہے۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں تاریکی محیط تھی۔ سناٹے کی آدھی رات سائیں سائیں کرنے لگی۔ آس پاس کی ہائے ہائے رفتہ رفتہ ہاتھوں کے قریب سے چھوتی ہوئی گزرنے لگی۔ کانوں پر بدستور ویسی ہی نہایت سرد سانسیں لگا تار آنے لگیں اور مجھے سب سے زیادہ بے بس کرنے لگیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا گویا بھوت اور پریت روحوں کے مسکن کی تمام سرد ہوا باہر آ کر میرے کانوں کو چھو رہی ہے۔

لیکن اس حالت میں بھی مجھے یہ بات بھول نہ سکی کہ کسی طرح بھی اپنے ہوش و حواس گم کر دینے سے کام نہ چلے گا۔ اگر ایسا ہوا تو موت لازمی ہے۔ میں نے دیکھا کہ میرا دایاں پاؤں تھر تھر کانپ رہا ہے۔ اس کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ رک نہیں۔ گویا وہ میرا پاؤں ہی نہ ہو۔

عین اسی وقت بہت دور سے بہت سے گلوں کی اجتماعی آواز کانوں میں پہنچی ”بابو جی! بابو صاحب!“ جسم کے رنگھٹے کھڑے ہو گئے۔ کون لوگ پکار رہے ہیں؟ دو بار آواز آئی، کہیں گولی مت چھوڑیے گا۔“ آواز آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ ترچھا دیکھنے سے روشنی کی مدد ہم کی کر نہیں نظر آئیں۔ ایک دفعہ ایسا معلوم ہوا کہ اس چلا ہٹ میں رتن کے لہجہ کا شک ہے۔ کچھ دیر اور ٹھہر کر صاف معلوم ہوا کہ ضرور وہی ہے۔ اور بھی آگے بڑھ کر میرے ایک درخت کے نیچے آڑ میں کھڑا ہو کر وہ چلایا۔ ”بابو جی، آپ جہاں بھی ہوں گولی مت چھوڑیے میں ہوں رتن۔“ رتن بچ بچ ذات کا جام ہے اس میں مجھے ذرا سا بھی شک نہ رہا۔

میں نے جوش میں چلا کر جواب دینا چاہا لیکن گلے سے آواز ہی نہ نکلی۔ روایت ہے کہ بھوت پریت جاتے جاتے وقت کچھ نہ کچھ تباہ کر جاتے ہیں۔ اس لیے جو میرے پیچھے تھا وہ میرے گلے کی آواز ہی تباہ کر کے رخصت ہوا تھا۔

رتن اور دیگر تین آدمی ہاتھ میں لیمپ اور لٹھ لئے ہوئے پاس آئے ان میں ایک تو تھا چھٹولا لال جو طبلہ بجایا کرتا تھا۔ دوسرا تھا پیاری کا دربان اور تیسرا گاؤں کا چوکیدار۔

رتن بولا۔ ”چلے تین بچتے ہیں۔“

ہیں۔“ اسے رہنے دو۔ غلطی بھلا کس سے نہیں ہوتی۔ لیکن پھر تو میں اپنی زندگی پر تنقید کر کے۔ یہ سب پڑھ کر ان لوگوں کی عداوت کے بوجھ سے اپنا سر اور نہیں اٹھا سکتا۔ دل ہی دل میں کہتا ہوں۔ ”اوائے بدبختی، کہا جاتا ہے۔ کہ انسان کے اندر کی شے لامحدود ہے مگر یہ کیا محض کہنے کے لیے ہی ہے۔ وقت آنے پر اس کا پردہ فاش ہو جاتا ہے اور کوئی پھوٹی کوڑی بھی اس کی قیمت نہیں دیتا۔ آپ کا ہزار جسم کے نامعلوم کتنے لاکھ عجیب و غریب کارنامے اس لامحدود میں محو پڑے ہوتے ہیں۔ اور یکا یک بیدار ہو کر آپ کی علیت، آپ کی تعلیم و تحصیل، آپ کی قابلیت آپ کی مردم شناسی کے غرور کو چشم زدن میں چور کر کے رکھ دیتے ہیں۔ یہ بات کیا ایک دفعہ بھی آپ کے دل میں نہیں آئی..... ”یہ بھی کیا آپ سمجھ نہیں سکتے کہ یہی تو اس لامحدود روح کی نشست گاہ ہے؟“

یہی تو میں ان دا جیتی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان کی پاکیزہ اور پر جلال صورت اس وقت تک بھی نہیں بھول سکی۔ جب سے جیجی چلی گئی ہیں نامعلوم کتنی خاموش اور سنجیدہ راتوں میں آنکھوں کے پانی سے میرا کئی تر ہو گیا۔ اور دل ہی دل میں کتنی مرتبہ کہا ہے کہ جیجی مجھے اپنے آپ کے لیے کوئی تشویش نہیں ہے۔ تمہارے پارے سے چھو کر میرے اندر باہر کا تمام لوہا سونا بن چکا ہے۔ اور کسی بھی آب و ہوا سے رنگ لگنے کا اندیشہ نہیں رہا۔ لیکن کہاں گئیں تم جیجی؟ جیجی اپنی اس خوش قسمتی میں میں اور کسی کو بھی حصہ دار نہیں بنا سکا۔ اور تمہیں بھی کوئی نہیں دیکھ سکا اور نہ تمہارا درشن کر کے ہر انسان نیکی اور پاکیزگی کا پیکر بن جاتا ہے۔ اس بات کو لے کر میں اس وقت بچوں کے سے تصورات میں تمام رات جاگ کر گزار دیتا تھا۔ اور گاہے گاہے سوچتا کہ دیوی چودھرائی کی طرح اگر کہیں سے سات گھڑے اشرفیاں پا جاؤں تو ان دا جیتی کو ایک عظیم الشان تخت پر بٹھا دوں۔ جنگل کاٹ کر، جگہ صاف کر کے گاؤں کے لوگوں کو بلاؤں اور انہیں اس تخت کے چاروں طرف بسا دوں۔ کبھی سوچتا ایک بڑے بھاری۔ بجرے میں انہیں سوار کر کے بینڈ بجاتا ہوا انہیں دلش بدیش کے لیے پھروں۔ اس قسم کے نامعلوم کتنے فردوسی پھولوں کی مالائیں گونجتھارتھ۔ اس وقت اس کا تصور کر کے بھی مجھے ہنسی آ جاتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ آنکھوں سے آنسو بھی کچھ کم نہیں گرتے۔

اس وقت میرے دل میں یہ یقین ہمالہ کی طرح مضبوط ہو چکا تھا کہ اس لامحدود کائنات میں اور کوئی ایسی عورت نہیں جو مجھے فریفتہ کر سکے،..... لیکن کسی دوسری دنیا میں بھی ہے یا نہیں یہ میرے تصور سے بعید تر تھا۔ سوچتا تھا کہ زندگی میں جب کبھی کسی زبان میں ایسی ملائم اور شیریں گفتار، ہونٹوں میں ایسی دلا دیر مسکراہٹ، پیشانی پر ایسا بے مثل نور، آنکھوں میں ایسی دردمند نگاہ نظر آئے گی۔ صرف اسی وقت اس کی طرف دیکھوں گا۔ اور اپنا دل جس پر تار کروں گا وہ بھی کوئی ایسی ہی نیک خصال اور فرشتہ

میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ آنکھوں کے سامنے صاف نظر آنے لگا کہ پیاری ایک دیئے کے سامنے بے تاب اور تر آنکھوں سے بیٹھی بیٹھی انتظار کر رہی ہے اور میرا دل بے اختیار جذبہ سے دھڑکتا ہوا دوڑا جا رہا ہے۔

رتن نے مودبانہ عرض کیا..... ”آئیے“
چشم زدن کے لیے آنکھیں بند کر کے اور دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر دیکھا وہاں ہوش و حواس کا نام و نشان تک نہ تھا۔ سب کے سب شراب کے نشے میں چور ہو رہے تھے۔ رام رام، متوالوں کے اس گروہ کو لے کر ان سے ملنے جاؤں یہ مجھ سے نہ ہوگا۔
دیر ہوتے دیکھ کر رتن حیرت سے بولا..... ”اس جگہ اندھیرے میں کیوں کھڑے ہو بابو جی..... آئیے نا؟“

میں جھٹ پٹ بول اٹھا۔ ”نہیں رتن، اس وقت نہیں..... میں چلتا ہوں۔“
رتن بھند ہو کر بولا..... ”لیکن ماں، راہ دیکھتی بیٹھی ہیں.....“

”میں ایسا ہوں، میں ویسا ہوں۔ یہ کام مجھ سے ہرگز نہ ہوتا۔ وہ کام میں مرنے پر بھی نہ کرتا۔ وغیرہ وغیرہ“ تو یہ باتیں سن کر مجھے شرم آئے بغیر نہیں رہتی اور طرہ یہ کہ محض اپنے دل کے متعلق ہی نہیں بلکہ دوسروں کے متعلق بھی اکثر دیکھا جاتا ہے کہ انسان کے غرور کی انتہا نہیں۔ ایک مرتبہ نقادوں کے مضا میں پڑھ کر دیکھے خواہ مخواہ ہنسی آ جائے گی۔ شاعر کو نظر انداز کر کے وہ خیالی کردار کو انتخاب کر لیتے ہیں۔ اور زور سے کہتے ہیں۔ ”یہ کردار کسی طرح بھی ویسا نہیں ہو سکتا..... وہ کردار کبھی ویسا نہیں کر سکتا“ اسی جسم کی اور بھی کتنی باتیں ہیں۔ لوگ واہ واہ کر اٹھتے ہیں۔ ”واہ اسی کا نام تو تنقید..... ہے۔ اسی کو تو کہتے ہیں کرداروں پر تبصرہ۔ سچ ہی تو کہا ہے فلاں نقاد کی موجودگی میں من مانا لکھ دینے سے کام نہیں چل سکتا۔ دیکھو کتاب میں جواوٹ پٹا ننگ غلطیاں اور غلط فہمیاں تھیں۔ وہ سب کس طرح چھان بین کر رکھ دی گئی

صفت ہوگی۔ اس کے بھی ہر قدم پر گویا ایسی ہی ایک دنیا آباد ہو جائے گی۔ اسی طرح وہ بھی گویا دنیا کا تمام رنج و راحت، نیکی بدی تمام اچھا برا ترک کر کے مجھے حاصل کر سکے گی۔

میں آج بھی گود ہی ہوں۔ تو بھی آج صبح نیند کھلتے ہی کسی کی گفتار، کسی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ، کسی کی آنکھوں کی چلن نے یاد آتے ہی دل کی خلوتوں میں ایک درد پیدا کر دیا ہے۔ میری سنیاں جیبتی کے ساتھ اس کی کسی پہلو میں ذرا سی بھی مشابہت نہ تھی۔

میں خوب سمجھتا ہوں کہ جو لوگ سنگدل نفاذ ہیں وہ میری اس رام کہانی کے اس باب پر بیچ و تاب کھا کر کہہ اٹھیں گے کہ ”اتنا بڑا ہمارا، اتنا مبالغہ کر کے آخر با تو تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ اچھی طرح واضح کر کے تم بے تاب ہوا اٹھے تھے۔ یہی نا؟ جس کو دل کے دروازے پر سے ہی جھاڑ مار کر رخصت کر دیتے تھے۔ آج اسے ہی بلا کر گھر میں بسانا چاہتے ہو۔ تم اپنی ان دانجیبتی کا نام مت لو، کیونکہ تم خواہ کتنی ہی باتیں، خواہ کتنی ہی طرح بنا سنوار کر کیوں نہ کہو ہم لوگ انسانی فطرت کو خوب سمجھتے ہیں۔ ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ کسی نیک خصال اور فرشتہ صفت سادھوی عورت کا خیال تمہارے دل میں قائم ہی نہیں ہوا تھا۔ اسے اپنے دل کی تمام تر طاقتوں سے تم کبھی حاصل ہی نہیں کر سکے۔ اگر کیا ہوتا تو تم اس باطل اور فریب میں جھلا نہ ہو سکتے۔“

میری طبیعت صرف اتنی ہی ہے کہ جو میری کمزوری اندر ہی اندر پوشیدہ تھی اس کی میں نے خبر نہ لی۔ آج جب وہ موقعہ پا کر سر اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ اور جب اس نے اپنی دیگر ہم جنس کمزوریوں کو دعوت دے کر یکبارگی اپنے ساتھ ملا لیا۔ تو ناقابل عبور حیرت سے میری آنکھوں میں سے آنسو گر پڑے لیکن ”جا“ کر اسے رخصت کر دینے کا بھی مجھے حوصلہ نہ ہوسکا۔ یہ بھی جانتا ہوں، کہ آج ندامت کے مارے اپنا منہ چھپانے کے لیے میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے مگر دل کا کونا کونا آج کیف سے معمور ہوا تھا ہے۔ جو نقصان ہونا ہوگا ہوتا ہی رہے گا۔ دل تو اس کا ترک کرنا نہیں چاہتا۔

”بابو صاحب!“ راجا کا خادم آپہنچا۔ میں کھاٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے مودبانہ عرض کیا۔ ”کمار صاحب اور دیگر بہت سے لوگ آپ کی گزشتہ رات کی سرگزشت سننے کے لیے آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”انہیں کس طرح معلوم ہوا؟“

سوالات کا جوش کم ہوتے ہی میں نے جواب دینا شروع کیا۔ کمار جی بولے۔ ”آفرین

ہے آپ کی جرأت اور استقلال پر، شری کانت، کتنی رات گئے وہاں پہنچے تھے؟“

”بارہ اور ایک کے درمیان۔“

بوڑھے صاحب بولے۔ ”خطرناک اماوس، گیارہ بجے کے بعد اماوس شروع ہوئی تھی۔“ چاروں طرف حیرت کا شور قدرے اٹھ کر قدرے سکون ہونے پر کمار جی نے پھر دریافت کیا۔ ”اس کے بعد کیا دیکھا؟“

میں بولا۔ ”دور تک پھیلے ہوئے ہڈیوں کے پنجر اور کھوپڑیاں۔“ کمار جی بولے۔ ”اف کتنا حوصلہ ہے۔ شمشان کے اندر گئے تھے یا باہر کھڑے رہے تھے؟“

میں بولا۔ ”اندر جا کر ریت کے ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا تھا۔“ میں ہنس پڑا اور بولا۔ ”دو ایک بڑے بڑے چمکاڈر کے اوپر اڑ کر جاتے ہوئے دیکھے تھے۔“

اس وقت بوڑھے صاحب نے خود آگے بڑھ کر دریافت کیا۔ ”اور کچھ نہیں دیکھا؟“ میں نے کہا۔ ”نہیں۔“

جواب سن کر خیمے بھر کے لوگ گویا مایوس ہو گئے۔ اور بوڑھے صاحب تو غصے سے مشتعل ہو اٹھے۔ ”ایسا کبھی ممکن نہیں۔ آپ گئے ہی نہیں“ ان کے غصے کو دیکھ کر میں صرف ہنس دیا۔ کیونکہ بات ہی غصہ ہونے کی تھی۔ کمار جی میرا ہاتھ دبا کر منت آمیز لہجہ میں بولے۔ ”تمہیں قسم ہے شری کانت، کیا دیکھا کچ بچ کہہ دو۔“

بچ ہی کہتا ہوں کچھ نہیں دیکھا“

”وہاں کتنی دیر ٹھہرے؟“

”تین ایک گھنٹہ۔“

”اچھا اگر دیکھا نہیں تو کیا کچھ سنا بھی نہیں؟“

”نا“

چشم زدن میں ہی سب کے چہرے جوش سے کھل اٹھے۔ کیا سنا اسے سننے کے لیے کچھ لوگ اور بھی آگے سرک آئے تو میں نے کہنا شروع کیا کہ کس طرح راہ کے اوپر رات کا ایک پرندہ باپ کہہ کر اڑ گیا۔ کس طرح بچے کی سی آواز میں کسی پرندے کے بچے نے سمیر کے درخت پر روں روں کر کے رونا شروع کر دیا کس طرح یکا یک آندھی اٹھی۔ اور مردہ انسانوں کی کھوپڑیاں لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگیں اور سب سے آخر کس طرح گویا کرنی میرے پیچھے کھڑا ہو کر لگا تار برف کی مانند ٹھنڈی سانس دہانے کان میں چھوڑنے لگا۔ میرا بیان ختم ہو گیا۔ مگر کافی دیر تک کسی کی زبان سے ایک حرف بھی نہ نکلا۔ مکمل سناٹا

تھا۔ انجام کار وہ بوڑھے صاحب ایک آہ بھر کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ بول اٹھے۔
 ”بابو جی آپ سچ سچ ہی برہمن کے بیٹے ہیں۔ اسی لیے کل اپنی جان سلامت لے کر واپس لوٹ آئے،
 ورنہ اگر اور کوئی ہوتا تو زندہ نہ آتا۔ لیکن آج سے اس بوڑھے کی قسم ہے بابو جی! پھر کبھی ایسا غلطی نہ
 کیجئے گا۔ آپ کے ماں باپ کے چرنوں میں میرے ہزار پر نام محض ان کی نیک اعمالی سے آپ سچ
 گئے۔“ یہ کہہ کر اس نے جھونک میں آ کر فوراً میرے پاؤں چھو لئے۔

پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ یہ شخص بات کہنا خوب جانتا تھا۔ اس مرتبہ اس نے کہنا شروع
 کیا۔ آنکھوں کی پتلیاں اور بھنوں کبھی سکڑ اور کبھی پھیلا کر کبھی بچھا کر اور کبھی روشن کر کے اس نے
 پرندے کے رونے سے شروع کر کے کان پر ٹھنڈی سانس چھوڑنے تک اس خوبی سے تشریح کی کہ دن
 دہاڑے اتنے لوگوں کی موجودگی میں میرے سر کے بال کانٹوں کی مانند کھڑے ہو گئے۔ کل صبح کی طرح
 پیاری آج بھی کب چپ چاپ سرک کر قریب آ بیٹھی تھی۔ اس پر میری توجہ ہی نہ گئی۔ یکا یک آہ بھرنے
 کی آواز سے چونک کر جونہی میں نے اپنی گردن گھمائی تو دیکھا میری بیٹھ کے عین پیچھے بیٹھی ہوئی وہ ٹٹنکی
 لگائے بولنے والے کے منہ کی طرف دیکھ رہی ہے اور اس کے دونوں چکنے اور سرخ رخساروں پر بکھرے
 ہوئے آنسوؤں کی دو لکیریں خشک ہو کر پھوٹ اٹھی ہیں کب اور کس لیے اس کی آنکھوں کا وہ پانی بہہ نکلا
 تھا شاید وہ بالکل ہی نہ جان سکی ورنہ اسے ضرور پوچھ ڈالتی۔ مگر آنسوؤں سے تر اس چہرے پر ایک نگاہ
 پڑتے ہی آن واحد میں میرے دل میں ایک آگ مشتعل ہو اٹھی۔ بات ختم ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی
 اور کمار کو سلام کر کے اور ان کی اجازت پا کر آہستہ آہستہ باہر ہو گئی۔

آج صبح ہی میرے رخصت ہونے کی بات تھی۔ لیکن جسم تندرست نہ تھا۔ اس لیے کمار کا
 اصرار قبول کر کے میں اس وقت جانے کا پروگرام ہلتوی کر کے اپنے خیمے میں واپس لوٹ آیا۔ اتنے دنوں
 بعد آج پیاری کے رویہ میں نے پہلے پہل دوسرا ہی جذبہ دیکھا۔ اتنے دنوں تک اس نے مذاق کیا
 تھا۔ طعنہ زنی کی تھی۔ اور اس کی آنکھوں سے شوخی و شرارت کے علاوہ جھگڑا کرنے کا ارادہ بھی ظاہر ہوتا
 رہا تھا۔ یہ سب میں نے محسوس کیا لیکن اس قسم کی ہمدردی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ شاید آپ کی حیرت ہو
 گی کہ میں افسردہ ہونے کی بجائے التامسردہ ہوا تھا۔ کیوں؟ جانتا ہوں۔ اگرچہ نوخیز اور حسین عورتوں
 کے دلی جذبات کو لے کر دماغ سوزی کرنا میرا پیشہ نہیں اور نہ اس سے پیشتر میں نے کبھی یہ کام کیا ہی ہے
 لیکن میرے دل میں کئی جنموں کا جو سلسلہ پوشیدہ طور پر قائم ہے اس کی بنا پر انسانی دل کے راز ہائے نہاں
 سے متاثر ہوا تھا۔ میرا دل اس کو اپنی توہیں سمجھنے کی غلطی نہ کر سکا بلکہ فخر محسوس کر کے محفوظ ہوا۔ شاید اسی
 پوشیدہ سلسلہ کی کسی اندرونی مرکز سمجھ کر میں نے اپنے شمشان کے سفر کی یہاں تک کی کہانی میں اس بات

کا ذکر تک نہیں کیا کہ پیاری نے کل رات مجھے شمشان سے لوٹا لانے کے لیے آدمی بھیجے تھے۔ اور وہ خود
 بھی بات ختم ہوتے ہی چپ چاپ اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔ اس لیے ہے یہ فخر۔ کل رات لوٹ کر اس سے
 ملاقات کر کے میں نے یہ نہیں کہا کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ اسے جس بات کو اکیلے بیٹھ کر سننے کا سب سے پہلے
 حق تھا۔ اسی کو آج سب سے پیچھے بیٹھ کر ہی اس نے سنا۔ لیکن یہ فخر بھی کچھ عجیب لطف بیز ہوتا ہے۔
 زندگی میں اس لطف سے پہلی مرتبہ محظوظ ہو کر میں بچے کی طرح غلوت میں بیٹھ گیا اور چلے چلے کر اس کا
 لطف لینے لگا۔

☆☆☆

آج دو پہر کو میں سو جانا چاہتا تھا۔ بستر پر لیٹے لیٹے پلکیں بھاری ہو جاتیں لیکن رتن کے آ
 جانے کی امید ہر بار شانے جھنجھوڑ کر جگا دیتی۔ اسی طرح وقت تو گزر گیا لیکن رتن نہ آیا۔ وہ ضرور آئے گا
 یہ یقین میرے دل میں اتنا مضبوط ہو چکا تھا کہ جب بستر چھوڑ کر باہر آ کر میں نے دیکھا کہ آفتاب
 مغرب کی طرف ڈھل چکا ہے تو مجھے دل ہی دل میں یہ یقین ہو گیا کہ جب میں سو رہا تھا تو رتن میرے
 ہاں آیا تھا اور مجھے محو خواب دیکھ کر واپس لوٹ گیا۔ بدتمیز جاہل! ایک مرتبہ پکار کر تو دیکھ لیا تھا۔ دو پہر کے
 اس تخیل کا وقت فضول ہی چلا گیا۔ یہ سوچ کر میں غصے ہوا تھا۔ لیکن شام کے بعد وہ دوبارہ آئے گا۔ اور مجھ
 سے ہلکا سا اصرار..... یا لکھا ہوا پرزہ، جو کچھ بھی ہو چپ چاپ دے جائے گا۔ اس میں مجھے ذرا بھی شک
 نہ تھا۔ لیکن وہ وقت کس طرح کئے۔ انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی ہیں۔ سامنے دیکھتے ہوئے کچھ دور بہت
 سا پانی میری آنکھوں کے سامنے جھلک اٹھا۔ وہ کسی وسیع میدان کا عظیم فخر تھا۔ وہ تالاب تقریباً نصف
 کوس وسیع ہوگا۔ غرب کی طرف وہ ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ اور گھنے جنگل سے ڈھک گیا تھا۔ گاؤں سے دور
 ہونے کی وجہ سے عورتیں اس کا پانی استعمال نہیں کر سکتی تھیں۔ باتوں ہی باتوں میں سنا تھا کہ یہ تالاب کتنا
 قدیم ہے اور کس نے بنایا ہے اس کا کسی کو بھی علم نہیں۔ ایک پرانا ٹوٹا گھاٹ تھا۔ اسی پر تنہائی میں جا کر بیٹھ
 گیا۔ کسی زمانہ میں اس کے چاروں طرف ایک بارونق گاؤں آباد تھا۔ جو نامعلوم کب ہیضہ اور پلگ سے
 اجاڑ ہو کر پھر اپنی موجود جگہ میں سرک آیا ہے۔ بے آباد مکانوں کے بہت سے نشان چاروں طرف
 موجود تھے۔ غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی ترچھی کرنیں آہستہ آہستہ جھک کر تالاب کے سیاہ پانی میں
 سونے کی آمیزش کر رہی تھیں۔ میں ایک تک دیکھتا رہا۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ آفتاب غروب ہو گیا۔ تالاب کا سیاہ پانی اور بھی سیاہ ہو گیا۔ قریبی جنگل
 میں سے دو ایک پیاسے گیدڑ باہر نکل کر ڈرتے ڈرتے پانی پی کر چلے گئے۔ میرے اٹھنے کا وقت ہو گیا
 ہے۔ اور جس وقت ککائے کے لیے میں وہاں گیا تھا وہ کٹ چکا ہے۔ یہ محسوس کرنے کے باوجود بھی میں

وہاں سے اٹھ نہ سکا۔۔۔ گویا اس ٹوٹے گھاٹ نے مجھے زبردستی جکڑ لیا۔

دفعۂ خیال آیا کہ جہاں میں پاؤں رکھ کر بیٹھا ہوا ہوں وہاں پاؤں رکھ کر نامعلوم کتنے آدمی آئے ہیں گئے ہیں۔ اسی گھاٹ پر وہ غسل کرتے تھے۔ کپڑے چھانٹتے اور پانی بھرتے تھے۔ اس وقت وہ کہاں کس تالاب سے اپنے یہ تمام روزانہ کام پورے کرتے ہوں گے؟ یہ گاؤں جب زندہ تھا تو یقیناً اس میں بسنے والے لوگ اس وقت یہاں آ کر بیٹھتے ہوں گے۔ کتنے ہی گیت گایا کرتے اور ہنسی خوشی کی کتنی ہی باتیں کر کے اپنے دن بھر کی تھکان کو دور کرتے تھے۔ اس کے بعد اچانک ایک دن تباہی پلگ کی شکل اختیار کر کے تمام گاؤں کو نوچ کر لے گئی۔ اس وقت نامعلوم کتنے قریب المرگ انسان پیاس سے بے حال ہو کر یہاں دوڑے آئے ہوں گے۔ اور اسی گھاٹ پر آخری سانس لے کر چلے گئے ہوں گے۔ شاید ان کی پیاسی روح آج بھی یہاں چکر کاٹی پھرتی ہوگی۔ یہ بھی کون و ثوق سے کہہ سکتا ہے کہ جو آنکھوں سے نظر نہیں آتا وہ ہے ہی نہیں؟ آج بھی صبح اس بوڑھے نے کہا تھا۔۔۔ ”با بوجی، دل میں یہ کبھی مت سوچنا کہ موت کے بعد کچھ بچایا نہیں رہتا۔۔۔ بے سہارا پریت رو میں ہماری ہی طرح رن و راحت، بھوک پیاس محسوس کرتی ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ویر کرماجیت کی کہانی اور نہ جانے کتنے ہی جادوگر، سادھو، ہنسیا سیوں کی کہانیاں تفصیل سے کہہ سنائی تھیں۔ اور کہا تھا یہ خیال بھی مت کرنا کہ وقت اور موقع ملنے پر وہ نظر نہیں آتیں یا بات نہیں کر سکتیں یا نہیں کرتی ہیں۔ تمہیں اس جگہ پھر کبھی جانے کے لیے میں نہ کہتا۔ لیکن جو لوگ یہ کام کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو کبھی تکلیف نہیں ہوتی اس بات پر کبھی یقین نہ کرنا۔“

اس وقت صبح کی روشنی میں جن کہانیوں نے محض دفع الوقتی اور ہنسی مذاق کا سامان مہیا کیا تھا۔ اس وقت وہی کہانیاں اس گہری تاریکی میں کچھ اور ہی قسم کی شکلیں اختیار کر کے نظر آئیں۔ دل میں آیا کہ دنیا میں اگر کوئی ظاہری حقیقت ہے تو وہ صرف موت ہی ہے۔ بھلی بری، سکھ دکھ کی یہ حالتیں گویا آتش بازی ہیں۔ جو طرح طرح کے ساز سرانجام کی طرح محض کسی ایک خاص دن جل کر راکھ ہو جانے کے لیے ہی اتنی کوشش اور صفائی کے ساتھ بن کر تیار ہوتی ہیں۔ مابعد موت کا حال اگر کسی طرح سن لیا جاسکے تو اس سے بڑی ایجاد اور کیا ہو سکتی ہے۔ پھر اسے کوئی بھی کہے اور کوئی بھی سنے۔

اچانک کسی کے پاؤں کی آہٹ سے خیالات کا تار ٹوٹ گیا۔ مڑ کر دیکھا ہر سوتا رکھی محیط ہے اور کوئی نہیں۔ میں جسم جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ گزشتہ رات کو بات یاد کر کے دل ہی دل میں بولا۔۔۔ ”نہیں اب یہاں اور نہیں بیٹھ سکتا۔ کل دائیں کان پر ٹھنڈی سانس چھوڑ کر گیا تھا آج آ کر بائیں کان پر سانس پھینکنا شروع کر دے تو کچھ ناممکن نہیں۔“

بیٹھے بیٹھے کتنی دیر ہو گئی تھی اور اب کتنی رات ہے اس بات کا میں اچھی طرح فیصلہ ہی نہ کر سکا۔

معلوم ہوا کہ تقریباً یہ آدھی رات کا عمل ہوگا۔ لیکن ارے یہ کیا؟ چلا جا رہا ہوں تو چلا ہی جا رہا ہوں۔ اس تنگ سی پگ ڈنڈی کا کہیں اختتام ہی نہیں ہوتا۔ اتنے بے شمار خیموں میں سے ایک دیئے کی روشنی بھی نظر نہیں آتی۔ بہت دیر سے سامنے کانٹوں کا ایک درخت نظر رو کے کھڑا تھا۔ دفعۂ خیال آیا کہ اسے تو جاتی بار دیکھا نہیں تھا۔ راستہ بھول کر کسی اور طرف تو نہیں چل دیا۔ کچھ اور چلنے پر معلوم ہوا کہ وہ کانٹوں کا درخت نہیں ہے بلکہ اٹلی کے کچھ درخت ایک دوسرے سے ملے ہوئے اطراف کو ڈھانپ کر قطار باندھے کھڑے ہیں اور ان ہی کے نیچے سے راستہ گھوم کر غائب ہو گیا تھا۔ یہ مقام اس قدر تاریک تھا کہ اپنا ہاتھ بھی خود اپنے آپ کو دکھائی نہ دیتا تھا۔ چھاتی دھڑکنے لگی۔ ارے میں کہا جا رہا ہوں؟ آنکھیں اور کان بند کر کے بعد مشکل املی کے ان درختوں کے پار جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے تیرہ تار آسمان، جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے پھیلا ہوا ہے۔ مگر سامنے وہ اونچی سی جگہ کیا ہے۔ ندی کے کنارے کا سرکاری باندھ تو نہیں۔ دونوں پاؤں ٹوٹنے سے لگے پھر بھی انہیں کسی طرح گھسیٹ کر میں اس کے اوپر چڑھ گیا جو سوچا تھا ٹھیک وہی ہوا۔ اس کے عین نیچے ہی وہ مہاشمشان تھا۔ پھر کسی کے قدموں کی چاپ سامنے سے ہو کر نیچے شمشان میں جا کر ناپید ہو گئی۔ اس مرتبہ میں لڑکھڑاتا ہوا چلا۔ اور اسی ریت اور مٹی پر بے ہوش کی طرح دھم سے بیٹھ گیا۔ اب مجھے ذرا سا بھی شک نہ رہا۔ کہ کوئی مجھے ایک مہاشمشان سے لے کر دوسرے مہاشمشان تک میری راہنمائی کر کے پہنچا گیا ہے۔ جس کے قدموں کی چاپ سن کر اس پھوٹے گھاٹ پر جسم جھاڑ کر میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے پاؤں کی آواز اتنی دیر بعد اس جگہ سامنے کی طرف فضا میں مل گئی۔



ہر ایک وجہ معلوم کرنے کی ضد انسان کو جس حالت میں ہوتی ہے۔ میں اس حالت سے گزر چکا ہوں۔ اس ہولناک تاریکی سے معمور آدھی رات کے وقت میں اکیلا، راستہ جاننے کے باوجود تالاب کے اس ٹوٹے گھاٹ سے اس مہاشمشان کے پاس کس طرح پہنچ گیا اور کس کے پاؤں کی وہ آواز اس جگہ سے بلاتی ہوئی اور اشارہ کرتی ہوئی کچھ ہی دیر میں غائب ہو گئی۔ ان سب گتھیوں کو سلجھانے کے قابل میری عقل بھی نہیں یہ راز آج بھی میرے لیے اسی طرح معمہ ہے۔ لیکن اس لیے بھوت پریت کا قائل ہونا بھی صحیح معنوں میں قائل ہونا نہیں ہے۔ کیونکہ میرا چشم دید واقعہ ہے..... ہمارے گاؤں میں ایک پاگل تھا۔ وہ دن کے وقت گھر گھر گھوم کر، بھیک مانگ کر راستے کے باغیچے کی جھاڑیوں کے سایہ میں گھومتا پھرتا تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر بے شمار آدمیوں کی کھکھی بندھ گئی۔ اس میں اس کا کوئی ذاتی مفاد نہ تھا۔ تاہم یہ اس کا اندھیری رات کا معمول تھا۔ انسان کو خوف زدہ کرنے کیلئے وہ اور بھی کئی قسم کے عجیب و غریب طریقے اختیار کیا کرتا تھا۔ خشک لکڑیوں کے گٹھے کو کسی درخت کی شاخ سے باندھ کر اس میں آگ لگا دیتا تھا۔ منہ پر کالی سیاہی کالیپ کر کے وشالکشی دیوی کے مندر میں کافی تکلیف برداشت کرتے ہوئے کھڑا رہتا اور اٹھا بیٹھا کرتا۔ گہری رات کے وقت گھر کے پچھواڑے بیٹھ کر ناک کے سر میں کسانوں کے نام لے لے کر پکارا کرتا..... لیکن پھر بھی کوئی اسے کسی دن نہ پکڑ سکا۔ دن کے وقت اس کا چال چلن اس کا مزاج اور رویہ وغیرہ دیکھ کر کسی کو بھی اس پر شک نہ ہوتا۔ اور یہ صرف ہمارے ہی گاؤں میں نہیں، گرد و نواح کے آٹھ دس گاؤں میں اسی طرح کرتا پھرتا تھا۔ مرتے وقت وہ اپنی بد ذاتی خودی تسلیم کر گیا۔ اور اس کے مرنے کے بعد بھوت کی وہ کارستانیوں بھی خود بخود ختم ہو گئیں۔ اس میدان میں بھی شاید ویسا ہی کچھ تھا۔ شاید نہ بھی ہو لیکن جانے دو اس بات کو۔

ہاں کہہ رہا تھا کہ مٹی اور ریت سے بھرے ہوئے باندھ کے اوپر جب میں حواس باختہ سا ہو کر بیٹھ گیا تھا تو پاؤں کی صرف دو ہلکی ہلکی آوازیں اندر جا کر آہستہ آہستہ غائب ہو گئیں۔ خیال آیا کہ اس

نے صاف طور پر ظاہر کر دیا ہے۔ ”رام رام، تو نے یہ کیا کیا؟ تجھے اتنی دور تک راستہ بتا کر لے آیا تو کیا وہاں بیٹھ جانے کے لیے؟ آ۔ ایک مرتبہ ہم لوگوں کے اندر چلا آ۔ اس طرح ناپاک اچھوتوں کی طرح صحن کی تنہائی میں نہ بیٹھ۔ ہم سب کے درمیان بیٹھ۔“ یہ بات میں نے کانوں سے سنی تھی یاد دل میں محسوس کی تھی۔ یہ تو اب یاد نہیں کر سکتا۔ لیکن اس وقت بھی مجھے جو ہوش باقی تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہوش کو زبردستی پکڑ رکھنے سے وہ اسی طرح بچا رہتا ہے۔ بالکل ہی جانتا نہیں رہتا۔ یہ میرا تجربہ ہے اس لیے اگر چہ میری آنکھیں کھلی رہیں، لیکن وہ گویا عالم رویا کا سا دیکھنا تھا وہ نہ تو خواب کا عالم تھا نہ بیداری کا۔ اس میں خواب کا سکون بھی نہیں رہتا اور بیداری کا شور و غل بھی نہیں ہوتا۔

تاہم اس بات کو نہ بھولا کہ رات بہت زیادہ ہو چکی ہے۔ اور مجھے واپس اپنے خیمہ میں لوٹنا ہے۔ اس کے لیے کم از کم ایک مرتبہ کوشش تو کرنی چاہئے۔ پھر خیال آیا یہ سب فضول ہے۔ میں یہاں اپنی حسب مرضی تو آیا نہیں ہوں۔ آنے کا تصور تک بھی نہیں کیا۔ اس لیے جو مجھے اس پر خطر راستہ میں میری راہنمائی کرتا ہوا لے آیا اس کا کچھ خاص مقصد ہے۔ وہ مجھے یونہی لوٹ کر جانے نہ دے گا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ اپنی مرضی سے ان کے ہاتھ سے چھکارا نہیں ملتا خواہ کتنا ہی زور کرو۔ خواہ کسی راستے سے نکلنے کی کوشش لیکن سب راستے گورکھ دھندے کی طرح گھما پھرا کر وہ اپنی پرانی جگہ ہی لا کر حاضر کر دیتے ہیں۔

اس لیے بے قرار ہو کر پھنپھنا کر مکمل طور پر غیر ضروری سمجھ کر اور بلا حیل و حرکت خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ تو جس پر میری اچانک نظر پڑی وہ مجھے کسی دن بھی نہیں بھولی!

رات کو بھی علیحدہ ہستی ہوا کرتی ہے۔ اور اس کو کرہ ارض، اس کی سردی گرمی، پہاڑ پر بہت وغیرہ جس قدر بھی نظر آنے والی اشیاء ہیں ان سب سے الگ کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ بات پہلی مرتبہ میری سمجھ میں آئی۔ میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ لامحدود نیلگوں آسمان کے نیچے تمام زمیں پر اپنا اقتدار جمائے سنجیدہ رات آنکھ موند کر کسی کے تصور میں محو ہے۔ اور تمام متحرک دنیا منہ بند کئے سانس روکے نہایت احتیاط سے خاموش ہو کر اس مکمل سکون کی حفاظت کر رہی ہے یا ایک آنکھوں کے سامنے حسن کی ایک لہر دوڑ گئی۔ دل میں خیال آیا کہ کس بے وقوف نے اس خیال کی اشاعت کی ہے کہ محض روشنی کی ہی شکل ہوا کرتی ہے تاریکی کی نہیں۔ عجیب حیرت ہے کہ اتنے بڑے غلط خیال کو دنیا نے چپ چاپ کس طرح تسلیم کر لیا۔ یہ تو عرش سے لے کر فرش تک کی ہر شے کو معمور کر کے نظر کے اندر باہر سے تاریکی کا طوفان بڑھا آ رہا ہے۔ واہ واہ حسن و جمال کا یہ سرچشمہ تو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کائنات میں جو جتنا سنجیدہ، جتنا بے ہوش اور جتنا ہی وسیع اور لامحدود ہے وہ اسی قدر زیادہ تاریک ہے۔ بحرنا پیدا کنار سیاہی

گردہ خواہ کتنا ہی عقلمند اور دلاور کیوں نہ ہو۔ اس تاریک رات میں اس قسم کی جگہ میں مجھے تنہا بھوت کی طرح کھڑا دیکھ کر خواہ اور کچھ نہ کرے لیکن ایک خوفناک چیخ و پکار ضرور ہی مچا دے گا اس میں کوئی شک نہیں۔

☆☆☆

میں لوٹ کر اپنی پرانی جگہ پر جا کھڑا ہوا اور کچھ ہی دیر بعد چٹائی لگی ہوئی بیل گاڑیاں پانچ چھ آدمی میری طرف دیکھ کر لمحہ بھر کے استقلال سے کھڑے رہے اور زیادہ سے زیادہ آہستہ آواز میں کچھ کہہ سن کر آگے بڑھ گئے۔ اور تھوڑی سی ہی دیر میں وہ تمام مجمع باندھ کر کنارے کی ایک جھاڑی کی اوٹ میں عائب ہو گیا۔ یہ اندازہ کر کے رات اب زیادہ نہیں رہی جب میں لوٹنے کی تیاری کر رہا تھا۔ عین اسی وقت ان درختوں کی اوٹ میں سے خوب بلند آواز میرے کانوں میں آئی۔ ”شری کانت بابو۔“

میں نے جواب دیا۔ ”کون ہے، رتن؟“

”ہاں بابو، میں ہی ہوں۔ ذرا آگے بڑھ کر آئیے۔“ جلدی سے باندھ کے اوپر چڑھ کر پکارا۔ ”رتن تم لوگ کیا گھر جا رہے ہو؟“

رتن نے جواب دیا۔ ”ہاں گھر جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ ماں گاڑی میں ہیں۔“

میرے قریب پہنچتے ہی پیاری نے پردے میں سے منہ باہر نکال کر کہا ”دربان کی بات سن کر میں سمجھ گئی تھی کہ تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ گاڑی پر آؤ کچھ بات کرنی ہے۔“

میں نے اور قریب آ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”کہتی ہوں اوپر آ جاؤ۔“

”نہیں ایسا نہیں کر سکتا۔ وقت نہیں ہے۔ صبح ہونے سے پیشتر ہی مجھے اپنے خیمہ میں واپس پہنچنا ہے۔“

پیاری نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پراسرار لہجہ میں کہا۔ ”نوکر چاکروں کی موجودگی میں چھینا جھپٹی مت کرو۔ تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ چپ چاپ اوپر چڑھ آؤ۔“

اس کی خلاف معمول بیقراری سے قدرے متاثر ہو کر میں بیخودی میں گاڑی پر چڑھ گیا۔

”پیاری نے گاڑی ہانکنے کا حکم دے کر کہا۔۔۔۔۔ آج پھر یہاں کیوں آئے؟“

میں نے سچ سچ بات کہہ دی۔ ”نا معلوم کیوں چلا آیا۔“

پیاری نے اب تک بھی میرا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا بولی۔ ”تمہیں معلوم نہیں، اچھا، ٹھیک لیکن تم چھپ کر کیوں آئے تھے؟“

میں بولا۔ ”یہ درست ہے کہ میرے یہاں آنے کی بات کسی کو معلوم نہیں لیکن چھپ کر میں

کی مانند کالا ہے۔ بے پایاں اور لامحدود آسمان بھی خطرناک طور پر تاریک ہے۔ تمام دنیاؤں کی پشت و پناہ، نور کا بھی نور، حرکت کی بھی حرکت، زندگی کی بھی زندگی، مکمل حسن کا خالق بھی انسان کی نگاہ میں ہولناک تاریک ہے۔ لیکن کیا اس کا باعث حسن کی کمی ہے؟ جس کو سمجھتے نہیں، جس کو جانتے ہیں، جس کے اندر داخل ہونے کا راستہ نہیں ملتا، وہ اتنا ہی زیادہ تاریک ہے۔ موت اسی لیے انسان کی نظروں میں کالی ہے۔ اور اس لیے عقیقی کی منزل اس قدر زبردست تاریکی میں مستور ہے۔ اسی لیے راوہا کی دونوں آنکھوں میں ساگر جس صورت نے پریم کے طوفان میں دنیا کو بہا دیا وہ گھنٹھام (بادلوں کی مانند سیاہ فام) ہے۔ میں نے کبھی یہ بات سوچی نہیں۔ کسی دن بھی اس راہ پر گامزن نہیں ہوا پھر بھی نا معلوم کسی غیبی طاقت سے خوف و خطر سے بھرے اس مہاشمشان کے نزدیک بیٹھ کر، اپنی بے بس تنہائی کو بھول کر آج میرے دل میں بلاوجہ ہی حسن و جمال کی مسرت کا دربار ٹھانٹھٹھانے لگا۔ اور بالکل یکا یک یہ بات جی میں آئی کہ سیاہی میں اتنا حسن ہے یہ تو پہلے کبھی محسوس نہیں کیا۔ پھر تو شاید موت بھی کالی ہونے کی وجہ سے ہیبت ناک نہیں ہے۔ ایک دن جب وہ مجھے لینے آئے گی تو شاید اس کی اس قسم کی ولفریب شکل و صورت کو دیکھ میری دونوں آنکھیں بیخودی میں بند ہو جائیں گی اور اگر وہ دن آج ہی آ گیا ہو تو اے میرے کالے، اومیری قریبی پاؤں کی آہٹ، اے مجھے تمام دکھوں سے نجات دلانے والے لامحدود جلوہ گر ہو جاؤ۔ میں تمہاری اس تیرگی سے محصور سنان موت کے مندر کے دروازے پر تمہیں بے خوف ہو کر حاصل کر کے کمال مسرت سے تمہارے نقش پا پر چلتا ہوں۔ اچانک میرے دل میں یہ بات آئی کہ پھر کس لیے اس کی خاموش دعوت کو نظر انداز کر کے اور، کسمپرسی کے عالم میں یہاں باہر کس غرض سے بیٹھا ہوں؟ ایک مرتبہ اندر جا کر کیوں نہ بیٹھوں؟

نیچے اتر کر میں شمشان کے عین بیچوں بیچ اچھی طرح جم کر بیٹھ گیا۔ کتنی دیر تک اس حالت میں بیٹھا رہا۔ اس کا مجھے اس وقت تک ہوش نہ تھا۔ ہوش آنے پر دیکھا کہ پہلے کی طرح تاریکی اب نہیں ہے۔ آسمان کا ایک حصہ کچھ صاف ہو گیا ہے۔ اور اس کے پاس ہی شکر تارا چمک رہا ہے۔ کچھ دہلی ہوئی سی بات چیت کا شور میرے کانوں میں پہنچا۔ اچھی طرح غور کر کے دیکھا کہ دور فاصلے پر سمیر کے درخت کے آڑ میں، باندھ کے اوپر سے ہو کر کچھ لوگ چلے آ رہے ہیں۔ اور ان کی دو چار لالٹینوں کی روشنی بھی آس پاس ادھر ادھر پھیل رہی ہے۔ دوبارہ بیل پر چڑھ کر اس روشنی ہی میں میں نے دیکھا کہ دو بیل گاڑیوں کے آگے پیچھے کچھ لوگ اسی طرف بڑھے آ رہے ہیں۔ سمجھ گیا کہ کچھ لوگ اس راستہ ہو کر اسٹیشن کی طرف جا رہے ہیں۔

مجھے اس وقت تجویز سوچ گئی کہ راستہ چھوڑ کر میرا دور کھسک جانا ضروری ہے کیونکہ اجنبیوں کا

نہیں آیا ہوں۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“

”نہیں۔“

”اس کا مطلب؟“

”مطلب اگر کھول کر بتا دوں گا تو یقین کر دو گی؟ نہ تو میں چھپ کر یہاں آیا ہوں اور نہ ہی

میری خواہش ہی آنے کی تھی۔“

پیاری نے طفریہ انداز میں کہا..... ”تو پھر تمہیں خیمہ سے کوئی بھوت اڑا لایا ہے۔ معلوم ہوتا

ہے یہی کہنا چاہتے ہو، کیوں؟“

”نہیں یہ تو کہنا نہیں چاہتا۔ اڑا کر کوئی نہیں لایا، خود بخود ہی اپنے پاؤں سے چل کر آیا ہوں۔

یہ بھی سچ مچ ہے مگر کیوں آیا، کب آیا یہ نہیں کہہ سکتا۔“

پیاری خاموش ہو رہی ہے۔ میں بولا..... ”راج لکشمی میں نہیں جانتا تم یقین کر سکو گی یا نہیں۔

لیکن درحقیقت جو کچھ ہوا ہے وہ ایک حیرت افزا معاملہ ہے۔“ اتنا کہہ کر میں نے تمام واقعہ الف سے ی

تک سنا دیا۔

سننے سننے میرے ہاتھ میں رکھا ہوا اس کا ہاتھ کئی مرتبہ لرز اٹھا۔ لیکن اس نے ایک بھی بات نہ

کہی۔ پردہ اٹھا ہوا تھا۔ پیچھے نظر ڈال کر دیکھا۔ مطلع صاف ہو چکا تھا بولا..... ”اب میں جاؤں؟“

پیاری نے ثنویت کے عالم میں کہا..... ”نہیں۔“

”نہیں کیسے؟ اس طرح چلے جانے کا مطلب کیا ہوگا؟ یہ جانتی ہو؟“

”جانتی ہوں..... سب جانتی ہوں۔ مگر یہ لوگ تمہارے مگر ان یا سر پرست تو نہیں ہیں۔ جو

محض اپنے فخر کے لیے جان دے دیں گے۔“ اتنا کہہ کر اس نے ہاتھ چھوڑ کر پاؤں پکڑ لئے۔ اور بھرائے

لجہ میں بولی..... ”کانت دادا، وہاں لوٹ کر جاؤ گے تو زندہ نہ بچو گے۔ تمہیں میرے ساتھ چلنے کی

ضرورت نہیں مگر وہاں بھی واپس لوٹنے نہ دوں گی۔ تمہارا ٹکٹ خریدے دیتی ہوں تم گھر لوٹ جاؤ۔ وہاں

ایک گھڑی بھر کے لیے بھی مت ٹھہرو۔“

میں نے کہا..... ”میرے کپڑے بستر وغیرہ جو وہاں پڑے ہیں۔“

پیاری بولی..... ”پڑے رہنے دو۔ ان کی مرضی ہوگی تو بھیج دیں گے ورنہ جانے دو۔ ان کی

قیمت کچھ زیادہ نہیں ہے۔“

میں نے کہا..... ”ان کی قیمت زیادہ نہیں ہے یہ سچ ہے لیکن جو میری جھوٹی بدنامی ہوگی اس

کی قیمت تو کم نہیں ہے۔“

پیاری میرے پاؤں چھوڑ کر خاموش ہو رہی۔ گاڑی اس وقت موڑ پر پھری جس سے میرے

پیچھے کا منظر میرے سامنے آ گیا۔ یکا یک یاد آیا کہ مقابل کے اس مشرقی آسمان کے ساتھ اس چہرے کی

ایک مشابہت ہے۔ دونوں کے ہی اندر آگ کا ایک عظیم گولہ تاریکی پھاڑ کر آ رہا ہے۔ اسی کا احساس

مجھے ہوا۔ میں نے کہا..... ”چپ کیوں ہو گئی ہو؟“

پیاری ایک روکھی ہنسی بکھری..... ”تم کیا جانو کانت بابو! کہ جس قلم سے زندگی بھر محض

جھلی خط لکھتی رہی ہوں۔ اسی قلم دان سے آج دان پتر (وصیت نامہ) لکھنے کے لیے ہاتھ نہیں چلتا۔

جاتے ہو؟ اچھا جاؤ لیکن وعدہ کرو کہ آج بارہ بجے سے پندرہ بجے وہاں سے چل دو گے۔“

”اچھا وعدہ کرتا ہوں۔“

”کسی کے بے حد اصرار سے آج کی رات وہاں بسر نہ کرو گے، بولو؟“

”نہیں نہیں بسر کروں گا۔“

پیاری نے اپنی انگلی اتار کر میرے پاؤں پر رکھ دی۔ گلے میں کپڑا ڈال کر پر نام کیا اور

قدموں کی خاک اپنے سر پر لے کر اس انگلی کو میری جیب میں ڈال دیا۔ بولی ”تو جاؤ، میرا خیال ہے کہ

ڈیرہ ایک کوس سے زیادہ فاصلہ تمہیں ملے نہ کرنا ہوگا۔“

تیل گاڑی سے اتر پڑا۔ اس وقت صبح ہو چکی تھی۔

پیاری نے التجا آمیز لہجہ میں کہا..... ”میری ایک اور بات بھی تمہیں رکھنی پڑے گی۔ گھر پہنچتے

ہی مجھے ایک خط لکھنا ہوگا۔“

میں منظور کر کے چل دیا۔ ایک دفعہ بھی لوٹ کر پیچھے کی طرف نہ دیکھا کہ وہ لوگ کھڑے ہیں

یا آگے چل دیے ہیں۔ لیکن کافی دور تک محسوس کرتا رہا کہ ان دو آنکھوں کی پریم اور درد بھری نگاہ میری

پشت پر بار بار بچھاؤ کھا کھا کر گر رہی ہے۔

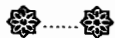
ڈیرہ پہنچتے ہی تقریباً آٹھ بج گئے۔ راہ کے کنارے پیاری کے ٹوٹے ہوئے خیمے کی بکھری

ہوئی غیر ضروری اشیاء پر میری نگاہ پڑتے ہی ایک بیکار تاسف سینے میں ہابا کار اٹھا۔ منہ پھیر کر جلدی

جلدی قدم بڑھاتے ہوئے اپنے خیمے میں داخل ہوا۔

پر شرم نے پوچھا..... ”کیا آپ تڑکے ہی گھومنے کے لیے باہر چلے گئے تھے؟“

ہاں نہ کسی طرح کا جواب دیئے بغیر ہی میں آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ رہا۔



پیاری سے جو وعدہ کیا تھا اس کی میں نے پوری پوری حفاظت کی، گھر لوٹتے ہی میں نے یہ اطلاع دے کر اسے ایک خط لکھ دیا۔ جواب بھی جلد ہی آ گیا۔ میں ایک بات پر متواتر خیال کر رہا تھا کہ کسی بھی دن پیاری نے مجھے اپنے پٹنہ کے مکان پر آنے کے لیے زور ڈالنا تو دور رہا، معمولی طور پر زبانی دعوت بھی نہ دی۔ اس خط میں بھی اس کا اشارہ تک نہ تھا۔ صرف اختتام پر ایک التجا بھی۔ جس کو آج بھی میں نہیں بھولا ہوں..... ”سکھ کے دنوں میں نہیں تو دکھ کے دنوں میں مجھے نہ بھولے۔ یہی آپ سے میری درخواست ہے۔“

دن کتنے لگے۔ پیاری کی یاد دھندلی ہو کر تقریباً معدوم ہو گئی۔ لیکن ایک حیرت افزا بات گاہے گاہے نظر آنے لگی۔ کہ اب کی دفعہ شکار سے واپس لوٹنے کے بعد میرا دل کچھ ان منسا رہنے لگا۔ گویا کسی خلا کا احساس، دہلی ہوئی سردی کی مانند جسم کے عضو عضو میں سرایت کر گیا ہے۔ بستر پر جاتے ہی اس کی کک معلوم ہوتی ہے۔

یاد آتا ہے کہ وہ بولی کی رات تھی۔ پیشانی پر سے عجیب کارنگ صابن سے دھو کر صاف نہیں کیا تھا۔ تھکان سے چور جسم کے ساتھ بستر پر پڑا تھا۔ پاس کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس میں سے سامنے کے پیپل کے پتوں کی پھاٹکوں میں سے آسمان میں پھیلنے والی چاندنی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بس اتنا ہی یاد آیا ہے لیکن کیوں دروازہ کھول کر سیدھا شیش کی طرف چل دیا اور پٹنہ کا ٹکٹ لے کر گاڑی پر بیٹھ گیا۔ یہ یاد نہیں آتا۔ رات گزر گئی لیکن صبح ہوتے ہی جونہی میں نے سنا، باڑھ، شیش ہے اور پٹنہ آنے میں زیادہ دیر نہیں تو یکا یک وہیں اتر پڑا۔ جب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا تو گھبرانے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی۔ ایک دوئی اور دس پیسے اس وقت بھی موجود تھے۔ خوش ہو کر دوکان کی تلاش میں شیش سے باہر نکلا۔ دوکان مل گئی۔ چڑوا، وہی اور شکر کو ملا کر خوب لذیذ کھانا کھانے سے تقریباً آدھا خرچ ہو گیا۔ ہو جانے دو۔ زندگی میں اس طرح کتنا ہی خرچ ہوا کرتا ہے۔ اس کے لیے رنج کرنا بزدلی ہے۔

گاؤں میں گھومنے کے لیے باہر ہوا۔ گھنٹہ بھر بھی نہ گھوما تھا کہ محسوس ہوا کہ اس گاؤں کا وہی اور چڑوا جس حد تک مفید ہے اسی حد تک پینے کا پانی نقصان دہ ہے۔ میری اتنی نقل غذا کو اتنے تھوڑے عرصہ میں اس طرح ہضم کر کے تباہ کر دیا کہ ایسا معلوم ہونے لگا گویا دس بیس دن سے اناج کا ایک دانہ بھی منہ میں نہیں پڑا ہے۔ ایسی خراب جگہ میں ٹھہرنا لمحہ بھر کے لیے بھی مناسب نہیں ہے یہ سوچ کر نقل مکانی کا تصور کر رہی رہا تھا کہ دیکھتا ہوں۔ قریب ہی آم کے ایک باغیچے کے اندر سے دھواں نکل رہا ہے۔ میں قیافہ شناس تھا۔ دھوئیں کو دیکھ کر آگ کے یقین کا اندازہ کر لیا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ آگ کی وجہ کا اندازہ کرتے بھی مجھے دیر نہ لگی۔ اس لیے سیدھا اسی طرف چل دیا۔ پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ پانی یہاں کا بہت خراب ہے۔

☆☆☆

واہ یہی تو چاہئے۔ تپے سنیا سی کا آشرم مل گیا۔ بڑی بھاری دھوئی کے اوپر لوٹنے میں چائے کے لیے پانی چڑھا ہے۔ بابا، نیم موندی آنکھوں سے سامنے بیٹھے ہیں۔ ان کے ارد گرد گانے کا سامان رکھا ہے۔ ایک سنیا سی بچہ بکری دوہ رہا ہے۔ خدمت کے لیے، چائے، چاہئے۔ دو اونٹ، دو ٹٹو اور ایک بچھڑے والی گائے پاس پاس درختوں کی شاخوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ قریب ہی ایک چھوٹا سا خیمہ ہے۔ ٹھوک کر دیکھا تو اندر میری ہی عمر کا ایک چھوٹا دونوں پاؤں کے درمیان پتھر کا کوٹنڈا باندھے نیم کے سونے سے بھنگ تیار کر رہا ہے۔

دیکھ کر میں ٹھٹکی سے شرابور ہو گیا۔ اور آن کی آن میں باباجی کے قدموں میں لوٹ گیا۔ ان کے قدموں کی خاک پیشانی سے لگا کر اور ہاتھ باندھ کر دل ہی دل میں کہا۔ کیسی مہر ہے بھگوان تمہاری۔ کیسی جگہ مجھے لے آئے۔ چولہے میں جائے پیاری..... راہ نجات کے اس صدر دروازے کو چھوڑ کر تل کے آدھے حصے کے برابر بھی اگر اور کہیں جاؤں تو میرے لیے دائمی نرگ میں بھی جگہ نہ رہے۔

سادھوجی بولے..... ”کیوں بیٹا؟“

میں نے عرض کیا..... ”میں تارک دنیا، متلاشی نجات، بد نصیب بندہ ہوں۔ مجھ پر کرم فرما اور اپنے قدموں کی خدمت کا حق دیجئے۔“

سادھوجی نے شیریں ہنسی ہنس کر دو دفعہ سر ہلا کر مختصر آ کہا..... بیٹا، گھر لوٹ جا، یہ راستہ نہایت دشوار گزار ہے۔“

میں نے التجا آمیزہ لہجہ میں فوراً جواب دیا۔ ”بابا، مہا بھارت میں مرقوم ہے، جگائی اور

معمور ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

آج باتوں ہی باتوں میں انہوں نے روحانیت کے متعلق کئی لیکچر دیے۔ اس کی مشکلوں کے متعلق، ریاضت شاقہ اور سنجیدہ ضبط کے متعلق آج کل کے بھانڈ اور پاکھنڈی لوگ کس طرح اسے بدنام کرتے پھر رہے ہیں۔ اس کا بالتفصیل ذکر اور بھگوان کے چرنوں میں لو لگانے کے لیے کیا کیا کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں ایک خاص درخت کی خشک لکڑی کے دھوئیں کو منہ کے ذریعے کھانے اور ناک کے ذریعے نکالنے کا کیسا حیرت انگیز انجام ہوتا ہے وغیرہ سب انہوں نے اچھی طرح ذہن نشین کر دیا۔ اور اس سلسلہ میں میری حالت نہایت امید افزا ہے۔ یہ بات اشارے سے ظاہر کر کے انہوں نے میرے جوش کو خوب بڑھایا۔ اس طرح اس دن نجات کی منزل بیشمار سربستہ راز سمجھ کر میں گورو مہاراج کے تیسرے چیلے کی شکل میں بحال ہو گیا۔

ریاضت شاقہ اور سنجیدہ ضبط کے لیے مہاراج کی ہدایت کے مطابق ہم لوگوں کی خدمت کا پروگرام سخت قسم کا تھا۔ جیسا کہ اس کا ذائقہ تھا انجام بھی اس کا ویسا ہی تھا۔ چائے، روٹی، گھی، دودھ، دہی، چڑاؤ اور وغیرہ نہایت اچھی غذا اور انہیں ہضم کرنے کے وسائل۔ بھگوان کے چرنوں سے بھی ہماری لوگی رہے اس طرح بھی ہم لوگوں کی ذرا سی بھی لاپرواہی نہ تھی۔ اس کے نتیجے کے طور پر میری خشک ڈالیوں میں پھل لگ گئے۔ اور کچھ تو ند بڑھنے کے آثار بھی دکھائی دینے لگے۔

ایک کام تھا۔ بھکشا کے لیے باہر جانا۔ سنیا سی کے لیے یہ کام مقدم نہ ہوتے ہوئے بھی نہایت اہم کام تھا۔ کیونکہ اس غذا کے ساتھ اس کا گہرا تعلق تھا۔ مگر مہاراج خود بھی یہ نہیں کرتے تھے۔ ان کے چیلے ہی باری باری یہ کیا کرتے تھے۔ سنیا سی کے دیگر فرائض میں تو ان کے دیگر چیلوں کو بھی جلد پار کر گیا۔ لیکن محض اس کام میں متواتر لنگڑا تار رہا۔ اس کام کو کسی بھی آسان اور خواہش کے مطابق نہ بنا سکا۔ تاہم ایک آسانی یہ بھی تھی کہ ہندوستانیوں کا علاقہ تھا۔ میں نیک و بد کی بات نہیں کہتا۔ میں صرف یہی کہتا ہوں کہ بنگال کی طرح وہاں کی عورتیں بابا ہاتھ جوڑتی ہوں اور ایک گھر آگے جا کے دیکھو، کہہ کر ہدایت نہیں کرتیں اور مرد بھی، نوکری نہ کر کے تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟ یہ کیفیت طلب نہیں کرتے۔ امیر، غریب بلا کسی امتیاز کے ہر ایک، ہر گھر سے بھیک دیتے ہیں۔ کوئی محروم نہیں جاتا۔ اسی طرح دن گزرنے لگے۔ پندرہ دن تو اس آم کے باغیچے میں ہی کٹ گئے۔ دن کے وقت تو کوئی آفت مصیبت نہ تھی۔ مگر رات کو چمچروں کے کانٹے کی جلن سے دل چاہتا تھا کہ بھاڑ میں جائے نجات کی خواہش۔ اگر جسم کے چمچروں کو کچھ اور موٹا نہ کیا جائے گا تو اب جان نہ بچے گی۔ دیگر کئی معاملات میں بنگالی لوگ خواہ کتنے بھی پاکیزہ کیوں نہ ہوں۔ لیکن بنگالی چمچروں کی نسبت ہندوستانی چمچروں اس سلسلہ میں سنیا سی کے لیے بہت زیادہ

مادھائی دوسرے کاروشٹ منی کے پاؤں پکڑ کر سورگ میں چلے گئے تھے۔ تو کیا میں آپ کے قدم پکڑ کر نجات بھی حاصل نہ کروں گا۔ یقیناً حاصل کروں گا۔“

سادھو جی مسرور ہو کر بولے۔۔۔۔۔۔ ”بات تیرا سچا ہے۔ اچھا بیٹا، رام جی کی کٹھوی۔“ جو دودھ دودھ رہا تھا۔ اس نے آکر چائے تیار کر کے بابا کو دی۔ اس کی خدمت ہو گئی۔ ہم لوگوں نے پر ساد پایا۔ بھنگ تیار ہو رہی تھی شام کے لیے۔ لیکن ابھی شام ہونے میں دیر تھی۔ اس لیے دوسری مسرتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ’بابا‘ نے اپنے چیلے کو گانے کی چلم اشارہ سے دکھادی اور اسے بھرنے میں دیر نہ ہو۔ اس کے لیے خاص ہدایت کر دی۔

آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ روشن ضمیر بابا نے مجھ سے مطمئن ہو کر کہا۔۔۔۔۔۔ ”ہاں بیٹا، تم میں بے شمار خوبیاں ہیں۔ تم میرا چیلہ بننے کے اہل ہو۔“

میں نے کمال خوشی کے ساتھ اور ایک دفعہ بابا کے پاؤں کی خاک سر پر لگالی۔ دوسرے دن صبح میں نہا کر آیا۔ دیکھا کہ گورو جی کی عنایت سے کی کسی شے کی نہیں۔ بڑے چیلے نے نیا گیروے کپڑوں کا سوٹ، دس جوڑی روراکش کی ملائیں اور ایک چوڑا پیتل کے کڑے باہر نکال دیے۔ جہاں جو شے پہننے کی تھی اسے اس جگہ آراستہ کر کے دھونی کی تھوڑی سی راکھ منہ اور سر پر مل لی۔ آنکھیں میچ کر میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ ”بابا جی، آئینہ وغیرہ کچھ ہے۔ ایک دفعہ چہرہ دیکھنے کی زبردست خواہش ہو رہی ہے۔“ میں نے دیکھا کہ ان کی طبیعت میں کیف موجود ہے تاہم انہوں نے کچھ سنجیدہ ہو کر کہا۔

”ہے ایک ٹھو۔“

”تو پھر چھپا کر لے نہ آئے ایک دفعہ۔“

دومنٹ کے بعد آئینہ لے کر میں ایک درخت کی آڑ میں چلا گیا۔ پچھتم کے نائی جس قسم کا آئینہ ہاتھ میں دے کر جانت کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح کی یہ چھوٹی ٹین میں مڑھی ہوئی آری تھی۔ خیر جو بھی میں نے دیکھا کہ وہ خاص تردد رکھتے جانے اور ہمیشہ استعمال میں آنے کی وجہ سے صاف ستھری تھی۔ چہرہ دیکھ کر بسے بغیر نہ رہا گیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میں وہی شری کانت ہوں جو کچھ ہی دن پیشتر راجمارا کی مجلس میں بیٹھ کر بابائی جی کا گانا سنا کرتا تھا۔ خیر جانے دو۔

گھنٹہ بھر بعد گورو مہاراج کے روبرو دکھشنا کے لیے لایا گیا۔ مہاراج میرا چہرہ دیکھ کر نہایت ملاحت کے ساتھ بولے۔۔۔۔۔۔ ”بیٹا ایک آدھ مہینہ ٹھہر جاؤ۔“

میں آہستہ سے ”بہت اچھا“ کہہ کر اور ان کی خاک پالے کر ہاتھ باندھ کر اور عقیدت سے

پوچھ ڈالے۔ ”تم کہاں سے آرہے ہو؟ کہاں رہتے ہو؟ تمہارا گھر کیا بردوان ضلع میں ہے؟ تم وہاں کب جاؤ گے؟ کیا تمہیں راجہ پور معلوم ہے؟ وہاں کے گوری تیواری کو جانتے ہو؟“

میں بولا۔ ”تمہارا گھر کیا بردوان ضلع کے راجہ پور میں ہے؟“

اس لڑکی نے ہاتھوں سے آنکھوں کا پانی پونچھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، میرے پتا کا نام گوری تیواری ہے اور بھائی کا نام رام لال تیواری ہے۔ انہیں کیا تم جانتے ہو؟ قین مہنے ہوئے سرال میں آئی ہوں۔ ابھی تک ایک بھی خط مجھے نہیں ملا۔ پتا، بھائی، ماں، گری بالا اور بابو کیسے ہیں کچھ بھی نہیں جانتی۔ وہ جو پٹیل کا درخت ہے اس کے نیچے میری بہن کے سرال کا مکان ہے۔ اس سوموار کو چچی گلے میں پھانسی لگا کر مر گئیں۔ لیکن یہ لوگ کہتے ہیں کہ۔۔۔۔۔ نہیں وہ مہینے سے مری ہیں۔“

حیرت و استعجاب سے میرے اوسان خطا ہو گئے۔ یہ بات کیا ہے؟ یہ لوگ، دیکھتا ہوں کہ پورے ہندوستانی ہیں۔ لیکن لڑکی بالکل خالص بنگالین ہے۔ اتنی دور، ان گھرانوں میں ان لڑکیوں کی شادیاں کس طرح ہوئیں اور ان کے شوہر، ساس سر وغیرہ یہاں کیا کرنے آئے؟

میں نے پوچھا۔ ”تمہاری بہن نے گلے میں پھانسی کیوں لگائی؟“

وہ بولی۔ ”جیجی راجہ پور میں جانے کے لیے دن رات روتی تھیں۔ کھاتی نہیں تھیں۔ سوتی نہیں تھیں۔ اس لیے ان کے بال چھت سے باندھ کر انہیں تمام دن اور تمام رات کھڑا رکھا جاتا تھا۔ اس لیے جیجی گلے میں سی ڈال کر مر گئیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”تمہارے ساس سر بھی کیا ہندوستانی ہیں؟“

اس لڑکی نے ایک بار پھر رو کر کہا۔ ”ہاں! میں ان لوگوں کی بات چیت کچھ بھی سمجھ نہیں سکتی۔ ان لوگوں کا کھانا بھی منہ میں نہیں ڈال سکتی۔ میں تو دن رات رویا کرتی ہوں۔ لیکن پتا نہ تو ہمیں خط ہی لکھتے ہیں اور نہ لینے ہی آتے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”اچھا تمہارے پتے تمہاری شادی اتنی دور کی ہی کیوں؟“

لڑکی بولی۔ ”ہم لوگ تیواری جو ہیں ہماری برادری میں قابل شادی لڑکے وہاں تو ملتے نہیں۔“

”تمہیں کیا وہ زد و کوب بھی کرتے ہیں؟“

اور نہیں تو کیا؟ یہ دیکھو نا۔ اتنا کہہ کر اس لڑکی نے بازوؤں میں، پیٹھ کے اوپر مار کے نشانات دکھائے اور سسک سسک کر روتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی جیجی کی طرح ہی گلے میں پھانسی لگا کر مر جاؤں گی۔“

مناسب ہے۔ یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ اس دن صبح نہا کر کھانا حاصل کرنے کی کوشش میں باہر جانی رہا تھا کہ گوردھاراج نے بلا کر کہا۔

بھاردواج منی، بسیں پریاگا

جن ہیں رام پداتی، انوار گا

یعنی Strike The Tent (خیمے اکھاڑ لو)۔۔۔۔۔ پریاگ کا سفر کرنا ہوگا۔ لیکن یہ کام کچھ آسان نہ تھا۔ سنیاسی کا سفر جو بظہر۔ سدھائے ہوئے ٹٹوؤں کی تلاش کرتے اور ان پر سامان لا دتے، اونٹ پر مہاراج کی زین کتے، گائے بکریاں کو ساتھ لیتے، گٹھے گھڑیاں باندھتے، سلسلہ دار لگاتے ایک پہر گزر گیا۔ اس کے بعد کھانا کھا کر دو کوس دور شام سے پیشتر ہی بخورا گاؤں کے باہر ایک بہت بڑے برگد کے نیچے ڈیرہ جمایا گیا۔ جگہ نہایت دل فریب تھی۔ گوردھاراج کو خوب پسند آئی۔ لیکن بھاردواج منی کے اس مقام تک پہنچنے پہنچنے کتنے مہینے صرف ہو جائیں گے۔ اس کا میں اندازہ ہی نہ کر سکا۔

اس بخورا کا نام آج تک مجھے یاد رہنے کی ایک خاص وجہ ہے، اس دن پور نماشی تھی۔ لہذا گوردھاراج کے ارشاد کے مطابق ہم تینوں چیلے تین مختلف سمتوں میں بھٹکا کے لیے گئے۔ اکیلا ہوتا تو شکم پری کے لیے کم کوشش نہ کرتا۔ مگر آج میری وہ چال نہ تھی۔ اس لیے بہت کچھ بیکار ہی ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ اچانک ایک مکان کے کھلے ہوئے دروازے کے اندر مجھے ایک بنگالی لڑکی کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کا لباس اگرچہ دیسی کھڈی کا بنا ہوا ٹاٹ کی مانند موٹا تھا لیکن پہننے کے خاص ڈھنگ نے میرے اضطراب کو مشتعل کر دیا۔ سوچا پانچ چھ دن سے اس گاؤں میں ہوں۔ تقریباً تقریباً ہر گھر میں ہو آیا ہوں۔ لیکن بنگالی عورت تو کبھی بنگالی مرد کی شکل دکھائی نہیں دی۔ سادھو سنیاسیوں کے لیے کہیں روک ٹوک نہیں اندر داخل ہوتے ہی وہ عورت میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی شکل و صورت آج بھی مجھے یاد ہے۔ کیونکہ دس گیارہ سال کی لڑکی کی آنکھوں میں اضطراب، اتنی بے چینی، اتنی ویرانی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ اس کے بشرے سے، اس کے ہونٹوں سے، اس کی آنکھوں سے غرضیکہ اس کے ایک ایک عضو سے غم اور مایوسی پھوٹی پڑتی تھی۔ میں نے یکبارگی بنگالی میں کہا۔ ”کچھ بھٹکا دینا ماں۔“ پہلے تو وہ کچھ نہ بولی اس کے بعد اس کے ہونٹ ایک دوسرے کانپ کر پھول اٹھے اور وہ رونے لگی۔

میں دل ہی دل میں کچھ شرم کر رہ گیا۔ کیونکہ اگرچہ سامنے کوئی نہ تھا تاہم بڑوس کے گھروں میں بہاری عورتوں کی بات چیت صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔ ان میں سے اگر کوئی یکا یک باہر آ کر اس حالت میں ہم دونوں کو دیکھ لے تو وہ کیا سوچے گی۔ کیا کہے گی یہ میں کچھ بھی سوچ نہ سکا۔ کھڑا ہوں یا واپس چلا جاؤں یہ فیصلہ کر سکنے کے پہلے ہی اس لڑکی نے روتے روتے ایک سانس میں ہی ہزار سوالات

گہرے تعلقات سے گھل مل کر بھی رہا ہوں۔ برائیاں جوان میں ہیں وہ ہیں ہی۔ میں خویوں کا ہی ذکر کروں گا۔ محض پیٹ کے لیے سادھو جی تو باہم کی باتیں جانتے ہوں گے۔ لیکن ان میں بھی یہ دو خرابیاں میری نگاہ سے نہیں گزری۔۔۔۔۔ میری نظر میں بہت زیادہ موٹی نہ تھی۔ عورتوں کے متعلق ان لوگوں کا ضبط سمجھنے یا حوصلہ کی کمی زیادہ ہے۔ اور موت کا خوف بھی ان لوگوں میں بہت ہی کم ہوتا ہے۔ بار بار بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست ہی تو ہے۔ مگر کیا کرنے سے بہت دن زندگی ملتی ہے، یہ خیال نہیں ہوتا۔ ہمارے سادھو بابا بھی ایسے ہی تھے۔ پہلی شے یعنی عیش کے لیے دوسری یعنی زندگی کو انہوں نے بیچ کر رکھا تھا۔

تھوڑی سی دھونی کی راکھ اور دو بوند کنڈل کے پانی کے عوض جو تمام چیزیں و نادن ڈیرہ میں آنے لگیں۔ وہ کیا سیاسی اور کیا گریہ سستی کے لیے بھی نامرغوب نہیں ہو سکتیں۔

رام بابو معہ اپنی بیوی کے روتے ہوئے آئے۔ چار روز بخار کے بعد آج صبح بڑے لڑکے کو چپک دکھائی دی تھی اور چھوٹا بچہ کل رات سے بخار میں بے ہوش پڑا ہے۔ یہ معلوم کر کے آپ بنگالی ہیں۔ میں نے خود ان کے قریب جا کر ان سے تعارف حاصل کیا۔

اس کے بعد اس داستان کے سلسلہ میں مہینہ بھر کا وقفہ ڈالنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ کس طرح ہماری واقعیت کا یہ سلسلہ بڑھتا گیا۔ کس طرح دونوں بچے تندرست ہوئے۔ یہ ایک طویل کہانی ہے۔ کہتے کہتے ہی اکتا جاؤں گا پھر قارئین کی بات تو دور رہی۔ تاہم درمیان کی ایک بات عرض کرتا ہوں۔ تقریباً دو ہفتہ بعد جب بیماری خوب زور سے پھیل رہی تھی۔ سادھو جی نے اپنا ڈیرہ اٹھانے کی تجویز کی۔ رام بابو کی بیوی رو کر بول اٹھی۔ ”سنیاسی بھیا، تم تو بچ مچ کے سنیاسی نہیں ہو۔ تمہارے دل میں تو درد اور رحم ہے۔ نویں اور جیون کو اگر تم چھوڑ کر چلے جاؤ گے تو وہ کبھی نہ بچیں گے، کہاں؟ جاؤ دیکھو کیسے جاتے ہو؟“ اتنا کہہ کر اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو نکل پڑا۔ رام بابو بھی اپنی بیوی کی تائید میں منت سماجت کرنے لگے۔ اسی لیے میں نہ جاسکا۔ سادھو بابا نے کہا۔ ”پر بھو“ آپ چلیں میں راستے میں نہیں تو پیراگ پر پہنچ کر ضرور ہی آپ کی قدم بوسی کروں گا پر بھو قدرے ناراض ہوئے۔ آخر کار بار بار اصرار کر کے اور بلاوجہ کہیں تاخیر نہ کر دیتا۔ اس کے متعلق بار بار بحثا کر کے وہ عازم سفر ہوئے۔ میں رام بابو کے گھر میں ہی رہ گیا۔ ان چند دنوں میں ہی میں پر بھو کی مہر و محبت کا سب سے زیادہ حق دار ہو گیا تھا اور اگر اور بھی چند دن اسی طرح ان کے پاس رہ جاتا تو ان کے بعد، ان کی جانشینی کے سلسلہ میں اس ٹٹو اور دونوں اونٹوں کا مالک ہوتا۔ خیر جانے دو۔ ہاتھ کی دولت پاؤں سے دھکیل کر، گنی گزری بات پر افسوس کرنے سے اب کیا فائدہ؟

لیے بستے ہیں۔ دل ہی دل میں معلوم ہونے لگا کہ اگر ان تمام گاؤں میں نہ آ پڑا ہوتا تو اپنے گاؤں کی قدر و قیمت کبھی محسوس ہی نہ ہوتی۔ ہمارے وہاں کے پانی میں کائی بھری رہتی ہے۔ ہوا میں لمیر یا ہے۔ عموماً کبھی باشندوں کی پیٹ میں تلی بڑھی ہوئی ہے۔ گھر گھر مقدے بازی ہوا کرتی ہے محلے محلے میں دل بندیاں ہیں۔ یہ سب رہنے دیجئے لیکن اس کے باوجود بھی وہاں کیسا لطف اور کیسی تسکین تھی۔ اس وقت اس کے متعلق کچھ نہ جانتے ہوئے بھی سب کچھ جاننے لگا۔

دوسرے دن خیمے اکھاڑ کر سفر شروع کر دیا۔ اب سادھو بابا حسب طاقت بھار دوداج منی کے آشرم کی طرف پوری پوری کوشش سے بڑھنے لگے۔ مگر خواہ اس خیال سے کہ راستہ سیدھا ہے یا منی جی نے میرے دل کی بات جان لی۔ اس وجہ سے ہو۔ پٹنہ کے دس کوس کے اندر انہوں نے پھر کہیں خیمے نصب نہ کئے۔ دل میں ایک حسرت تھی۔ خیر اسے اس وقت رہنے دو۔ گناہ تو میں نے جی بھر کر لیے۔ سادھوؤں کی صحبت سے ہی چند دن کے لیے پاکیزگی حاصل کر لوں۔

ایک دن شام سے کچھ پیشتر جس جگہ ہمارا ڈیرہ پڑا اس کا نام تھا چھوٹی گیا۔ آ رہ شیشن سے یہ جگہ آٹھ کوس دور ہے۔ اس گاؤں کے ایک مشہور بنگالی صاحب سے میرا تعارف ہو گیا تھا۔ ان کا مجمل طور پر ذکر کروں گا۔ ان کے اصلی نام کو پوشیدہ رکھ کر، رام بابو، کہنا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ اب تک وہ زندہ ہیں اور بعد ازاں اگر چہ کسی جگہ میری ان سے ملاقات بھی ہوئی تھی لیکن وہ مجھے پہچان نہ سکے تھے۔ اس میں کچھ حیرت بھی نہیں۔ ان کا مزاج میں جانتا ہوں۔ پوشیدہ طور پر جو نیک کام انہوں نے کئے ہیں۔ ان کا اگر ذکر دیا جاتے تو ان کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ یہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں اس لیے ان کا نام ہے، رام بابو، کس طرح رام بابو اس گاؤں میں آئے تھے۔ اور کس طرح انہوں نے زمین جائیداد جمع کر کے کھیتی باڑی شروع کی تھی۔ مجھے معلوم نہیں۔ میں تو صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ انہوں نے دوسری شادی کی تھی اور تین چار بیٹے بیٹیوں کے ساتھ وہ چین اور آرام سے رہتے تھے۔

صبح کے وقت سنا گیا کہ ان ہی چھوٹی گیا اور بڑی گیا نام کے گاؤں میں اس وقت چپک کی بیماری خطرناک طور پر پھیل رہی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ مصیبت اور قہر کے موقع پر ہی سادھو سنیاسیوں کی خاطر تواضع بہت اچھی طرح ہوتی ہے۔ اس لیے سادھو بابا نے غیر حترزل ارادہ سے وہاں ٹھہرنے کا ارادہ کر لیا۔

☆☆☆

اچھی بات ہے۔ سنیاس کی زندگی کے متعلق ایک بات میں یہاں عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ زندگی میں میں نے لاتعداد سنیاسی دیکھے ہیں۔ چار ایک مرتبہ میں ان کے ساتھ ایسے ہی

دونوں بچے اب راضی ہو گئے تھے۔ بیماری نے گھروں کے گھر اجاڑ دیے۔ وہ کیا مہیب منظر تھا جس نے اپنی آنکھوں نہیں دیکھا۔ وہ پڑھ کر اس کا ذکر سن کر یا تصور سے اس کو ذہن نشین کر سکے یہ قطعی ناممکن ہے۔ اس لیے اس ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش میں نہیں کروں گا۔ لوگوں نے بھاگنا شروع کیا جس گھر میں انسان کا نشان نظر نہیں آتا۔ جھانک کر دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ صرف ماں اپنی بیمار اولاد کو لیے بیٹھی ہے۔

رام بابو نے بھی اپنے گھر کی بیل گاڑی میں اپنا سامان لا دیا۔ وہ تو کئی دن پیشتر ہی ایسا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مجبور ہو کر ہی ایسا نہ کر سکے۔ پانچ چھ روز سے میرا جسم نہایت سست سا ہو رہا تھا۔ کچھ بھی اچھا نہ لگتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ شب بیداریوں اور لگا تار محنت کے باعث ہی ایسا ہو رہا ہے۔ اس دن صبح ہی سے سر میں درد ہونے لگا۔ بالکل مجبوری کے طور پر اس دن دوپہر کو جو کچھ کھایا یا شام کے وقت اسے تے کر دیا۔ رات کے نو دس بجے معلوم ہوا کہ بخار چڑھ آیا ہے۔ اس دن تمام رات بھران کی تیاریاں جا رہی تھیں۔ سب جاگ رہے تھے۔ کافی رات گئے رام بابو کی بیوی باہر سے کمرے میں جھانک کر بولی..... ”سنیاسی بھیا! تم کیا ہمارے ساتھ ہی آ رہے شیش تک نہ چلو گے؟“

میں بولا..... ”ضرور چلوں گا۔ مگر تمہیں اپنی گاڑی میں تھوڑی سی جگہ مجھے ضرور دینی ہوگی۔“ بہن نے بے قرار ہو کر پوچھا..... ”یہ کیسے سنیاسی بھیا! گاڑیاں تو دو سے زیادہ مل نہیں سکیں۔ ان میں تو ہم لوگوں کے لیے بھی کافی جگہ نہیں ہے۔“

میں نے کہا..... ”مجھ میں تو چلنے کی طاقت ہی نہیں بہن؟ صبح ہی سے خوب بخار چڑھ رہا ہے۔“

”بخار کہتے کیا ہو؟“ یہ کہہ کر اور جواب کا خیال کئے بغیر ہی میری نئی بہن اپنا منہ چھپا کر چلی گئی۔

کتنی دیر تک سوتا رہا یہ نہیں جانتا۔ جاگ کر دیکھا کہ کافی دن چڑھ آیا ہے مکان کے اندر سب کمروں میں تالے لگے ہوئے ہیں اور کسی انسان کا نام و نشان تک نہیں ہے۔

باہر کے جس کمرے میں میں تھا اس کے سامنے سے ہی اس گاؤں کا کچا راستہ آ رہا شیش تک جاتا ہے۔ اس راستے سے روزانہ کم از کم پانچ چھ بیل گاڑیاں، موت سے دوڑ کر بھاگنے والے مرد اور عورتوں کا مال اسباب لا کر شیش تک جایا کرتی تھیں۔ دن بھر تک بے شمار کوشش کرنے کے بعد شام کو مجھے ایک گاڑی میں جگہ مل ہی گئی۔ جن بوڑھے بہاری مہربان نے رحم کھا کر مجھے اپنے ساتھ لے لیا تھا انہوں نے خوب تڑکے ہی مجھے شیش کے قریب ایک درخت کے نیچے اتار دیا۔ اس وقت مجھ میں بیٹھنے کی

بھی سکت باقی نہ تھی۔ میں وہیں لیٹ گیا پاس ہی مین کا ایک شینڈ تھا۔ پہلے وہ مسافر خانہ کے کام آتا تھا لیکن آج کل بادل پانی کے دن گائے پھڑوں کے استعمال میں آنے کے علاوہ اور کسی کام میں نہ آتا تھا۔ وہ بوڑھا مہربان شیش سے بنگالی نوجوان کو بلا لایا۔ میں اسی کی عنایت سے کئی ایک قلیوں کی امداد سے اس شینڈ کے نیچے لایا گیا۔

میری بد قسمتی ہے کہ میں اس نوجوان کا کوئی تعارف نہیں دے سکتا کیونکہ میں اس وقت اس سے پوچھ ہی نہ سکا۔ پانچ چھ مہینے بعد جب کچھ دریافت کرنے کا موقعہ اور طاقت ملی تو معلوم ہوا کہ چچک سے بیمار ہو کر وہ اس چھان فانی سے کوچ کر چکا ہے۔ اس کے متعلق دریافت کرنے پر صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ وہ مشرقی بنگال کا تھا اور پندرہ روپے ماہوار پر شیش پر کام کرتا تھا۔ کچھ دیر پھر کراپنا سینکڑوں جگہ سے پھٹا ہوا بچھونا لا کر اس نے حاضر کیا اور وہ بار بار کہنے لہا کہ میں اپنے ہاتھ سے خود پکا کر کھاتا ہوں اور دوسرے کے گھر میں رہتا ہوں۔ دوپہر کے وقت ایک کنوڑا گرم دودھ لا کر اس نے جبراً پلا کر کہا باہر کے جس کمرے میں میں تھا اس کے سامنے سے ہی اس گاؤں کا کچا راستہ آ رہا شیش تک جاتا ہے۔ اس راستے سے روزانہ کم از کم پانچ چھ..... ”ڈرنے کی بات نہیں ہے اچھے ہو جاؤ گے۔ لیکن اپنے کسی قریبی رشتہ دار یا دوست احباب کو اطلاع دینی ہو تو پتہ بتا دینے پر میں تار دے سکتا ہوں۔“

اس وقت تک میں خوب ہوش میں تھا۔ اس لیے یہ بھی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ یہ حالت بہت دیر تک نہ رہے گی۔ اس طرح کا بخار اگر اور بھی پانچ چھ گھنٹے مسلسل رہا تو ہوش ضرور گنوا تا پڑے گا اس لیے جو کچھ کرنا ہے وہ اتنے وقت کے دوران میں نہ کرنے پر پھر نہیں کیا جاسکے گا۔ یہ تو ٹھیک لیکن اطلاع دینے کی تجویز پر کچھ متذبذب میں پڑ گیا کیوں؟ اس کی تشریح کرنے کی ضرورت نہیں لیکن سوچا غریب کا پیسہ ٹیلیگرام میں خرچ کرنے سے فائدہ ہی کیا ہے۔

شام کے بعد وہ شریف النفس اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ایک گھڑ پانی اور مٹی کے تیل کی ڈبی لے کر آیا۔ اس وقت بخار کی شدت سے دماغ خراب ہو رہا تھا اسے پاس بلا کر میں نے کہا۔ ”جب تک مجھے ہوش ہے گا ہے دیکھ جانا۔ اس کے بعد جو ہونا سو ہو۔ آپ اور کوئی تکلیف نہ اٹھائیں۔“ وہ نہایت کم گو اور نیک انسان تھا۔ بات کو بنا کر کہنے کی اسے عادت نہ تھی جواب میں محض، نہیں نہیں، کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے کہا ”آپ نے فرمایا تھا کہ میں کسی کو اطلاع دے دو۔ میں سنیاسی ہوں۔ درحقیقت میرا اپنا کوئی بھی نہیں ہے۔ تاہم پنڈے میں پیاری بائی کے پتے پر اگر ایک پوسٹ کارڈ لکھ دو گے کہ شری کانت آ رہا شیش کے باہر ایک ”میں ٹیڈ کے نیچے قریب المرگ پڑا ہے تو.....“

وہ نوجوان بے قرار ہو کر بول اٹھا۔ ”میں ابھی اطلاع دیئے دیتا ہوں۔ چٹھی اور تار دونوں ہی بھیج دیتا ہوں۔ اتنا کہہ کر وہ اٹھ چلا گیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا ”بھگوان! اسے خبر ہو جائے۔“

☆☆☆

ہوش آنے پر پہلے تو میں اپنی حالت اچھی طرح سمجھ ہی نہ سکا۔ سر پر ہاتھ لے جا کر محسوس کیا کہ وہ تو آئس بیگ ہے۔ آنکھیں مل کر دیکھا کہ مکان کے اندر ایک گھاٹ پر پڑا ہوں۔ سامنے سٹول پر ایک دیئے کے پاس دو تین دوا کی شیشیاں ہیں اور اس کے پاس رسی کی ایک کھاٹ پر کوئی انسان سرخ چمک کار پیر لپٹے ہوئے سو رہا ہے۔ بہت دیر تک کچھ بھی یاد نہ کر سکا۔ اس کے بعد کیے بعد دیگر یہ معلوم ہونے لگا گو نیند میں کتنے ہی خواب دیکھے ہیں۔ بے شمار لوگوں کا آنا جانا، اٹھا کر مجھے ڈولی میں ڈالنا، سر اٹھا کر دوائی پانا۔ اس قسم کی کتنی ہی باتیں یاد آئیں۔

کچھ دیر بعد جب وہ شخص اٹھ گیا تو دیکھا کہ کوئی بنگالی صاحب ہے۔ عمر اٹھارہ انیس سے زیادہ نہیں۔ اس وقت میرے سر ہانے کے قریب سے نہایت شیریں لہجہ میں جس نے مخاطب کیا اس کی آواز میں نے پہچان لی۔

پیاری نے کمال ملائمت سے پکارا۔ ”بنکو، برف کا بیگ بدل کیوں نہیں دیا بیٹا؟“
لڑکا بولا۔ ”بدل دیتا ہوں۔ تم تھوڑا سا سولہ ماں۔ ڈاکٹر صاحب جب کہہ گئے ہیں کہ شعلہ نہیں ہے تو ڈرنے کی تو کوئی بات نہیں ہے ماں!“

پیاری بولی۔ ”ارے بھیا، ڈاکٹر کے کہنے سے کو ڈرنے کی کوئی بات ہے عورتوں کا ڈر کہیں جاتا ہے؟ مجھے تشویش کرنے کی ضرورت نہیں ہے بنکو۔ تو تو برف بدل کر سو جا۔ پھر رات کو مت جاگنا۔“

بنکو نے آ کر برف بدل دیا اور لوٹ کر وہ پھر اسی کھاٹ پر جا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جب اس کی ناک بجنی شروع ہوئی تو میں نے آہستہ سے پکارا۔ ”پیاری!“
پیاری نے منہ پر جھک کر اور سر پر بکھرے ہوئے پانی کے قطرات کو اپنے آنچل سے پونچھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کیا تم پہچان سکتے ہو؟ اب کیسے ہو؟ کل.....“

”اچھا ہوں۔ کب آئی؟ یہ کیا آ رہا ہے؟“

”ہاں آ رہا ہی ہے۔ کل ہم لوگ گھر چلیں گے۔“

”کہاں؟“

”پٹنہ، ہوائے اپنے گھر لے جانے کے ابھی کیا اور کہیں میں تمہیں چھوڑ کر جاسکتی ہوں؟“

”یہ لڑکا کون ہے راج کشمی؟“

”میری سوت کا لڑکا ہے مگر بنگو میرے اپنے لڑکے کی طرح ہی ہے۔ میرے پاس رہ کر ہی پٹنہ کالج میں پڑھتا ہے۔ آج اب اور بات مت کرو۔ سو جاؤ۔ کل جی بھر کر باتیں ہوں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے میرے منہ پر اپنی ہتھیلی رکھ کر میرا منہ بند کر دیا۔

میں ہاتھ بڑھا کر راج کشمی کے داہنے ہاتھ کو مٹھی میں لے کر کروٹ بدل کر سو رہا۔

☆☆☆

جس بخار میں مبتلا ہو کر بستر علالت پر دراز ہو گیا تھا وہ شعلہ کا نہیں تھا کچھ اور ہی تھا۔ ڈاکٹری کتابوں میں یقیناً ہی اس کا کوئی بڑا بیماری نام تھا لیکن مجھے وہ یاد نہیں رہا۔ اطلاع ملتے ہی پیاری، اپنے لڑکے اور دونوں کو اور نوکرانی کو لے کر آ حاضر ہوئی۔ اس دن بھر نے کے لیے ایک جگہ کرائے پہ لے کر مجھے وہاں بٹھرا دیا اور شہر کے بھلے برے سب ڈاکٹروں کو بلا کر وہاں اکٹھا کر دیا۔ اچھا ہی کیا ورنہ اور کوئی نقصان خواہ نہ ہوتا لیکن بھارت ورش کے ناظرین کا اشتیاق تو نامکمل ہی رہ جاتا۔

صبح پیاری نے کہا۔ ”بنکو اب مزید دیر نہ کرو بیٹا، اسی وقت سیکنڈ کلاس کا ایک ڈبہ ریز روکرا آ۔ میں ایک لمحہ بھی انہیں یہاں رکھنے کا حوصلہ نہیں کر سکتی۔“

بنکو اس وقت شیریں خواب کا لطف لے رہا تھا۔ اس نے اسی طرح نیم وا آنکھوں سے جواب دیا۔ ”تم پگلی ہو گئی ہو ماں، ایسی حالت میں کیا سر ایض کو یہاں سے وہاں لے جایا جاسکتا ہے؟“
پیاری نے کچھ ہنس کر کہا۔ ”پہلے اٹھ۔ اور منہ پر چھینٹے مار اس کے بعد یہاں وہاں لے جانے کی بات سمجھ لی جائے گی۔ راجا بیٹا میرے اٹھ۔“

”بنکو اور کوئی چارہ نہ دیکھ کر، چار پائی چھوڑ، منہ ہاتھ دھو، کپڑے بدل اسٹیشن پر چلا گیا۔ اس وقت بھی بہت جلدی تھی۔ گھر میں اور کوئی نہ تھا۔ آہستہ آہستہ پکارا۔ ”پیاری۔“ میرے سر ہانے کی طرف ایک کھاٹ پر بچھی ہوئی تھی۔ اسی پر تھکاوٹ سے چور ہو شاید اسی دوران میں وہ ابھی آنکھیں موٹ کر لیٹ گئی تھی۔ جھٹ پٹ اٹھ بیٹھی اور میرے منہ پر جھک گئی۔ نازک لہجہ میں اس نے پوچھا۔ ”نیند کھل گئی؟“

”میں تو جاگ ہی رہا ہوں۔“ پیاری نے محبت بھری احتیاط سے میرے سر اور پیشانی پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے کہا۔ ”بخار اس وقت بہت کم ہے۔ آنکھیں بند کر کے تھوڑا سا سونے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟“

”یہ تو میں برابر ہی کرتا ہوں۔ آج بخار کو کتنے روز ہوئے پیاری؟“

”تیرہ روز“ کہہ کر بڑی بوڑھی بزرگ کی طرح سنجیدہ آواز میں کہا۔ ”دیکھو لڑکے بالوں کے سامنے مجھے یہ نام لے کر مت پکارا کرو۔ بہت دنوں تک ”لکشمی“ کہہ کر پکارتے رہے ہو۔ وہی نام لے کر کیوں نہیں پکارتے؟“

دو دن سے میں خوب ہوش میں تھا۔ مجھے بھی سب باتیں یاد آ گئی تھیں۔ میں نے کہا۔۔۔۔۔ ”اچھا۔“ اس کے بعد جس بات کے لیے بلایا تھا اسے دل ہی دل میں اچھی طرح ترتیب دے کر کہا۔۔۔۔۔ ”مجھے لے جانے کی کوشش کر رہی ہو، لیکن میں نے تمہیں بہت تکلیف دی ہے۔ اب اور دینا نہیں چاہتا۔“

”تو پھر کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”میں سوچتا ہوں کہ اب جیسا ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے تین چار دن میں ہی اچھا ہو جاؤں گا۔ تم لوگ خواہ اتنے دن اور بٹھہر کر کیا کرو گے اپنے گھر چلے جاؤ۔“

”تب تم کیا کرو گے؟ سنو تو۔“

”جو کچھ ہونا ہو گا وہی جائے گا۔“

”وہ تو ہو جائے گا۔“ کہہ کر پیاری کچھ ہنس دی۔ اس کے بعد سامنے آ کر، کھٹ پر ایک طرف بیٹھ کر میرے منہ کی طرف دیکھ کر لہو بھر خاموش رہ کر پھر کچھ ہنس کر بولی۔۔۔۔۔ ”تین چار دن میں تو نہیں دس بارہ دن میں یہ بیماری تو رفع ہو جائے گی۔ لیکن حقیقی بیماری کتنے دنوں میں رفع ہوگی؟ یہ میں جانتی ہوں۔“

”حقیقی بیماری اور کیا؟“

پیری نے کہا۔۔۔۔۔ ”سوچو گے کچھ، کہو گے کچھ اور کرو گے کچھ، ہمیشہ سے تمہیں یہی ایک مرض ہے۔ تم جانتے ہو کہ ایک سے پیشتر میں تمہیں اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ کر سکوں گی۔۔۔۔۔ پھر بھی تم کہو گے۔“ تمہیں تکلیف دی، تم جاؤ، ارے او میرے ہمدرد تمہیں اگر میرا اتنا دور ہے تو اور خواہ جو ہو لیکن سنیا سی تو تم نہیں ہو، سنیا سی بن کر یہ کیا ہنگامہ کھڑا کیا ہے۔ آ کر دیکھتی ہوں کہ زمین پر بیٹھی کیستری پر سخت بے ہوش پڑے ہو۔ کچھ مٹی میں جٹائیں آلودہ ہو چکی ہیں۔ گلے میں روراکش کی ملائیں اور دونوں ہاتھوں میں پیتل کے کڑے ہیں۔ میاری میا۔ چہرہ دیکھ کر روئے بغیر نہ رہ سکی۔ اتنا کہتے کہتے اٹھ سے ہوئے آنسوؤں کا پانی آنکھوں میں چھلک آیا اسی وقت وہ اسے ہاتھ سے پونچھ کر۔۔۔۔۔ ”بنکو بولا، یہ کون ہے ماں؟ دل ہی دل میں بولی۔۔۔۔۔ تو پچھ ہے، تیرے سامنے وہ بات کیا کہوں بھیا۔ وہ دنیا بھر میں کسی نے کبھی کسی کو نہ دیا ہو گا۔ شہر میں چپک کا زور پھیل رہا ہے۔ سب کو لے کر خیریت سے بھاگ سکوں تو جان میں جان آئے۔“ اتنا کہہ کر اس نے ایک طویل آہ بھری۔

اسی رات کو آ رہ چھوڑ دیا۔ ایک کم عمر کا ڈاکٹر بہت سی دوائیاں لے کر ہم لوگوں کو پٹنہ تک پہنچانے کے لیے ساتھ گیا۔

☆☆☆

پٹنہ پہنچ کر بارہ تیرہ دن کے اندر ہی ایک طرح سے میں اچھا ہو گیا۔ ایک روز صبح اکیلا پیاری کے مکان کے ہر ایک کمرے میں گھوم آیا۔ اس کا مال و اسباب دیکھ میں کچھ دنگ رہ گیا میں نے اس سے پیشتر اس قسم کا ساز و سامان نہ دیکھا ہو۔ یہ بات نہ تھی۔ چیزیں سب عمدہ اور بیش قیمت تھیں۔ یہ ٹھیک ہے لیکن اس مارواڑی محلے میں ان سرمایہ داروں اور کم تعلیم یافتہ شوقین مزاجوں کی صحبت میں اتنی معمولی چیزوں سے وہ مطمئن کیسے رہتی تھی؟ اس سے پیشتر میں نے اس قسم کے جتنے مکان دیکھے تھے۔ ان کے ساتھ کسی بھی پہلو میں اس کی مناسبت نہ تھی۔ ان میں اندر گھستے ہی خیال آتا تھا کہ ان میں انسان لمحہ بھر بھی رہتا کس طرح ہو گا؟ ان مکانوں کے جھاڑ فانوس، تصاویر، دیوار گری، آئینہ اور شیشے کی الماریوں کو دیکھ کر مسرت کی بجائے پریشانی ہی ہوتی تھی۔ معمولی سانس تک کے لیے بھی معلوم ہوتا تھا کہ فرصت نہ ملے گی۔ بہت لوگوں کی مختلف طبائع اور مختلف پسند کے تحفے تحائف اس طرح غصا بٹھس ایک پر ایک بھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ کہہ دیکھتے ہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان محروم حیات تھکوں کی مانند ہی ان کے لانے والے بھی اس مکان کے اندر ایسی بھیڑ میں باہم دھکم پیل کر کے جدوجہد کر رہے ہیں۔ مگر اس مکان کے کسی بھی کمرے میں ضروری اشیاء کے علاوہ ایک بھی شے فالتو نظر نہ آئی۔ اور جو بھی شے نظر آئی وہ خود صاحب خانہ کے استعمال کے لیے لائی گئی ہے اور اس کی اپنی خواہش اور مزاج کی حد سے تجاوز کر کے جگہ گھیرے نہیں بیٹھی ہے۔ یہ بات بآسانی معلوم ہو گئی اور بھی ایک بات نے میری نگاہ کو کشش کیا۔ اتنی مشہور معروف ”بابائی جی“ کے گھر میں گانے بجانے کا کوئی انتظام بھی نہیں ہے۔ اس کمرے سے اس کمرے میں گھومتا ہوا دوسری منزل کے ایک کونے کے کمرے کے سامنے آ کر میں کھڑا ہو گیا۔ یہ بابائی جی کی ذاتی خوابگاہ ہے۔ اس کے اندر جھانکتے ہی معلوم ہو گیا لیکن میرے خیالی تصور کے ساتھ اس کی کتنی تفاوت تھی۔ جو کچھ سوچ رکھا تھا اس کمرے میں اس کا کچھ بھی نہ تھا۔ میز سفید پتھر کی تھی۔ دیواریں کچے دودھ کی طرح چھما رہی تھیں۔ کمرے کے ایک کنارے ایک چھوٹے سے تخت پر بستر بچھے تھے۔ ایک لکڑی کی الگنی پر کچھ کپڑے پڑے تھے۔ اور اس کے پیچھے ایک آہنی الماری تھی اور کہیں کچھ نہ تھا۔ جوتے پہنے ہوئے مجھے اندر داخل ہوتے بھی جھجک محسوس ہوئی انہیں چوکھٹ کے باہر کھول کر میں اندر داخل ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تھکاوٹ کی وجہ سے ہی اس کی تیج پر جا کر میں بیٹھ گیا تھا۔ اگر کمرے میں بیٹھنے کے قابل کوئی اور جگہ ہوتی تو میں اسی پر بیٹھتا۔ سامنے کی کھڑکی کو ایک بڑا سانسیم کا درخت ڈھانپ رہا تھا۔ اسی

میں سے چھن چھن کر ہوا آرہی تھی۔ اس طرف دیکھتے ہوئے میں کچھ ٹھوہو گیا تھا۔ ایک شیریں الفاظ سے چونک کر میں نے دیکھا۔ گن گن گانا گاتی گاتی پیاری کمرے میں گھس آئی ہے۔ وہ گنگا جی میں اشان کرنے کے لیے گئی تھی۔ اور اب وہاں سے لوٹ کر اپنے کمرے میں گیلے کپڑے اتارنے آئی ہے۔ اس لئے اس طرف ایک مرتبہ بھی نہ دیکھا۔ جب وہ سیدھی انگلی کے پاس جا کر سوکھے کپڑے ہاتھ ڈالنے لگی تو میں نے آواز دی۔ ”گھاٹ پر کپڑے لے کر کیوں نہیں جاتیں؟“

پیاری نے چونک کر ہنس دیا بولی۔ ”اِس چور کی طرح میرے کمرے میں گھسے بیٹھے ہو؟ نہیں نہیں، بیٹھے رہو۔ جاؤ مت، میں اس کمرے میں کپڑے بدل آتی ہوں۔“

اتنا کہہ کر وہ ہلکے قدموں دھوٹی ہاتھ میں لے کر باہر چلی گئی۔ پانچ ایک منٹ بعد وہ سرور چہرے سے لوٹ آئی اور ہنس کر بولی۔ ”میرے کمرے میں تو کچھ بھی نہیں تو کیا چرانے آئے ہو، بولو تو؟ مجھے تو چرانے نہیں آئے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”تم نے مجھے کیا اتنا احسان فراموش سمجھ رکھا ہے؟ تم نے میرے لیے اتنا کیا اور آخر کار میں تمہاری ہی چوری کروں گا۔ میں اتنا حریص نہیں ہوں۔“

پیاری کا چہرہ ادا اس ہو گیا۔ بولتے وقت میں نے یہ نہیں سوچا تھا۔ کہ اس بات سے اس کے دل کو ٹھیس پہنچے گی۔ اس کا دل دکھانے کا نہ تو میرا ارادہ تھا اور نہ المی خواہش کرنا قدرتی ہی تھا۔ خاص طور سے جبکہ میں نے دو ایک دن میں ہی وہاں سے رخصت ہونے کا ارادہ کر لیا تھا۔ گڑی ہوئی بات کو کسی طرح بنا لینے کی غرض سے میں نے زبردستی ہنس کر کہا۔ ”اپنی چیز کی بھی کیا کوئی چوری کرنے جاتا ہے۔ مجھ میں اتنی بھی عقل نہیں ہے؟“

لیکن اتنی آسانی سے اس کو دھوکہ دیا نہ جا سکا۔ اس نے ادا اس چہرے سے کہا۔ ”تمہیں اور زیادہ ممنون ہونے کی ضرورت نہیں۔ رحم کھا کر تم نے اس وقت جو اطلاع دے دی تھی۔ میرے لیے وہی بہت کافی ہے؟“

اس کے پاکیزہ اور خندہ چہرے کو اس گرمی سے روشن پر بھات کے وقت میں نے حزیں بنا دیا۔ یہ دیکھ کر دل میں ایک دود پیدا ہوا تھا۔ اس خفیف سی ہنسی میں جو ایک دلا ویزی تھی اس کے زائل ہوتے ہی نقصان کا اندازہ ہوا تھا۔ اسے واپس لانے کے ارادہ سے میں اسی وقت تاسفانہ لہجہ میں بول اٹھا۔ ”نانشی تم سے میرا کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ سب کچھ تو جانتی ہو۔ تم وہاں نہ ہوتیں۔ تو مجھے اسی ریت اور مٹی پر مرجانا پڑتا۔ کوئی اتنی دور جا کر ایک مرتبہ ہسپتال میں جانے کی بھی کوشش نہ کرتا۔ وہ بات جو تم نے اپنے خط میں لکھی تھی کہ سکھ کے دنوں میں نہ سہی تو دکھ کے دنوں میں مجھے یاد کر لینا۔ یہ بات میری

زندگی باقی تھی اس لیے یاد آگئی۔ میں اسے اچھی طرح محسوس کر رہا ہوں۔“

”کر رہے ہو۔“

”یقیناً“

”تو پھر کہو کہ میرے ہی لیے تم نے دوبارہ زندگی حاصل کی ہے؟“

”اس میں مجھے کوئی شک نہیں ہے۔“

”تو کیا میں اس پر دعویٰ کر سکتی ہوں؟“

”کر سکتی ہو لیکن میری زندگی اتنی حقیر ہے کہ اس پر تمہیں لالچ کرنا زیب نہیں دیتا۔“

پیاری نے اتنی دیر بعد قدرے ہنس کر کہا۔ ”یہ غنیمت ہے کہ اپنی قیمت کو اتنے دنوں میں تم نے سمجھ تو لیا۔“ مگر دوسرے ہی لمحہ بنجیدگی سے کہا۔ ”دل لگی رہنے دو۔ بیماری کا تو ایک طرح سے آرام ہو گیا۔ اب جانے کی کب سوچ رہے ہو؟“

میں اس کے اس سوال کو اچھی طرح سمجھ نہ سکا۔ میں نے بھی بنجیدگی سے جواب دیا۔

کہیں جانے کی تو مجھے جلدی ہے نہیں۔ اس لیے یہی سوچتا ہوں کہ چند دن اور ٹھہر جاؤں؟“

پیاری بولی۔ ”لیکن میرا لڑکا آج کل اکثر بائگی پورے آیا کرتا ہے۔ بہت دن ٹھہرے تو وہ شاید کچھ خیال کرنے لگے۔“

میں نے کہا۔ ”کرنے دو نا۔ اس سے ڈر کر تو کچھ جلتی نہیں تم؟ ایسا آرام چھوڑ کر یہاں سے جلد ہی تو میں کہیں جاتا نہیں۔“

پیاری نے فکر مند چہرے سے کہا۔ ”یہ بھی کہیں ہو سکتا ہے۔“ کہہ کر وہ یکا یک وہاں سے اٹھ کر چل دی۔

دوسرے دن شام کے وقت میں اپنے کمرے کی پچھتم کی طرف کے برآمدے میں ایک آرام کرسی پر لیٹا ہوا غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت بنکو آ پہنچا۔ ابھی تک اس کے ساتھ اچھی طرح کھل کر بات چیت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایک کرسی پر بیٹھے کا اشارہ کر کے میں نے کہا۔ ”بنکو کیا پڑھتے ہو تم؟“

لڑکا نہایت سیدھا سادہ اور نیک تھا بولا۔ ”گذشتہ سال میں نے انٹرنس پاس کیا ہے“

”تو اب بائگی پور کالج میں پڑھتے ہو؟“

”جی ہاں“

”تم کتنے بھائی بہن ہو؟“

مارے کسی نے پانی چھو نہیں۔ لیکن اب چھوٹی ذات کے سب لوگ لیتے ہیں اور پیتے ہیں۔ برہمن اور کاستھ بھی جیت بیسا کھ کے مہینے میں چھپ چھپا کر پانی لے جاتے ہیں لیکن پھر بھی انہوں نے تالاب کی پر تشھا ہونے نہیں دی۔ یہ بات کیا ماں کے لئے کم تکلیف کی بات ہے؟“

میں نے کہا: اپنی ناک کاٹ کر غیر کی بد شکوئی کرنا، جو کھاوت سنی جاتی ہے وہ یہی ہے؟
بنکو زور سے بول اٹھا: ”ٹھیک یہی بات ہے۔ ایسے گاؤں میں علیحدہ ایک گھر میں رہنا بد دعا ہوتے ہوئے بھی دعا کی طرح ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟“ جواب میں میں نے بھی صرف ہنس کر سر ہلا دیا۔ ہاں یا نہیں، صاف طور پر کچھ بھی نہ کہنا لیکن اس سے بنکو کے جوش میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں نے دیکھا کہ لڑکا اپنی اس ماں کو بچ بچ ہی پیار کرتا ہے۔ معقول سننے والا ملنے پر عقیدت کے جوش میں وہ دیکھتے دیکھتے پاگل ہوا تھا۔ اس کی بہیم ثنا خوانی نے مجھے تقریباً بے صبر بنا دیا۔

ناگاہ اسے ہوش آیا کہ اتنی دیر میں میں نے اس کی ایک بات میں ساتھ نہیں دیا تو وہ کچھ متفکر سا ہو کر کسی طرح سلسلہ کو دوبارہ دینے کی غرض سے بولا: ”آپ ہاں اور بھی کچھ دن ہیں نا؟“

میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”نہیں کل صبح چلا جاؤں گا۔“

”کل ہی“

”ہاں کل ہی“

”لیکن آپ کا جسم تو ابھی تک کمزور رہی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بیماری یکبارگی چلی گئی؟“ میں نے کہا: ”جنگ تو میں یہی سمجھتا تھا کہ بیماری چلی گئی، لیکن اب سوچتا ہوں کہ نہیں،

آج دوپہر سے ہی میرا سر درد کر رہا ہے؟“

”تو پھر کیوں اتنی جلدی جارہے ہو۔ یہاں تو آپ کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہے۔“ اتنا کہہ

کر وہ لڑکا فکر مند چہرے سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے بھی کچھ دیر خاموش رہ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے اندر دنی جذبات کا جائزہ لینے کی کوشش کی جتنا بھی میں نے اسے پڑھا اس کی طرف سے حقیقت کو چھپانے کی کوئی بھی کوشش میں محسوس نہ کر سکا۔ اس لئے لڑکا ضرور شرمایا اور اس شرم کو ڈھانپنے کی بھی اس نے کوشش کی وہ بولا: ”آپ یہاں سے مت جائیے۔“

”کیوں نہ جاؤں۔“ بتاؤ

”آپ کی موجودگی میں ماں خوب سکون اور سکھ سے رہتی ہیں۔ یہ کہہ کر تو دیا لیکن اس کا چہرہ

سرخ ہوا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کر چل دیا۔ میں نے دیکھا، لڑکا نہایت بھولا اور معصوم مزاج کا ضرور ہے لیکن

”بھائی اور نہیں ہے، چار بہنیں ہیں۔“

”ان کی شادی ہو گئی؟“

”جی ہاں، ماں نے ہی ان کی شادیاں کی ہیں۔“

”تمہاری اپنی ماں زندہ ہے؟“

”جی ہاں وہ دلہن کے مکان میں رہتی ہیں۔“

”تمہاری یہ ماں، کبھی دلہن کے مکان میں گئی ہیں؟“

”بہت مرتبہ، ابھی تو پانچ چھ مہینے ہوئے آئی ہیں۔“

”اس پر وہاں کوئی گڑبڑی نہیں مچتی؟“

بنکو کچھ دیر خاموش رہ کر بولا: ”مچتی رہے، ہم لوگوں کو ذات برادری سے علیحدہ کر رکھا

ہے۔ تو کیا ہم اس ذرے اپنی ماں کو چھوڑ سکتے ہیں اور ایسی ماں بھی کتنے لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔“

منہ میں آیا کہ پوچھوں۔ ”ماں پر اتنی عقیدت ہوئی کیسے؟“ لیکن دبا گیا۔ بنکو کہنے لگا۔ ”اچھا

آپ ہی بتائیے کہ گانے بجانے میں کیا کوئی برائی ہے۔ ہماری ماں محض وہی کرتی ہے کچھ غیروں کی

غیبت با برائی چرچا تو کرتی نہیں۔ بلکہ گاؤں میں جو لوگ ہمارے کٹر مخالف ہیں ان کے آٹھ دس لڑکوں کو

پڑھائی لکھائی کا خرچ دیتی ہیں۔ سردیوں کے موسم میں کتنے ہی لوگوں میں کپڑے تقسیم کرتی ہیں۔ کبیل

دیتی ہیں۔ یہ کیا برائی کرتی ہیں؟“

میں نے کہا: ”نہیں یہ تو بہت ہی نیک کام ہے۔“

بنکو نے استقلال سے کہا: ”تو کہیے کہ ہمارے گاؤں کی طرح پاجی گاؤں کیا اور کوئی ہوگا۔

یہی دیکھو نا، اس سال اینٹ پکوا کر ہم لوگوں نے مکان بنوایا۔ گاؤں میں پانی کی قلت اور تکلیف کو مد نظر

رکھ کر میری ماں موسیٰ سے بولیں: ”جیجی اور کچھ روپے خرچ کر کے اینٹ پکانے کے بھٹے کی جگہ ہی

ایک تالاب بنوایا جائے۔ تین چار ہزار روپے خرچ کر کے تالاب بنوایا۔ گھاٹ بھی بندھو دیا۔ لیکن

گاؤں کے لوگوں نے ماں کو اس تالاب کی پر تشھا (رسم افتتاحی) نہ کرنے دی۔ ایسا عمدہ پانی مگر کوئی پیتا

نہیں، کوئی چھوٹا نہیں۔ ایسے بد ذات آدمی ہیں۔ صرف اسی حسد کے مارے سب لوگ مرے جارہے

ہیں کہ ہمارا مکان پختہ بن گیا۔ آپ سمجھتے نا؟“

میں نے حیرت سے کہا: ”کہتے کیا ہو جی۔ پانی کی اتنی سخت تکلیف کو برداشت کرتے ہیں

لیکن ایسا عمدہ پانی پیتے نہیں۔“

بنکو نے ذرا ہنس کر کہا: ”وہی تو، مگر یہ کیا زیادہ دیر تک چل سکتا ہے؟ پہلے سال تو ڈر کے

لیکن یہ تمہاری بھول ہے۔ سرد یا گرم کوئی بھی ہوا نہیں چل رہی ہے۔“
راج لکشی بولی..... ”میری تو سب بھول ہی بھول ہے لیکن سرد در در رہا ہے یہ تو میری بھول نہیں ہے۔ یہ تو بچ ہے نا؟ کمرے میں جا کر تھوڑی دیر سو رہو۔ رتن کیا کرتا ہے۔ وہ کیا تھوڑا سا ”اوڑ کولون“ سریل نہیں لگا سکتا؟ اس گھر کے نوکر چا کروں کی طرح نواب نوکر دنیا بھر میں اور کہیں ہیں۔“ اتنا کہہ کر راج لکشی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

رتن جب گھبرا کر اور قدرے شرمسار ہو کر ”اوڑ کولون“ پانی وغیرہ لے کر حاضر ہوا اور اپنی غلطی کے لیے بار بار افسوس ظاہر کرنے لگا تو مجھ کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ رتن نے کچھ حوصلہ پا کر آہستہ آہستہ کہا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے بابو جی، اتنا بھی میں کیا نہیں جانتا؟ لیکن ماں سے یہ کہنے کا چارہ نہیں کہ جب تمہیں غصہ آتا ہے تو جھوٹ موٹ ہی گھر بھر کے لوگوں پر الزام لگانا شروع کر دیتی ہو۔“
بے قرار ہو کر میں پوچھ بیٹھا..... ”غصہ کیوں ہے؟“

رتن بولا..... ”یہ جاننے کا کوئی طریقہ نہیں؟ بڑے لوگوں کو غصہ، بابو جی، یونہی آ جاتا ہے اور یونہی چلا جاتا ہے۔ اس وقت اگر اپنا منہ چھپا کر نہ رہا جائے تو نوکر چا کروں کی جان گئی سمجھو۔“ دروازے کے سامنے سے کسی نے کہا..... ”پھر تو میں تمہارے سر کاٹ لیتی ہوں، کیوں رتن؟ اور پھر بڑے لوگوں کے گھر میں اگر اتنی مصیبت ہے تو پھر اور کہیں کیوں نہیں چلا جاتا؟“

مالک کے استفسار سے رتن شرمندہ ہو کر سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ راج لکشی نے کہا..... ”تیرا کام کیا ہے؟ ان کا سرد در کرتا ہے۔ بنکو کی زبانی سن کر میں نے تم سے کہا۔ اس لیے جب رات کے آٹھ بجے یہاں آ کر میری تعریف کر رہا ہے۔ کل سے کہیں اور نوکر کی تلاش کر لینا..... اب یہاں کام نہیں ہے سمجھا؟“

راج لکشی کے چلے جانے پر رتن، اوڑ کولون، پانی ملا کر میرے سر پر رکھ کر ہوا کرنے لگا۔ راج لکشی نے اسی لمحہ لوٹ کر پوچھا..... ”کیا کل صبح ہی گھر جاؤ گے؟“ میرا جانے کا ارادہ ضرور تھا، لیکن گھر لوٹ جانے کا نہیں۔ اس لیے سوال کا جواب میں نے اور ہی طرح سے دیا۔

”ہاں کل صبح ہی جاؤں گا۔“

”صبح کتنے بجے کی گاڑی سے جاؤ گے؟“

”صبح ہی نکل پڑوں گا۔ پھر جو بھی گاڑی مل جائے۔“

”اچھا نہ ہو تو ٹائم ٹیبل کے لیے کسی کو اسٹیشن بھیج دیتی ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔ اس کے بعد رتن بروقت کام ختم کر کے چلا گیا۔ نیچے جے نوکر چا کروں کے بولنے کی آواز آنا بند ہو گئی۔ میں نے

بے وقوف نہیں ہے۔ پیاری نے کہا تھا کہ ”اور زیادہ دن ٹھہرو گے تو میرا لڑکا کیا خیال کرے گا؟“ اس بات کے ساتھ اس لڑکے کے رویہ کا مقابلہ کرنے کا مطلب بھی گویا میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ اور ماں کے احترام کی ایک نئی تصویر کو دیکھ کر ایک نیا تجربہ ہوا۔ پیاری کے دل کی یکسوئی کا اندازہ کرنا ہمارے لیے مشکل نہیں اور وہ اس لامحدودت کائنات میں ہر طرف سے آزاد ہے۔ یہ تصور کر لینا بھی میری رائے میں کوئی گناہ نہیں تاہم اس نے جس ساعت سے ایک غریب لڑکے کی ماں بننا بخوشی تمام منظور کیا ہے اسی وقت سے اس نے اپنے دونوں پاؤں کو آہنی زنجیروں سے جکڑ لیا ہے۔ وہ خود خواہ جو بھی ہو لیکن اسے اپنے تئیں ماں کے احترام کا ثبوت تو اب دنیا کو دینا ہی ہو گا۔ اس کی دلی آرزوئیں، ہنسی کاوشیں اسے خواہ گراوٹ کی طرف کیوں نہ دھکیلنا چاہیں لیکن یہ بات بھی تو اسے فراموش نہیں ہو سکتی کہ وہ ایک لڑکے کی ماں ہے اور اس اولاد کی عقیدت بھری نگاہ کے سامنے تو وہ اس ماں کو کسی طرح بھی بے عزت نہ ہونے دے گی۔ اس کے بے قرار شباب کی پر کیف بہار کے ایام میں پیار کے ساتھ کس نے اس کا نام پیاری رکھا تھا۔ یہ تو میں نہیں جانتا لیکن یہ نام بھی وہ اپنے لڑکے کے سامنے چھپا رکھنا چاہتی ہے۔ یہ بات مجھے یاد آ گئی۔ دیکھتے دیکھتے آفتاب غروب ہو گیا۔ اس طرف تاکتے ہوئے میرا تمام دل پھل کر سرخ ہو اٹھا۔ دل ہی دل میں کہا کہ راج لکشی کو اب تو میں نیچی نظروں سے دیکھ نہیں سکتا۔ ہم دونوں کا ظاہر برتاؤ اتنے دنوں تک خواہ کتنی ہی ظاہر واری کی حفاظت کرتے ہوئے کیوں نہ گزرا ہو، ہماری محبت خواہ کتنا ہی کیف کیوں نہ ہو برسا ئے لیکن اس میں بھی تو کوئی گنجائش نہیں کہ ہم دونوں کے ارمان باہم ایک جا اکٹھے ہونے کے لیے ہر گھڑی ایک دوسرے کی طرف نہایت سرعت سے دوڑ رہے ہیں۔ مگر آج میں نے دیکھا کہ یہ ناممکن ہے۔ ناگہاں بنکو کی ماں، فلک بوس ہمالیہ کی طرح راستہ روک کر راج لکشی اور میرے درمیان آ کھڑی ہے۔ دل ہی دل میں میں نے کہا کل صبح ہی تو میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دل میں نفع اور نقصان کا حساب لگاتے ہوئے کچھ جمع رکھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ میری یہ دعا آخری دعا ہی ہو۔ دیکھ نہ سکتے کا بہانہ کر کے ایک لطیف جذبے کا بندھن میں یہاں نہ چھوڑ جاؤں جس کا سہارا لے کر پھر کبھی مجھے یہاں آنا پڑے۔

ہم تنخواہی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ شام کو دھوپ دانی ڈال کر اسے اپنے ہاتھوں میں لئے راج لکشی اسی برآمدے میں سے ایک کمرے میں جا رہی تھی کہ دفعۃً چونک کر کھڑی ہو گئی اور بولی..... ”سر در در رہا ہے۔ اس میں کیوں بیٹھے ہو؟ کمرے میں جاؤ۔“

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا..... ”لا جواب کر دیا تم نے لکشی، اس کہاں ہے؟“

راج لکشی بولی..... ”اوس نہ سہی، سرد ہوا تو چل رہی ہے۔ وہ کیا اچھی ہوتی ہے؟“

لیے مجھے راج لکشمی کو چھوڑ جانا پڑے گا۔ اس میں اب پس و پیش کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔
دل ہی دل میں سوچ کر دیکھا کہ اس نے اپنی گہکار زندگی کے بد نما داغوں کو بہت کچھ دھو کر
صاف کر ڈالا ہے۔ آج لا تعداد لڑکے بچے ماں ماں کہتے ہوئے اسے چاروں طرف سے گھیرے کھڑے
ہیں۔ اس عقیدت اور پیار کی مسرت سے بھر پور مقام سے اسے بے عزتی کے ساتھ چھین کر باہر نکال
لاؤں۔ اتنے عظیم پیار کی کیا یہی آخری نشانی میری زندگی میں مرقوم ہے۔

پیاری نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا..... ”اس وقت طبیعت کیسی ہے؟“

میں بولا..... ”ایسی کچھ خاص خراب نہیں ہے۔ جاسکوں گا۔“

”نہیں آج تو جانا ہی چاہئے۔“

”تو پھر گھر پہنچتے ہی خبر دینا۔ ورنہ ہم لوگوں کو بہت تشویش رہے گی۔“

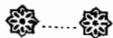
اس کے بے پناہ استقلال کو دیکھ کر میں فریفتہ ہوا تھا۔ اسی لمحہ بولا ”اچھا میں گھر ہی جاؤں گا
اور پہنچتے ہی تمہیں اطلاع دوں گا۔“

پیاری نے کہا..... ”ضرور دینا۔ میں بھی خط لکھ کر تم سے ایک دو باتیں دریافت کروں گی۔“

جب میں باہر پالکی میں بیٹھنے جا رہا تھا تو دیکھا کہ دوسری منزل کے برآمدے میں پیاری
چپ چاپ کھڑی ہے۔ اس کے سینے کے اندر کیا ہو رہا ہے اس کا چہرہ دیکھ کر میں جان نہ سکا۔

مجھے اپنی ان دانجیبی کی یاد آگئی۔ بہت عرصہ پہلے ایک آخری دنوں بھی بالکل ایسی ہی سنجیدہ
ایسی ہی خاموش کھڑی تھیں۔ اس وقت کی ان کی دونوں دردمیری آنکھوں کا نگاہوں کو تو میں آج تک بھی
نہیں بھولا۔ لیکن اس نظر میں قریبی جدائی کی کتنی بڑی بے تابی ظاہر ہو رہی تھی۔ یہ میں اس وقت سمجھ نہ
سکا۔ کیا جو آج بھی ان دو کالی آنکھوں میں اس طرح کا کچھ ہے یا نہیں۔

آہ بھر کر میں پالکی میں جا بیٹھا۔ دیکھا محبت صرف پاس ہی نہیں کھینچتی دور بھی دھکیل دیتی ہے۔
چھوٹی موٹی محبت کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ عیش و نشاط سے معمور اس رشک فردوس سے مجھے، میری بہتری
کے لیے میری بہبودی کے لیے ایک قدم بھی آگے بڑھانے دیتی۔ کہار پالکی لے کر اسٹیشن کی طرف
جلدی سے چل دیئے۔ دل ہی دل میں بار بار یہی کہنے لگا کہ لکشمی غم مت کرنا یہ اچھا ہی ہوا کہ میں یہاں
سے چل دیا۔ تمہارا فرض اس زندگی میں ادا کرنے کی طاقت تو مجھ میں نہیں ہے لیکن جو زندگی تم نے عطا
کی ہے اس زندگی کا غلط استعمال کر کے تمہاری توہین نہ کروں گا..... تم سے دور رہتے ہوئے میں اس عہد
کو برقرار رکھوں گا۔



سمجھ لیا کہ سب لوگ سونے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

لیکن مجھے کسی طور نیند نہ آئی۔ گھوم پھر کر صرف ایک ہی بات بار بار دل میں آنے لگی کہ پیاری
ناراض کیوں ہو گئی ہے ایسا میں نے کیا کیا ہے جس سے وہ مجھے روانہ کرنے کے لیے بے صبر ہو اٹھی ہے۔
رتن نے کہا تھا کہ بڑا آدمیوں کو غصہ یونہی آ جایا کرتا ہے یہ بات اور بڑے آدمیوں کے متعلق خواہ ٹھیک
ہے یا نہیں یہ تو معلوم نہیں لیکن پیاری کے متعلق کسی طرح بھی ٹھیک نہیں اترتی۔ وہ تو نہایت نفس کش اور
دانا عورت ہے۔

اس کا مجھے کئی بار تجربہ ہو چکا ہے اور مجھ میں خواہ اور کوئی عقل نہ ہو لیکن ضبط کے معاملہ میں ان
سے کم نہیں ہوں اور میرا تو خیال ہے کہ کسی سے بھی کم نہیں ہوں۔ میرے دل میں خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو
اسے زبان سے نکالنا نہایت سخت قسم کی بے ہوشی میں بھی میرے لیے ممکن نہیں۔ خود اس کے کسی فعل سے
مجھے شرم محسوس ہوئی ہو یہ علیحدہ بات ہے لیکن اس کو مجھ پر غصہ ہونے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی۔ اس لئے دواغ
کے وقت اس کی یہ بے اعتنائی مجھے ناقابل برداشت معلوم ہوئی۔

☆☆☆

بہت رات گزر جانے پر یکا یک نیند چٹ گئی اور میں نے آنکھ کھول کر دیکھا کہ راج لکشمی
چپ چاپ کمرے میں آئی اور میز کا لیپ بجا کر اسے دروازے کے کونے کی آڑ میں رکھ دیا۔ کھڑکی کھلی
ہوئی تھی۔ اسے بند کر کے میری چار پائی کے نزدیک آ کر آن واحد کے لیے چپ کھڑی رہ کر اس نے
کچھ سوچا۔ اس کے بعد سمہری کے اندر ہاتھ ڈال کر اس نے پہلے میرے سر کا بخار دیکھا پھر کرتے کے مٹن
کھول کر چھاتی کے بخار کو بار بار دیکھنے لگی۔ خلوت میں آنے والی عورت کے اس پوشیدہ لمس سے پہلے تو
میں کچھ شرمندہ سا ہوا لیکن اسی وقت دل میں آیا کہ مرض کی بے ہوشی کے دوران میں تیمارداری کر کے
جس نے زندگی کو واپس لا کر دیا تھا اس کے نزدیک مجھ سے شرم کرنے کی بات ہی کیا ہے؟ اس کے بعد
اس نے مٹن بند کر دیئے۔ اوڑھنے کا کپڑا اکھٹک گیا تھا۔ اسے گلے تک اوڑھا دیا اور بالآخر سمہری کے
کناروں کو اچھی طرح درست کر کے نہایت احتیاط کے ساتھ دروازہ بند کر کے وہ باہر چلی گئی۔

میں نے سب کچھ دیکھا اور سب کچھ سمجھا۔ جو چھپے چھپے آئی تھی اسے چھپے چھپے ہی جانے دیا
لیکن اس سناں آدھی رات کو وہ اپنا کتنا میرے پاس چھوڑ گئی۔ اس کا وہ کچھ بھی اندازہ نہ کر سکی۔ صبح جب
آنکھ کھلی تو بخار چڑھا ہوا تھا۔ آنکھیں اور منہ جل رہا تھا۔ سر اتنا بھاری تھا کہ بستر چھوڑتے مجھے کافی
تکلیف محسوس ہوئی۔ پھر بھی جانا ہی ہوگا۔ اس گھر میں اب مجھے اپنے آپ پر ذرا سا بھی اعتبار نہ تھا۔
نا معلوم وہ کس گھڑی دھوکہ دے جائے اور یہ خوف مجھے اپنے لئے اتنا زیادہ نہیں تھا لیکن راج لکشمی کے

ہاتھوں پر ہی اس دن اپنے لازوال اعتقاد کی تمام تر ذمہ داریاں سونپ دیتا تو آج مجھے فکر ہی کیا تھی؟ لیکن اب چھوڑے اس بات کو۔

راج لکشمی کو میں نے اپنی رسید کا خط لکھا تھا۔ اس خط کا جواب کافی دنوں بعد ملا۔ میرے کمزور اور مریض جسم پر غم اور ہمدردی کا اظہار کر کے گریہ سستی (خاندان) بننے کے لیے اس نے مجھے طرح طرح کی نصیحتیں کی تھیں اور اپنے مختصر خط کو یہ لکھ کر ختم کیا تھا کہ اگر وہ کام کاج کے جھٹکوں کی وجہ سے خط وغیرہ لکھنے کا موقع نہ پاسکے تو بھی میں گاہے گا ہے اپنی خیریت کی اطلاع اسے دیتا رہوں اور اسے اپنا ہی سمجھوں۔

دنیا کے تصور میں فردوس کے جو پھول جمع رکھے تھے وہ ہیں خشک ہو گئے اور جو دو ایک سوکھی پتھریاں ہوا سے جھڑ پڑیں۔ انہیں اکٹھا کر کے گھر لے جانے کے لئے بھی میں جگہ ٹھکانا نہیں پھرا۔ آنکھوں میں دو ایک بوند پانی آیا ہوئی مگر وہ مجھے یاد نہیں۔ تاہم یہ یاد ہے کہ اور زیادہ دن میں نے خواب دیکھتے ہوئے نہ کائے پھر بھی پانچ چھ مہینے اسی طرح بسر ہو گئے۔

ایک دن صبح باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک ایک عجیب وغریب خط آپہنچا۔ اوپر نوائی تحریر کے سے کچے الفاظ میں نام اور پتہ لکھا تھا۔ کھولتے ہی اندر سے ایک چھوٹا سا خط کھٹ سے زمین پر گر پڑا۔ اسے اٹھا کر اور اس کے الفاظ کی بناوٹ اور دستخط دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ ہوا۔ میری جو ماں دس سال قبل مر چکی تھیں۔ انہیں کے یہ دستخط تھے نام اور حروف کی بناوٹ بھی ان ہی کی تھی۔ پڑھ کر دیکھا۔ ماں نے اس خط میں اپنی گنگا جل کو ممکن الوقوع یقین دلایا تھا اور عہد کیا تھا۔ بات غالباً یہ تھی کہ بارہ تیرہ سال پہلے اس گنگا جل کے ہاں جب کافی زیادہ عمر میں ایک لڑکی پیدا ہوئی تو پریشانی، گھبراہٹ، اور اپنی مشکلات بیان کر کے اس نے ماں کو خط لکھا ہوگا۔ اور اسی کے جواب میں انجمنی ماں نے اس گنگا جل کی لڑکی کے بیاہ کی تمام ذمہ داری لے کر جو خط لکھا تھا وہی یہ بیش قیمت دستاویز تھی۔ فوری دکھ اور ہمدردی کے جذبہ سے متاثر ہو کر ماں نے لکھا تھا کہ اگر کوئی قابل لڑکا نہ ملے تو پھر خود ان کا بیٹا تو ہے ہی، ٹھیک ہے، دنیا میں اگر قابل لڑکوں کا بالکل ہی فقدان ہو جائے تو پھر میں تو ہوں ہی۔ تمام خط اوپر سے نیچے تک دوبارہ پڑھ کر میں نے دیکھا کہ وہ منشیانہ طرز سے لکھا گیا ہے۔ ماں کو دلیل ہونا چاہئے تھا کیونکہ جس قدر بھی گنجائش کی وجوہات ہو سکتی تھیں ان سب کی راہ بند کر کے اپنے آپ کو اور اپنے نام لیا۔ کو باندھ گئی ہیں۔ اس سے بچنے کے لیے دستاویز میں کہیں ذرا سی بھی جگہ، ذرا سی بھی کمی چھوڑی نہیں گئی ہے۔

وہ خواہ جو بھی ہو لیکن مجھے ایسا معلوم تو نہ ہوا کہ گنگا جل، ان طویل تیرہ سالوں تک اس پختہ

اس بد نصیب زندگی کے جس باب کو اس دن راج لکشمی کے پاس آخری وداع کے وقت آنکھوں کے پانی میں ختم کر کے آیا تھا۔ یہ خیال نہیں تھا کہ اس ٹوٹے ہوئے سلسلہ کو از سر نو جوڑنے کے لیے پھر میری جلی ہوگی لیکن جب فی الحقیقت میری جلی ہوئی تو سمجھ لیا کہ حیرت اور تھک خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو لیکن اس دعوت کو سر تسلیم خم کر کے قبول کئے بغیر کام نہ چلے گا۔

اس لیے آج بھی میں اپنی ناکارہ زندگی کے منتشر واقعات کو سینکڑوں جگہ سے بکھری ہوئی باتوں کو پھر ایک بار باندھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

آج مجھے یاد آتا ہے کہ گھر لوٹ آنے کے بعد میری رنج و راحت سے ملی جلی زندگی کو کس نے ایک ایک کاٹ کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس وقت خیال ہوا تھا کہ میری اس زندگی کے دکھوں کا بوجھ صرف میرا ہی نہیں ہے۔ اس بوجھ کو لا کر تو وہ گھوٹے جس کو اس کی خاص غرض ہو۔ یعنی میں ترس کھا کر اگر بچ گیا تو یہ راج لکشمی کی خوش نصیبی ہے۔ آسمان کا رنگ کچھ اور ہی نظر آنے لگا تھا۔ ہوا کا لمس کچھ اور ہی قسم کا معلوم ہونے لگا تھا۔

گویا اب اپنا پرایا، گھر بار کہیں بھی اپنا کوئی نہ رہا۔ اس قسم کی ایک بے لطفی اندر باہر محیط ہو رہی تھی۔ کائنات میں گھورتے ہوئے، کہیں کچھ کرتے ہوئے پس و پیش یا جھجک کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔

یہ سب گزرے ہوئے زمانہ کی باتیں ہیں۔ وہ مسرت اب کہاں ہے؟ لیکن اس دن دل کی ظلوٹوں میں پوشیدہ اس مسرت انگیز کیف سے زندگی میں ایک دن کے لیے لطف اندوز ہو سکا۔ یہی میرے لئے سب سے بڑی خوشی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ میں نے اسے کھو دیا۔ اس کا بھی مجھے کسی دن غم نہ ہوا محض یہی بات گاہے بگاہے یاد آتی ہے کہ جس طاقت نے اس وقت دل کے اندر بیدار ہو کر اتنی جلد دنیا بھر کی بے لطفی کے اثر کو زائل کر دیا تھا وہ کتنی عظیم طاقت ہے۔ اور سوچتا ہوں کہ اس دن اپنی ہی طرح دوسرے دو کمزور اور خالی ہاتھوں پر اپنا بڑا آہم بار نہ ڈال کر اگر میں تمام مخلوق کی حفاظت کرنے والے ان

ایک انسان دوسرے انسان سے جتنی قسم کی بھی جرح کر سکتا ہے ان میں سے کسی بھی قسم کی جرح سے گنگا جل ماں نے مجھے نہ چھوڑا اور بالآخر اپنی لڑکی کے قابل در کے نقطہ نظر سے مجھے نجات دے دی۔ اور اس کے متعلق میں ایک طرح سے مطمئن ہو گیا۔ لیکن رات کو کھانا کھاتے وقت ان کی تمہید کا جھکاؤ دیکھ کر میں بے صبر ہوا تھا۔ دیکھا کہ مجھے ہاتھ سے بالکل چھوڑ دینے کی ان کی خواہش نہیں انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ لڑکی کی قسمت میں سکھ نہ ہو تو دھن دولت، گھریار، عزت آبرو کتنا ہی کیوں نہ دیکھا جائے سب بیکار ہے اور اس سلسلہ میں نام اور مقام دے کر تفصیل کے ساتھ بہت سی قابل اعتبار مثالیں دے کر انہوں نے اس بات کو ثابت بھی کر دکھایا، اتنا ہی نہیں اس کے برعکس ایسے بھی کتنے ہی لوگوں کا ذکر کیا کہ جو قابل مطلق ہوتے ہوئے بھی محض بیوی کی خوش نصیبی کی بدولت اس وقت دولت کے انبار پر دن رات بیٹھے رہتے ہیں۔

میں نے التجا آمیز لہجہ میں کہہ دیا کہ روپے پیسے کی طرف میری رغبت تو ہے تاہم مجھے یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ چوبیسوں گھنٹے ان پر بیٹھا ہوں۔ اور اس کے لیے بیوی کی خوش نصیبی آزمانے کو بے قراری بھی نہیں لیکن اس کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ انہیں میں قائل نہ کر سکا کیونکہ جو عورت تیرہ سال کی طویل اور صبر آزمائیت کے بعد بھی ایک خط کو دستاویز کی شکل میں پیش کر سکتی ہے اسے اتنی آسانی سے بھلایا نہیں جاسکتا۔ وہ بار بار کہنے لگیں کہ اس کو ماں کے قرض کی شکل میں قبول کرنا ہی مناسب ہے اور جو اولاد قابل ہوتے ہوئے بھی والدین کا قرض ادا نہیں کرتی وہ وغیرہ وغیرہ۔

جب میں بہت متفکر اور بے قرار ہوا تھا تو باتوں ہی باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ قریب کے گاؤں میں اگرچہ ایک قابل لڑکا ہے لیکن پانچ سو سے کم روپے میں اس کا ملنا مشکل ہے۔ دھندلی سی امید کی ایک کرن نظر آئی۔ مہینے کے بعد جس طرح بھی ممکن ہوا کوئی چارہ کروں گا۔ یہ وعدہ کر کے میں دوسرے ہی دن وہاں سے چل دیا لیکن چارہ کیا کروں گا کسی طرف بھی اس کا کوئی کنارہ نظر نہ آیا۔

میں کئی طرح سے اپنے آپ کو سمجھانے لگا کہ اس طرح زبردستی لدا ہوا بوجھ میرے لیے کوئی حقیقی بوجھ نہیں ہو سکتا لیکن پھر بھی ماں کو اپنے کئے ہوئے عہد سے آزاد کئے بغیر چپ چاپ کھٹک جانے کا مجھے کسی طرح خیال بھی نہ آ سکا۔

شاید ایک چارہ کار تھا۔ میں یہ بات پیاری سے کہوں لیکن کئی دنوں تک میں خود اس کے متعلق اپنے دل کو مستحکم نہ کر سکا۔ ایک عرصہ سے اس کی کوئی اطلاع بھی نہ ملی تھی۔ رسید کی اس اطلاع کے علاوہ میں نے اسے اور کوئی خط بھی نہ لکھا تھا۔ اس نے بھی اس کے جواب کے سوا دوسرا خط نہ لکھا۔ اس

دستاویز کے بھروسہ پر ہی بے خوف ہو کر بیٹھی رہی ہے لیکن اس کے بالکل برعکس جب مجھے یہ محسوس ہوا کہ کافی کوشش کرنے کے باوجود بھی رویے اور اپنے نئی آدمیوں کی کمی کے باعث کوئی قابل لڑکا ملنا اسے مشکل ہو گیا اور کنواری لڑکی کی جسمانی ترقی کی طرف دیکھ کر ان کے دل کا خون دماغ میں چڑھنے کی تیاری کرنے لگا تو اس بد نصیب قابل لڑکے پر انہوں نے اپنا واحد برہم استر (حرہ) پھینکا ہے۔

ماں اگر زندہ ہوتیں تو اس خط کے لیے میں ان کا سر کھا جاتا۔ تو آج ان کے پاؤں کے تلوؤں پر زور سے سر پٹک کر اپنے دل کے شعلوں کو ٹھنڈا کروں۔ یہ راستہ بھی میرے لیے بند ہے۔

اس لیے ماں کے لیے تو میں کچھ بھی کر نہ سکا مگر اب ان کے گنگا جل کے لیے بھی کچھ کر سکتا ہوں یا نہیں اس کی آزمائش کرنے کے لیے میں ایک دن رات کو اسٹیشن پر جا پہنچا۔ تمارات ٹرین میں گزار کر دوسرے دن جب ان کے گاؤں کے مکان پر پہنچا تو دن ڈھل چکا تھا۔ گنگا جل ماں پہلے تو مجھے پہچان نہ سکیں بالآخر میرا پتہ پا کر ان تیرہ سالوں کے بعد بھی وہ اس طرح رو پڑیں جس طرح ماں کی موت کے وقت ان کا کوئی اپنا آدمی بھی آنکھوں کے سامنے ان کی موت ہوتے دیکھ کر بھی نہ رو سکا ہوتا۔

وہ بولیں کہ دنیاوی نقطہ نگاہ اور دھرم کے خیال سے دونوں ہی طرح اب میں تمہاری ماں کی طرح ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے ذمہ داری سنبھالنے کے پہلے زینہ کی شکل میں میری دنیاوی پوزیشن کی نہایت باریکی کے ساتھ چھان بین شروع کر دی۔ باپ کتنا چھوڑ گئے ہیں؟ ماں کے پاس کون کون سے زیور ہیں اور وہ کس کے پاس ہیں میں ملازمت کیوں نہیں کرتا اور اگر کروں تو اندازاً کتنی ماہوار مل سکتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان کی صورت دیکھ کر خیال ہوا کہ اس تحقیقات کا نتیجہ ان کے لیے قابل اطمینان نہیں نکلا۔ وہ بولیں کہ ان کا ایک رشتہ دار برہما میں نوکری کر کے مالا مال ہو گیا ہے۔ وہاں تو راہ گھاٹ میں دولت بکھری پڑی ہے۔ صرف سیٹھ کی ضرورت ہے۔ وہاں تو جہاز سے اترتے ہی بنگالیوں کو صاحب کدے پر اٹھالے جاتا ہیں اور نوکری پر لگا دیتے ہیں۔ اس قسم کی بہت سی باتیں کہیں بعد میں میں نے دیکھا کہ یہ غلط اندازہ محض اکیلے انہیں کا نہیں بلکہ بہت سے لوگ اس سراب میں پھنس کر نہایت سمیری کے عالم میں وہاں دوڑ گئے ہیں اور اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی انہیں واپس لوٹنے میں ہم لوگوں کو کم مصیبت برداشت کرنا نہیں پڑی لیکن اس ذکر کو اس وقت رہنے دیجئے۔ گنگا جل ماں کی زبانی برہما کا تذکرہ مجھے تیر کی طرح لگا۔ مالا مال ہونے کی امید سے نہیں بلکہ میرے اندر کچھ عرصہ سے جو گھمکو پن مخو خواب تھا وہ اپنی تھکاوٹ جھاڑ پونچھ کر آن واحد میں ہی لٹھ کھڑا ہوا۔ جس سمندر کو اس سے پہلے صرف دور سے کھڑے کھڑے دیکھ کر محسوس ہو جاتا تھا اس بحر بیکراں کا سینہ چیر کر میں جاسکوں گا۔ اس خواہش نے ہی مجھے یکبارگی بے قرار کر دیا۔ تو پھر کسی طرح ایک بار چھکارا حاصل کرنا ہی ہوگا۔

گیا کہ نغمہ کی محفل جمی ہوئی ہے۔ کچھ دیر کے لئے آرام لیا جا رہا ہے۔
مجھے دیکھتے ہی پیاری کے چہرے کا تمام خون گویا کہیں غائب ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے
زبردستی کچھ ہنس کر کہا..... ”یہ کیا شری کانت بابو! کب آئے؟“
”آج ہی“

”آج ہی؟ کب؟ کہاں ٹھہرے ہیں؟“

لحہ بھر کے لیے شاید میں ہوش و حواس گم کر بیٹھا تھا اور نہ جواب میں اتنی تاخیر نہ ہوتی لیکن اپنے
آپ کو سنبھالنے میں بھی مجھے دیر نہ لگی۔ میں نے کہا..... ”یہاں کے سب لوگوں کو تو تم پہچانتی نہیں ہو اس
لئے نام سن کر بھی تم کیا پہچان سکو گی؟“

جو صاحب سب سے زیادہ بے ٹخنے بیٹھے تھے وہی شاید اس محفل کی روح رواج تھے
بولے..... ”آئیے بابو جی، بیٹھے، اتنا کہہ کر اور ہونٹوں کو دبا کر وہ ذرا سا ہنسنے اپنے اشاروں اور کناہیہ سے
انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ ہم دونوں کا تعلق وہ بخوبی طور پر تازہ گئے ہیں۔ احترام کے ساتھ انہیں مخاطب
کر کے میں نے جوتے کے فیتے کھولنے کے بہانے سر نیچا کر کے موقع اور حالات کا جائزہ لینا چاہا۔ غور
کرنے کے لیے زیادہ وقت نہ تھا۔ تاہم ان تھوڑے سے لمحوں میں میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ول کے اندر
خواہ کچھ بھی ہو، ظاہر برتاؤ سے وہ کسی طرح بھی ظاہر نہ ہونا چاہیے۔ میری گفتگو سے، میری آنکھوں کی
چوتون سے میرے تمام برتاؤ کے کسی بھی سوراخ سے میری دلی پریشانی یا افتخار کی ایک بوند بھی باہر آ کر نہ
گرنی چاہیے۔ آن واحد کے بعد جب میں سب کے درمیان جا کر بیٹھا تو اگرچہ یہ سچ ہے کہ اپنے چہرہ کو
خود اپنی آنکھوں کو دیکھ نہ سکا لیکن اندر ہی اندر میں نے محسوس کیا اب اس پر ناراضگی کا ذرہ سا بھی نشان
باقی نہیں رہا۔ راج کشمیشی کی طرف دیکھ کر میں ہنستے ہوئے بولا..... ”بابی جی، اگر آج کہیں سے سکھ
یونی کا پتہ پا جا تا تو انہیں تمہارے سامنے بیٹھا کر ایک دفعہ ان کے من کے سکون کی اتھا ضرور لیتا۔ ارے
یہ کیا کیا ہے۔ حسن و جمال کا ایک سمندر ہی بہا دیا ہے۔“

تقریب سن کر وہ حضرت مسرور ہو کر سر ہلانے لگے۔ وہ پر نیا ضلع کے رہنے والے تھے۔ میں
نے دیکھا کہ بول نہ سکنے کے باوجود بھی وہ بنگالی اچھی طرح سمجھ سکتے تھے۔

لیکن پیاری کے کان تک سرخ ہوا ٹھٹھے اور مجھے یہ سمجھنا بھی باقی نہ رہا کہ سب کچھ شرم و حیا
کے مارے نہیں بلکہ غصے کی وجہ سے ہی ہوا ہے مگر اس طرف نگاہ کئے بغیر میں نے بابو صاحب کو مخاطب کر
کے کہا..... ”میرے آنے کی وجہ سے آپ لوگوں کے شغل و تفریح میں کسی طرح کی رکاوٹ ہو گی تو مجھے
نہایت افسوس ہو گا تو مجھے نہایت افسوس ہو گا رقص و فنہ چلنے دیجئے۔“

بات کو شاید وہ تسلیم نہ کرتی تھی کہ خط و کتابت کے ذریعے بھی دونوں کے درمیان ملاپ، کا یہ ایک رشتہ
قائم رہتا ہے کم از کم اس کے اس خط سے تو میں یہی سمجھا لیکن تعجب کی بات ہے کہ دوسرے کی لڑکی کے
لیے بھیک مانگنے کے بہانہ ایک دن میں کچ کچ پٹنے جا پہنچا۔

☆☆☆

مکان میں داخل ہوتے ہی چلی منزل کی بیٹھک کے برآمدہ میں میں نے دیکھا کہ وردی پہنے
دو دربان بیٹھے ہیں۔ وہ یکا یک ایک عام اور اجنبی انسان کو دیکھ کر کچھ اس طرح دیکھتے رہ گئے کہ مجھے بلا
جھجک اوپر چڑھ جانے کا حوصلہ نہ ہوا میں نے ان دربانوں کو پہلے نہیں دیکھا تھا۔ پیاری کے قدم اور
بوڑھے دربان کی جگہ ان دو اور دربانوں کی کیا ضرورت لاحق ہو گئی۔ یہ میں سوچ نہ سکا۔ جو بھی ہوان کی
پرواہ نے بغیر اوپر چلا جاؤں یا التجا کے ساتھ ان کی اجازت طلب کرو..... یہ فیصلہ کرنے سے پیشتر ہی میں
نے دیکھا کہ رتن گھبرا کر نیچے اتر رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ پہلے تو حیرت زدہ ہو کر خاموش ہو گیا لیکن بعد
میں پاؤں کی طرف جھک کر پر نام کر کے بولا..... ”آپ کب آئے؟ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟“

”ابھی آ رہا ہوں۔ سب خیریت ہے نا؟“

رتن سر ہلا کر بولا..... ”خیریت ہے بابو! اوپر چلیے..... میں برف خرید کر ابھی آیا۔“ کہہ کر وہ

جانے لگا۔

”تمہاری مالکن اوپر ہی ہیں؟“

”ہاں ہیں۔“ کہہ کر وہ جلدی سے باہر چلا گیا۔

اوپر چڑھتے ہی بغل میں جو کمرہ ملتا ہے وہ نشست گاہ ہے۔ اندر سے ایک زور دار ہنسی اور
بہت سے لوگوں کی آواز سنائی دی۔ میں قدرے حیران ہوا مگر دوسرے ہی لمحہ دروازے کے نزدیک پہنچ
کر میں حواس باختہ ہوا تھا۔ پچھلی مرتبہ اس کمرے کو استعمال میں آتے نہ دیکھا تھا۔ اس کمرہ میں انواع و
اقسام کے ساز و سامان میز کرسی وغیرہ بے شمار چیزیں ایک کونے میں پڑی رہتی تھیں۔ اس کمرے میں
عموماً کوئی آتا بھی نہ تھا۔ آج دیکھتا ہوں تمام کمرے میں بستر ہے اس سرے سے دوسرے سرے تک
کارپٹ بچھا ہے اور اس پر سفید چاردر چک رہی ہے۔ تکیوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں اور ان کے
سہارے بیٹھے ہوئے معزز انسان میری طرف غور سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کے لباس میں بنگالیوں کی
طرح دھوتی ہونے پر بھی سر کی تیل بوٹے دار نوپلی سے وہ بہاری سے ہی معلوم ہوتے تھے۔ طبلے کی
جوڑی کے پاس ایک ہندوستانی طبلوی تھا اور اس کے پاس ہی خود پیاری بائی تھیں۔ ایک طرف چھوٹا
بارمونم رکھا تھا۔ پیاری کے جسم پر اگرچہ بھرے کی پوشاک نہ تھی۔ تاہم بناؤ سنگار میں کوئی کمی نہ تھی۔ سمجھ

بابو جی اس قدر مسرور ہوئے کہ جوش میں آ کر میری پیٹھ پر ایک دھول جما کر بولے۔
 ”بہت اچھا بابو!..... ہاں پیاری بی بی، ایک عمدہ سا گانا چلنے دو۔“
 ”شام کے بعد ہوگا..... بس اب اور انہیں۔“ یہ کہہ کر پیاری ہارمونیم کھسکا کر دفعۃً اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسی وقت بابو میرا تعارف حاصل کرنے کے لیے اپنا تعارف کرانے لگے۔ ان کا نام تھارام چندر سنگھ۔ وہ پرنیاضلع کے ایک زمین دار تھے۔ وہ بھنگر مہاراج ان کے نزدیکی ہیں۔ پیاری بی بی کو وہ سات اٹھ سال سے جانتے ہیں وہ ان کے پرنیاضلع کے مکان پر تین چار مرتبہ مجرا کر آئی ہیں۔ وہ خود بھی کئی مرتبہ گانے سننے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ کبھی کبھی دس بارہ دن تک بھی یہاں رہتے ہیں۔ تین مہینے پہلے ایک دفعہ آ کر وہ ایک ہفتہ تک یہاں رہ گئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ لیکن میرے کچھ جواب دینے سے پہلے ہی پیاری، وہاں آ موجود ہوئی۔ ان کی طرف دیکھ کر میں نے کہا..... ”بائی جی سے ہی پوچھئے نا کہ کیوں آیا ہوں؟“
 پیاری نے میرے چہرے پر ایک تیز وار کیا لیکن نہایت مطمئن لہجہ میں جواب دیا..... ”یہ ہمارے گاؤں کے ہیں۔“

میں نے ہنس کر کہا..... ”بابو جی، شہد ہو تو شہد کی کھیاں خود بخود آ کر جمع ہو جاتی ہیں۔ وہ دلش بدیش کی پرواہ نہیں کرتیں۔“ لیکن اتنا کہتے ہی میں نے دیکھا کہ اس راز کو قبول نہ کر سکنے کی وجہ سے پرنیاضلع کے زمین دار نے اپنا چہرہ بنجیدہ بنالیا ہے۔ اور ان کے نوکر نے جو نبی آ کر اطلاع دی کہ سندھیا پوجا کے لیے تیار ہو گئی ہے وہ وہاں سے اٹھ گئے۔ چلی اور دیگر دو اصحاب بھی ان کے ساتھ ہی باہر چلے گئے۔ ان کا دل کا ایک اتنا بے قرار کیوں ہوا تھا اسے میں بالکل ہی نہ جان سکا۔

رتن نے آ کر پوچھا..... ”ماں بابو جی کے لیے بچھو نے کہاں کرو؟“

پیاری نے جھنجھلا کر کہا..... ”کیا اور کوئی کمرہ نہیں ہے رتن؟ مجھ سے پوچھئے بغیر کیا اتنی سی عقل بھی تمہیں نہیں۔ چلا جا یہاں سے؟“ اتنا کہہ کر رتن کے ساتھ خود بھی باہر چلی گئی۔ میں نے خوب اچھی طرح سمجھا کہ میری بے موقعہ تشریف آوری سے اس گھر کا شیرازہ ہی منتشر ہو گیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد پیاری لوٹ آئی اور اس نے کچھ دیر تک میرے منہ کی طرف دیکھ کر کہا ”اچانک کس طرح آنا ہو گیا؟“

میں نے کہا..... ”تمہارے گاؤں کا آدمی ہوں۔ تمہیں بہت عرصہ سے دیکھ نہ سکنے کی وجہ سے بے صبر ہوا تھا بائی جی!“

پیاری کا منہ اور بھی بھاری ہو گیا۔ میرے اس مذاق میں شریک نہ ہو کر پوچھا..... ”آج

رات یہاں ہی رہو گے نا؟“

”رہنے کے لیے کہو گی تو رہ جاؤں گا۔“

”میرے کہنے نہ کہنے سے کیا؟ یہاں تمہیں شاید کچھ تکلیف ہو جس کمرے میں تم سوتے تھے

اس میں تو.....“

”بابو سوتے ہیں، ٹھیک ہے۔ میں نیچے سو جاؤں گا۔ تمہارے نیچے کا کمرہ تو بہت عمدہ ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہو، نیچے سوؤ گے؟ کیا تمہارے دل میں کچھ بھی پرہیز نہیں؟ وہ ہی دن میں

اتنے بڑے پرم ہنس کس طرح ہو گئے؟“

دل ہی دل میں کہا..... ”پیاری تم نے مجھے اب تک بھی نہ پہچانا“ پھر کہا..... ”اس میں مجھے

عزت بے عزتی کا خیال ذرہ بھر بھی نہیں ہے اور تکلیف کی بات کا اگر خیال کرو تو وہ بالکل ہی فضول ہے۔

میں گھر سے باہر نکلنے کے وقت کھانے سونے کے افکار کو بھی دور رکھ آتا ہوں۔ یہ تم بھی جانتی ہو۔ بستر

زیادہ ہوں تو ایک لے آنے کے لیے کہہ دو ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اپنے کمرے کا بھر دے

ہے۔

پیاری نے سر ہلا کر کہا..... ”یہ تو میں جانتی ہوں لیکن اس سے دل میں کسی قسم کا افسوس تو نہ ہو

گا؟“

میں نے ہنس کر جواب دیا..... ”نہیں، کیونکہ شیش پر پڑے رہنے کی نسبت تو یہ کہیں زیادہ اچھا

ہے۔“

پیاری کچھ دیر چپ کھڑی رہی پھر بولی..... ”تمہاری جگہ میں ہوتی تو کسی درخت کے نیچے سو

رہتی لیکن اتنی تو ہیں برداشت نہ کرتی۔“

اس کے اضطراب کو دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ کافی دیر سے میں خوب سمجھ رہا تھا۔ کہ وہ

میری زبان سے کیا سننا چاہتی ہے لیکن قدرتی اور پرسکون لہجہ میں میں نے جواب دیا..... ”میں اتنا بے

وقوف نہیں ہوں کہ اس بات کو دل میں جگہ دوں کہ تم دیدہ دانستہ مجھے نیچے سونے کے لیے کہہ کر میری تو

ہیں کر رہی ہو۔ اگر ممکن ہوتا تو تم اس دفعہ کی طرح بھی میرے سونے کا انتظام کرتی۔ جانے دو ان معمولی

باتوں پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم رتن کو بھیج دو کہ وہ مجھے نیچے کا کمرہ دکھا آئے میں کمرے کا

کمرہ ہوں گا۔ میں بہت زیادہ تھک گیا ہوں۔“

پیاری نے کہا..... ”تم گیانی آدمی ہو تم ہی میری اصلی پوزیشن کو نہ سمجھو گے تو اور جانے گا

کون؟ چلو بچ گئی۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک طویل آہ دبا کر پوچھا..... ”اچانک چلے آنے کی وجہ تو ابھی تک

باختہ ہو کر شروع شروع میں خود کی ساری برتاؤ کیوں نہ کیا ہو لیکن یہ بات بھی مجھ سے چھپی نہ رہی کہ میری اس افسردگی اور اداسی کا اندازہ کر کے وہ دل ہی دل میں متفکر ہوا ٹھہری تھی، اور یہ بھی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میرے اندر حسد کی آگ کو بھڑکانے کے لیے اتنی دیر سے بار بار وہ کیوں صدمہ پہنچا رہی تھی لیکن سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنے لا پرواہ مزاج کی مردانگی سمجھ کر میں نے اس کا غور و مٹی میں ملا دیا۔ اس کے ہر معمولی وار کو سونگنا زیادہ کر کے اسے واپس لوٹا دیا لیکن اب اس کے ساتھ کیا گیا میرا یہ سلوک خود مجھے تیز سوئی کی مانند چھینے لگا۔ میں بستر پر لیٹ گیا مگر سونہ سکا مجھے یقین تھا کہ وہ ایک بار ضرور آئے گی۔ اس لیے اس وقت کی راہ نہایت بے تابی سے دیکھنے لگا۔

نکان کے باعث شاید کچھ سو بھی گیا تھا۔ اچانک آنکھ کھول کر دیکھا کہ پیاری میرے جسم پر ایک ہاتھ رکھے بیٹھی ہیں۔ میرے اٹھ کر بیٹھے ہی وہ بولی..... ”بر ما گیا ہوا انسان پھر لوٹ کر واپس نہیں آیا۔ یہ بات کیا تمہیں معلوم ہے؟“

”نہیں یہ تو مجھے معلوم نہیں۔“

”پھر“

”مجھے لونٹا ہی ہو گا۔ اپنے سر کی یہ قسم تو مجھے کسی نے دے نہیں رکھی۔“

”دے نہیں رکھی، کیا تم دنیا میں ہر ایک کے دل کی بات جانتے ہو؟“

بات نہایت معمولی تھی لیکن دنیا میں یہ نہایت عجوبہ بات ہے کہ انسان کی کمزوری کب اور کس جگہ پر ظاہر ہو جائے گی اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے پہلے کتنے ہی اور اس سے بھی زیادہ اہم موقعے درپیش آئے لیکن میں نے کبھی اپنے آپ کو اس طرح پکڑا جانے نہ دیا..... اور آج اس کے منہ سے نکلی ہوئی نہایت معمولی سی بات کو بھی میں برداشت نہ کر سکا۔ دفعۃً منہ سے نکل گیا..... ”سب لوگوں کے دل کی بات تو میں جانتا نہیں راج کشمی، لیکن ایک انسان کے دل کی بات ضرور جانتا ہوں۔ اگر کسی دن لوٹ کر واپس آؤں گا تو محض تمہارے ہی لئے۔ تمہارے سر کی قسم کو میں کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔“

پیاری یکبارگی میرے قدموں پر الٹی ہو کر گری پڑی۔ میں نے خواہش ہوتے ہوئے بھی اپنے پاؤں پیچھے نہ کھینچنے لیکن دس ایک منٹ گزر جانے پر بھی جب اس نے اپنا سراو پر نہ اٹھایا تو اس کے سر پر میں نے اپنے داہنا ہاتھ رکھ دیا اور فوراً ہی ایک بار کانپ تو اٹھی پھر بھی وہ اسی طرح پڑی رہی۔ سر بھی نہ اٹھایا۔ بولی بھی نہیں۔ میں نے کہا..... ”اٹھ کر بیٹھو، اس حالت میں اگر کوئی ہمیں دیکھے گا تو بھاری اچنبھے میں پڑ جائے گا۔“

لیکن پیاری نے جواب تک نہ دیا تو میں نے اسے زور سے اٹھایا۔ اٹھاتے ہی میں نے دیکھا

مجھے معلوم نہیں ہوئی۔“

میں نے جواب دیا..... ”پہلی وجہ تو تم سن نہ سکو گی لیکن دوسری سن سکتی ہو۔“

”پہلی کیوں نہیں سن سکتی؟“

”غیر ضروری ہے اس لیے۔“

”اچھا دوسری ہی سناؤ؟“

”میں برا جا رہا ہوں۔ شاید پھر دوبارہ ملاقات نہ ہو سکے۔ کم از کم یہ تو یقینی امر ہے کہ بہت دنوں تک ملاقات نہ ہوگی۔ جانے سے پیشتر ہی ایک مرتبہ تمہیں دیکھنے آیا ہوں۔“

رتن کمرے میں آ کر بولا..... ”بابو آپ کے بستر تیار ہیں آئیے۔“

میں نے خوش ہو کر کہا ”چلو۔“ پیاری سے کہا..... مجھے بڑی نیند آ رہی ہے۔ گھنٹہ بھر بعد اگر وقت ملے تو ایک مرتبہ نیچے آ جانا..... مجھے اور بھی بہت سی باتیں کرنی ہیں“ اتنا کہہ کر اور تن کو ساتھ لے کر میں باہر ہو گیا۔

پیاری کے سونے کے کمرے میں لے جا کر رتن نے جب مجھے میرا بستر دکھایا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی میں نے پوچھا..... میرے بستر نیچے کیوں نہیں کئے؟“

رتن نے متعجب ہو کر کہا..... ”نیچے کے کمرہ میں؟“

میں نے کہا..... ”یہی فیصلہ ہوا تھا۔“

وہ بدحواس سا ہو کر کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا اور بالآخر بول اٹھا..... ”آپ مذاق کر رہے ہیں بابو؟“ یہ کہہ کر وہ ہنستا ہوا جا ہی رہا تھا کہ میں نے اسے بلا کر پوچھا..... ”تمہاری مالکن کہاں سوئیں گی؟“

رتن بولا..... ”بنکو بابو کے کمرے میں ان کا بستر لگا آیا ہوں۔“ میں نے قریب آ کر دیکھا..... یہ راج کشمی کے اس ڈیڑھ ہاتھ چھوٹے تختے پر بچھایا ہوا بستر نہیں ہے۔ ایک بڑے پلنگ پر ایک خوب موٹا گدا بچھا کر شاہی بستر لگائے گئے ہیں۔ آئینے کے نزدیک ایک چھوٹی سی میز پر سچ کے پتیوں سچ لیمپ جل رہا تھا ایک طرف بنگالی کی کتابیں ہیں اور دوسری طرف گلدستے میں بیلا کے کچھ پھول ہیں۔ آنکھوں سے دیکھتے ہی میں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ ان میں کوئی شے نوکر کے ہاتھ کی تیار کی ہوئی نہیں ہے۔ جو بہت پیار کرتی ہیں یہ سب چیزیں خود اس کے اپنے ہاتھ کی تیار کی ہوئی ہیں اور پر کی چادر بھی راج کشمی خود اپنے ہاتھوں سے بچھا گئی ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں خوب محسوس کر لیا۔

آج ان لوگوں کی موجودگی میں میرے یکا یک آ جانے کے باعث راج کشمی نے حواس

کے پاس بیٹھ گئی بولی..... ”تمہارے لیے بے شمار راتیں اکیلے ہی جاگ کر گزاری ہیں۔ آج تمہیں بھی جاگتا رکھوں گی۔“ اتنا کہہ کر میری رضامندی کی راہ دیکھے بغیر ہی میرے پاؤں کی طرف کاٹکیہ کھینچ لیا اور بانیں ہاتھ کا سہارا لے کر وہ لیٹ گئی اور بولی..... ”میں نے خوب غور کر کے دیکھا ہے تمہارا اتنی دور غیر ملک میں جانا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہو سکتا۔“

”تو پھر کیا ہو سکتا ہے؟..... اسی طرح یہاں وہاں بھٹکتے پھرنا۔“
پیاری نے اس کا کوئی جواب نہ دیا پوچھا..... ”اس کے علاوہ کس لیے برما جا رہے ہو، بتاؤ تو سہی؟“

”ملازمت کرنے کے لیے..... یہاں وہاں بھٹکتے پھرنے کے لیے نہیں۔“
میری بات سن کر پیاری اضطراب کے زیر اثر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور بولی..... ”دیکھو دوسروں سے جودل میں آئے کہنا لیکن مجھے دھوکہ مت دینا مجھے دھوکہ دو گے تو تمہاری یہ دنیا ہی نہیں آخرت بھی تباہ ہو جائے گی۔ یہ جانتے ہو؟“

”یہ تو خوب جانتا ہوں، لیکن اب کیا کرنا چاہیے یہ بتاؤ؟“
میری اس منظوری سے پیاری مسرور ہوئی ہنس کر بولی..... ”عورتیں ہمیشہ سے جو کچھ کہتی آئی ہیں وہی میں بھی کہتی ہوں۔ شادی کر کے دنیا دار بن جاؤ۔ گرہستھ دھرم نبھاؤ۔“
میں نے پوچھا..... ”کیا سچ ہی تم اس سے سکھی ہو جاؤ گی؟“
اس نے سر ہلا کر کانوں کے آدیزے ہلاتے ہوئے جوش سے کہا..... ”یقیناً ایک دفعہ نہیں سو دفعہ، اس سے اگر مجھے سکھ نہ ملے گا تو پھر اور کس کو ملے گا؟ بتاؤ؟“

میں نے کہا..... ”یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اس سے میرے دل کی ایک تشویش مٹ گئی درحقیقت میں یہی خبر دینے آیا تھا کہ اب شادی کئے بغیر میری گزر نہ ہوگی۔“

پیاری ایک مرتبہ پھر کانوں کے سنہری آدیزے ہلاتی ہوئی بے انتہا مسرت سے بول اٹھی..... ”یہ ہو گا تو میں کالی گھات جا کر پوجا دے آؤں گی مگر شرط یہ ہے کہ لڑکی میں خود دیکھ کر پسند کروں گی۔“

میں نے کہا..... ”اس کے لیے اب وقت نہیں ہے، لڑکی تو پسند کی جا چکی ہے۔“
میرے سنجیدہ لہجہ پر شاید پیاری نے توجہ نہ دی۔ یکا یک اس کے خندہ اور مسرور چہرے پر ایک مکدر سا سایہ پڑ گیا وہ بولی..... ”ٹھیک تو ہے، اچھا ہی ہوا پسند ہو گئی ہے تو نہایت ہی خوشی کی بات ہے۔“

کہ اس کے آنسوؤں سے وہاں کی تمام چادر تر ہو چکی ہے۔ کھینچ تان کرنے پر وہ بھرائے گلے میں بول اٹھی..... ”پہلے میری دو تین باتوں کا جواب دو پھر میں انھوں گی۔“
”کہو، کون سی باتیں ہیں؟“

”پہلے تو یہ بتاؤ کہ ان لوگوں کے یہاں رہتے ہوئے تم نے میرے متعلق کوئی برا خیال تو نہیں کیا؟“
”نہیں۔“

پیاری اور کچھ دیر چپ رہ کر بولی..... ”لیکن میں نیک عورت نہیں ہوں یہ تو تمہیں معلوم ہے پھر بھی تمہیں شک کیوں نہیں ہوا؟“
سوال نہایت مشکل تھا وہ نیک عورت نہیں ہے یہ میں جانتا ہوں لیکن وہ خراب ہے، بد ہے یہ خیال بھی میں نہ کر سکا۔ میں خاموش ہو رہا۔

یکا یک وہ اپنی آنکھیں پونچھ کر جھٹ پٹ اٹھ بیٹھی اور بولی..... ”اچھا، تم سے پوچھتی ہوں، مرد کتنا ہی برا کیوں نہ ہو اگر وہ بھلا ہونا چاہتا ہے تو اسے کوئی نہیں روکتا مگر ہماری باری آنے پر سب راہیں کیوں بند ہو جاتی ہیں؟ غلطی سے مفلسی اور ناداری سے مجبور ہو کر ایک دن جو کر بیٹھی ہوں ہمیشہ کے لیے مجھے وہی کیوں کر ناپزوار ہے؟ ہم لوگوں کو تم نیک بننے کیوں نہیں دیتے؟“
میں نے جواب دیا..... ”ہم لوگ تو کبھی روکتے نہیں ہیں اور اگر بالفرض محال ہم روکیں تو دنیا میں نیک بننے کی راہ میں کوئی کسی کو انکا کر روک نہیں سکتا۔“

پیاری بڑی دیر تک چپ رہ کر میری منہ کی طرف دیکھتی رہ کر آخر آہستہ آہستہ بولی..... ”بہت اچھا، تو پھر تم بھی مجھے روک نہ سکو گے؟“
میرے جواب دینے سے پہلے ہی رتن کی کھانسی کی آواز دروازے کے قریب سنائی دی۔

پیاری نے پکار کر کہا..... ”کیا ہے رتن؟“
رتن نے منہ آگے نکال کر کہا..... ”ماں رات بہت بیت چکی ہے..... بابو جی کے کھانے کے لیے لے نہ آؤں؟ سو نیامہاراج تو اونگھتے اونگھتے رسوئی گھر میں ہی سو گئے ہیں۔“

”ارے پھر تو تم میں سے کسی نے بھی ابھی تک نہ کھایا ہو گا۔“ اتنا کہہ کر پیاری گھبرا کر اور شرمندہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے لیے کھانا وہ اپنے ہی ہاتھوں ہمیشہ لاتی تھی۔ آج بھی لانے کے لیے جلدی سے قدم بڑھائی ہوئی وہ چلی گئی۔

کھانا ختم کر کے جب میں بستر پر لیٹا تو رات کا ایک بج گیا تھا۔ پیاری پھر آ کر میرے پاؤں

لڑکی کا تم بیڑا پار کر دو۔

پانچ سو روپے ہوں تو یہ کام ہو جائے گا۔ میں انہیں کے منہ سے سن رہا ہوں۔“
پیاری جوش میں آ کر اٹھ بیٹھی اور بولی..... ”کل ہی میں روپے بھیج دوں گی۔ چاچی کی بات
جھوٹی نہ ہونے دوں گی۔“ پھر کچھ دیر رک کر بولی..... ”سچ کہتی ہوں تم سے، یہ لڑکی اچھی نہیں اس لیے
مجھے اعتراض ہے ورنہ.....“
”ورنہ.....؟“

”ورنہ اور کیا! جب تمہارے قابل لڑکی ڈھونڈ لوں گی اسی وقت اس بات کا جواب دوں
گی۔ اس وقت نہیں۔“
سر ہلا کر میں نے کہا..... ”تم فضول کوشش مت کرو راج لکشمی، میرے قابل لڑکی تم کسی دن
بھی تلاش نہ کر سکو گی۔“

وہ بہت دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہی پھر یکا یک بول اٹھی..... ”اچھا، شاید تلاش نہ کر سکوں
لیکن اگر تم ہر ماگے تو مجھے ساتھ لے چلو گے؟“
اس کی تجویز سن کر میں ہنسا، بولا..... ”میرے ساتھ چلنے کا تمہیں حوصلہ ہوگا؟“
پیاری میرے چہرے پر تیز نگاہ ڈال کر بولی..... ”حوصلہ! اسے کیا تم بہت مشکل بات خیال
کرتے ہو؟“

”میں خواہ کچھ بھی خیال کروں مگر تمہارے اس تمام گھربار، دھن دولت، زمیں کا کیا ہوگا؟“
پیاری بولی..... خواہ کچھ بھی ہو۔ تمہیں نوکری کی تلاش میں جب اتنی دور جانا پڑا..... اور یہ
سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کسی کام نہ آیا تو اسے بنکو کو دے جاؤں گی۔“
اس بات کا جواب میں دے نہ سکا۔ کھلی ہوئی کھڑکی کے باہر تارکی میں دیکھتا ہوا چپ چاپ
بیٹھا رہا۔

اس نے پھر کہا..... ”کیا اتنی دور گئے بغیر کام نہ چلے گا؟ یہ سب کیا کسی بھی دن تمہارے کسی
کام نہیں آ سکتا؟“

میں نے جواب دیا..... ”نہیں کبھی کسی دن بھی نہیں۔“
پیاری نے گردن ہلا کر کہا..... ”یہ میں جانتی ہوں لیکن لے چلو گے تم مجھے اپنے ساتھ یہ کہہ کر
اس نے میرے پاؤں پر پھر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ ایک دن جب پیاری نے مجھے اپنے مکان سے زبردستی
رخصت کر دیا تھا تو اس دن کا اس کا غیر معمولی استقلال اور قوت ارادی دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا۔ آج

میں نے کہا..... ”خوشی اور غمی تو میں سمجھتا نہیں راج لکشمی، جو بات ہو چکی ہے وہی تمہیں بتانا
ہوں۔“

پیاری فوراً غصے سے بول اٹھی..... ”جاؤ چالا کی مت کرو، تمام بات جھوٹ ہے۔“
”ایک بھی بات غلط نہیں ہے۔ خط دیکھتے ہی سمجھ جاؤ گی۔ یہ کہہ کر جیب میں سے میں نے دو
خط باہر نکالے۔

”کہاں میں دیکھوں وہ خط؟“ اتنا کہہ کر اور ہاتھ بڑھا کر پیاری نے دونوں ہاتھوں میں خط
لے لئے۔ انہیں ہاتھ میں لیتے ہی اس کے تمام چہرے پر ایک اندھیرا سا چھا گیا۔ دونوں خط ہاتھ میں
لئے ہی وہ بولی..... ”دوسرے کے خط پڑھنے کی مجھے ضرورت ہی کیا ہے؟ بتاؤ بات کہاں پکی ہوئی ہے؟“
”پڑھ دیکھو۔“
”میں دوسرے کا خط نہیں پڑھتی۔“

”تو پھر دوسرے کی خبر جاننے کی بھی تمہیں ضرورت نہیں ہے۔“
”میں نہیں جانتا چاہتی۔“ کہہ کر اور آنکھیں بند کر کے وہ لیٹ گئی مگر دونوں خط اس کی مٹھی
میں ہی رہے بہت دیر تک وہ کچھ نہ بولی اس کے بعد وہ آہستہ سے اٹھی، جا کر لیمپ تیز کیا اور میز پر
دونوں خط رکھ کر اطمینان سے جا بیٹھی۔ ان میں جو کچھ لکھا تھا اس نے اسے شاید دو تین بار پڑھا اس کے
بعد وہ اٹھ آئی اور اس طرح پھر لیٹ گئی بہت دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولی..... ”سو گئے کیا؟“
”نہیں۔“

”اس جگہ میں تمہیں کسی طرح بھی شادی کرنے نہ دوں گی۔ وہ لڑکی اچھی نہیں ہے۔ اس کو
میں نے بچپن سے دیکھا ہے۔“
”ماں کا خط پڑھا؟“

”ہاں لیکن چاچی کے خط میں ایسا کچھ بھی نہیں لکھا تمہیں اس کو گلے میں ضرور ڈالنا ہی پڑے گا
اور خواہ وہ اچھی ہو خواہ بری ہو لیکن اس لڑکی کو میں کسی طرح بھی گھر نہ لاؤں گی۔“
”کیسی لڑکی گھر میں لانا چاہتی ہو، بتا سکتی ہو؟“
”یہ میں اس وقت کیسے بتاؤں؟ غور کر کے دیکھنا ہوگا۔“

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد میں ہنس کر بولا..... ”تمہاری پسند اور تمہارے معیار پر انحصار
رکھا جائے تو مجھے اپنا کنوارا اپن اتارنے کے لیے شاید ایک جنم اور لینا پڑے اور ممکن ہے اس میں نہیں پورا
نہ پڑے۔ جانے دو، نہ ہوا تو ضرورت پڑنے پر جنم لے لوں گا۔ مجھے کوئی خاص جلدی نہیں ہے لیکن اس

اس کی اتنی بڑی کمزوری، بے تاب دل کی یہ التجا ان سب کا مقابلہ کر کے میرا سینہ پھٹنے لگا۔ لیکن کسی طرح بھی رضا مند نہ ہو سکا بولا..... ”میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا نہیں سکتا لیکن وعدہ کرتا ہوں کہ جب بھی تم بلاؤ گی لوٹ آؤں گا۔ میں جہاں بھی رہوں گا ہمیشہ تمہارا ہی رہوں گا راج لکشمی!“

”کیا تم ہمیشہ اسی بدکردار کے بنے رہو گے؟“

”ہاں ہمیشہ ہی۔“

”تو پھر یہ کہو کہ تمہاری شادی ہی نہ ہوگی؟“

”ہاں نہیں ہوگی، اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہاری رائے کے بغیر تمہیں تکلیف پہنچا کر اس کام کو

کرنے کی میری خواہش نہیں ہے۔“

پیاری نہ جھپکنے والی نگاہوں سے کچھ دیر تک میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بعد اس کی دونوں آنکھیں آنسوؤں سے بھر کر ٹپ ٹپ، بوندوں کی شکل میں گرنے لگیں۔ آنکھیں صاف کر کے کثیف لہجہ میں وہ بولی..... ”اس بد قسمت کے لیے کیا تم زندگی بھر نیا سی ہی بنے رہو گے؟“

میں نے کہا..... ”ہاں بنا رہوں گا۔ تمہارے پاس میں نے جو شے پائی ہے اس کے عوض نیا سی بن کر رہنے میں میرا کوئی نقصان نہیں ہے۔ میں کہیں بھی کیوں نہ رہو میری اس بات پر تم کبھی شک نہ کرنا۔“

پل بھر کے لیے دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور دوسرے ہی لمحہ وہ تکیے میں منہ چھپا کر الٹی لیٹ گئی۔ سسکیوں کے جوش میں اس کا تمام جسم کانپ کانپ کر اور پھول پھول کر اچکنے لگا۔

میں نے منہ اٹھا کر دیکھا تمام گھر گہری نیند میں مدھوش تھا۔ کہیں کوئی بھی جاگ نہ رہا تھا۔ صرف ایک دفعہ خیال آیا کہ جھرو کے باہر تاریک رات اپنے کتنے ہی جشن ہائے مسرت کی ہم نشین پیاری کے دل کے اضطراب کو آج چپ چاپ آنکھیں کھول کر نہایت افسوس کے ساتھ دیکھ رہی ہے۔

بے شمار باتیں ایسی دیکھی ہیں کہ زندگی بھر انہیں بھولا نہیں جاسکتا۔ وہ جب کبھی یاد آیا جاتی ہیں تو اس وقت کے الفاظ تک کانوں میں گونج اٹھتے ہیں۔ پیاری کے الوداعی الفاظ بھی اس قسم کے تھے۔

آج بھی میں گویا ان کی گونج سنا کرتا ہوں۔ وہ فطرتاً ہی بہت زیادہ بردبار اور جفاکش تھی۔ اور اس کا ثبوت وہ بچپن ہی میں بار بار دے چکی تھی اور اس کے علاوہ اب اسے دنیا کا کافی تجربہ بھی ہو چکا تھا۔

بچپن میں مرتبہ تو میرے رخصت ہونے کے وقت کسی طرح بھاگ کر اس نے اپنا آپ بچا لیا تھا لیکن اس مرتبہ وہ کسی طرح بھی اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی اور نوکر چاکروں کے سامنے ہی رو پڑی۔ روندہ ہوئے گلے سے وہ بولی..... ”دیکھو میں نا سمجھ نہیں ہوں۔ اپنے گناہوں کی بھاری سزا مجھے بھگتنی ہی پڑے گی۔ یہ

میں جانتی ہوں لیکن پھر بھی کہتی ہوں کہ ہمارا یہ سماج نہایت بے رحم اور سنگدل ہے۔ اس کو بھی ایک نہ ایک دن اپنے اعمال کی سزا بھگتنی ہی پڑے گی۔ بھگوان اس ظالم سماج کو اس کے گناہوں کی سزا ضرور ہی دیں گے۔“

سماج کو اتنی بڑی بدعا اس نے کیوں دی۔ یہ وہ جانے یا اس کا عالم الخشب پر ماتما۔ میں نہیں جانتا یہ بات نہیں ہے مگر میں خاموش ہو رہا۔ بوڑھا دربان گاڑی کا دروازہ کھول کر میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں آگے کی طرف قدم بڑھا ہی رہا تھا کہ پیاری آنکھوں کے آنسوؤں میں سے میرے منہ کی طرف دیکھ کر مسکرائی بولی..... ”جہاں جا رہے ہو؟ پھر تو شاید درشت نہ ہوں گے، ایک بھیک دیتے جاؤ گے؟“

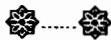
میں بولا..... ”دوں گا، کہو۔“

پیاری بولی..... ”بھگوان نہ کریں..... لیکن تمہارا سفر زندگی جس قسم کا ہے اس سے..... خیر جہاں بھی رہو ایسے موقعہ پر خبر دو گے؟ شرمناک تو نہیں؟“

”نہیں شرمناک تو نہیں..... اطلاع ضرور دوں گا۔“ اتنا کہہ کر آہستہ آہستہ میں گاڑی میں جا بیٹھا۔ پیاری پیچھے پیچھے آئی اور اس نے اپنے آنچل میں میرے پاؤں کی خاک لے لی۔

”اجی سنتے ہو؟“ میں نے منہ اٹھا کر دیکھا کہ وہ اپنے کانپتے ہوئے ہونٹوں کو تمام تر طاقتوں سے قابو میں رکھ کر کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہے۔ دونوں کی نگاہ ایک ہوتے ہی اس کی آنکھوں سے پھر جھرجھری پانی جھری پڑا۔ وہ ناقابل فہم روندھے ہوئے گلے سے آہستہ آہستہ بولی..... ”نا جاتا تو اتنی دور تو؟..... رہنے دو، ہمت جاؤ.....“

چپکے سے میں نے اپنی نظر اس طرف سے پھرائی۔ گاڑی بان نے گاڑی ہانک دی۔ چابک اور چار پیروں کی مشترکہ سپاں اور گھر گھر آواز سے شام کی فضا معمور ہو اٹھی مگر ان سب کو دبا کر صرف کسی روندھے ہوئے گلے کا دبا ہوا گریہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔



پانچ چھ دن بعد میں، ایک دن صبح کے وقت، صرف لوہے کا ایک ٹریک اور ہلکا سا بستر لے کر کلکتہ کے کوئلہ گھاٹ پر جا پہنچا۔ گاڑی سے اترتے ہی ایک خاکی کرتی پہنے ہوئے قلی نے دونوں چیزوں کو چھٹ لیا۔ انہیں لے کر چشم زدوں میں نامعلوم وہ کہاں غائب ہو گیا اور جب تک انہیں تلاش کرتے کرتے تشویش کے مارے میرے آنکھوں میں آنسو نہ آ گئے۔ تب تک اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔

گاڑی پر سے آتے ہی میں نے دیکھا تھا کہ جیٹی اور شاہراہ کے درمیان کی زمین گونا گوں رنگ کی چیزوں سے لدی ہوئی ہے..... لال، کالے، گردے..... کچھ کھر بھی چھایا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ پتھرؤں کا ایک جھنڈ شاید چالان کیے جانے کے لئے بندھا ہوا ہے۔ نزدیک آ کر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ چالان تو ہو گا ضرور..... لیکن پتھرؤں کا نہیں..... انسانوں کا۔ وہ لوگ بڑی بڑی سی گھڑیاں لئے بیوی بچوں سمیت ہاتھ پکڑے تمام رات، اسی لئے اسی طرح اوس میں پڑے رہے ہیں کہ صبح سب سے پہلے جہاز میں گھس کر ایک اچھی سی جگہ پر قبضہ کر لیں گے۔ اس لیے کسی کی طاقت تھی کہ پیچھے سے آ کر انہیں پیار کر کے جیٹی کے دروازہ تک پہنچ جائے۔ تھوڑی ہی دیر بعد جب یہ دل جاگ کر کھڑا ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ کابل کے مغرب سے لے کر اس کماری کے آخر تک کا کوئی بھی صوبہ ایسا نہیں ہے جو اپنا نمائندہ اس کوئلہ گھاٹ پر بھیجنا بھولا ہو۔

کبھی ہیں۔ کالی کالی گانجیاں پہنے ہوئے چیمبوں کا گروہ بھی رہ نہیں گیا ہے میں بھی تو ڈیک (جس سے نیچے اور کوئی درجہ نہیں اس کا) مسافر تھا۔ اس لئے لوگوں کو دھکیل کر اپنے بیٹھنے کے لیے ایک جگہ مجھے بھی حاصل کرنی تھی لیکن اس کا تصور کرتے ہی میرا تمام جسم برف کی مانند ٹھنڈا ہو گیا تاہم جب جانا ہی ہے اور جہاز کے علاوہ جانے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے تو جس طرح بھی ہوا ان لوگوں کی تقلید کرنا فرض ہے یہ خیال کر کے میں اپنے دل کو جس قدر ہی مضبوط بنانے لگا گویا اس قدر ہی وہ ہمت ہارنے لگا۔ جہاز کب آ کر کنارے سے لگے گا یہ جہاز ہی جانے۔ یکا یک آنکھ اٹھا کر دیکھا اس دوران میں ہی

یہ چودہ پندرہ سو لوگ بھیرؤں کے جھنڈ کی طرح قطاریں باندھ کر کھڑے ہوئے ہیں۔ ایک ہندوستانی آدمی سے میں نے پوچھا ”بھیا! سب لوگ آرام سے اچھی طرح تو بیٹھے تھے..... اب قطار باندھ کر کیوں کھڑے ہو گئے؟“

وہ بولا..... ”ڈاکٹری ہوگی“

”ڈاکٹری کیا ہوتی ہے بھائی؟“

اس آدمی نے پیچھے سے آئے ہوئے ایک دھکے کو سنبھالتے ہوئے کچھ جھنجھلاہٹ سے

کہا..... ”ارے پلگ کی ڈاکٹری۔“

بات کو سمجھنا اور بھی مشکل ہو گیا لیکن سمجھوں خواہ نہ سمجھوں..... اتنے انسانوں کے لیے جو ضروری ہے وہ میرے لیے بھی ہوگی لیکن کس ہوشیاری سے اپنے آپ کو اس جھنڈ میں گھسیڑ دوں، یہ ایک مشکل سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ گھسنے کے لیے کہیں ذرا سی خالی جگہ ہے یا نہیں۔ یہ تلاش کرتے کرتے دیکھا کہ کچھ دور کھد رپور کے کتنے ہی مسلمان سکڑ کر کھڑے ہوئے ہیں۔ دلش بدلیش میں نے ہر جگہ یہی دیکھا ہے کہ جن کاموں میں شرم کرنا ضرور ہوتا ہے بنگالی لوگ ضرور ان میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی دیگر اقوام کی طرح بلا جھجک دھینگا شتی، دھکا کی اور مارا ماری نہیں کر سکتے۔ اس طرح کھڑے ہونے میں جو عداوت ہے اس کی شرم کے مارے یہ سب اپنا سر نیچا کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ رنگون میں درزی کا کام کرتے ہیں اور کئی مرتبہ آئے گئے ہیں۔ دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ یہ سب احتیاط حفظ ماقدم کے طور پر اس لیے ہے کہ یہاں سے کہیں برما میں پلگ نہ چلی جائے۔ جب تک ڈاکٹر معائنہ کر کے پاس نہ کر دے کوئی جہاز پر سوار نہیں ہو سکتا۔ یعنی رنگون جانے کے لیے جو لوگ تیار ہوئے ہیں ان کا پہلے ہی معائنہ ہو جانا ہے کہ وہ پلگ کے بیمار ہیں یا نہیں۔ انگریزی حکومت میں ڈاکٹروں کا خاص مرتبہ ہے۔ سنا ہے کہ ذبح خانہ کے مسافروں کو بھی اندر جا کر ذبح ہونے کا حق حاصل کرنے کے لیے ان لوگوں کا منہ تا کننا پڑتا ہے لیکن رفتار زمانہ کے نقطہ نگاہ سے رنگون کے مسافروں کے ساتھ ان کی جواتی مشابہت ہے اس وقت کس نے سوچا تھی۔

رفتہ رفتہ پلگ کی ڈاکٹری قریب آ پہنچی۔ اپنے پیادے کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نظر آئے۔ قطار بندی کی حالت میں گردن نیڑھی کر کے دیکھنے کا موقع تو تھا نہیں تاہم آگے کھڑے ہوئے ساتھیوں کے ساتھ کیا گیا ڈاکٹری کا معائنہ جتنا بھی نظر آیا اس سے میری تشویش کی حد نہ رہی اتنا بزدل بنگالیوں کے علاوہ وہاں اور کوئی نہ تھا جو جسم کے عضو نہانی کو نگاہ سے پر بھی خوفزدہ ہو لیکن اپنے سامنے کے بہادروں کو بھی معائنہ کے وقت بار بار چونک اٹھتے دیکھ کر میں بری طرح متھکر ہوا تھا۔ ہر شخص جانتا ہے

کہ پلنگ کی بیماری میں انسان کا عضو مخصوص سوچ جایا کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جس طرح بے لوث دل سے محض فرض سمجھ کر اس مشکوک جگہ میں ہاتھ ڈال کر سوزش ٹٹولنے لگے اس سے کاٹھ کے پتلے کو بھی اعتراض ہوتا مگر ہندوستانیوں کی تہذیب و تمدن قدیم ہے اس لیے جس طرح بھی ہوا ایک دفعہ چونک کر وہ اپنی قدرتی حالت میں آ جاتے اور اگر اور کوئی قوم ہوتی تو ڈاکٹر کا ہاتھ مروڑے توڑے بغیر نہ رہتی۔ پس جو بھی ہو جب پاس ہونا نہایت ضروری فرض تھا تو پھر اور چارہ ہی کیا تھا؟ اپنی باری آنے پر، آنکھیں بند کر کے عضو سکود کر، ایک طرح سے بدحواس سا ہو کر میں نے اپنے آپ ڈاکٹر کو سوپ دیا اور پاس بھی ہو گیا۔

اسکے بعد جہاز پر سوار ہونے کا سوال تھا لیکن ڈیک پنجروں کا یہ مرحلہ کس طرح طے ہوتا ہے۔ باہر کے لوگوں کے لیے اس کا تصور بھی ناممکن ہے جنہوں نے کل کارخانوں میں بڑے بڑے پیہوں کا گھومنا دیکھا ہے۔ ان کے لیے اس کا سمجھنا کچھ کچھ ممکن ہو سکتا ہے۔ وہ جس طرح آگے کے کھنچاؤ اور پیچھے کے دھکے سے آگے بڑھ کر چلتے ہیں اسی طرح ہماری ہی کاپلی پنجابی مارواڑی، مدرسی، مرہٹی، بنگالی، چینی، اڑیا لوگوں کی ملی جلی اور پر جوش فوج صرف باہمی کشش اور رگڑ کے زور سے زمیں سے جہاز کے ڈیک پر از خود سوار ہو گئی اور ان کی رفتار وہاں بھی نہ رکی۔ سامنے دیکھا ایک گڑھے کے منہ پر سیرھی لگی ہوئی تھی۔ جہاز کے پیٹ میں (اندر) اترنے کا یہی راستہ تھا۔ جس طرح کسی برساتی نالے کا بندھ کھول دینے سے جمع شدہ پانی نہایت زور سے نیچے گرتا ہے اسی طرح یہ فوج بھی اپنی اپنی جگہ پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے زندگی اور موت کی فکر سے بے پروا ہو کر نیچے اترنے لگی۔

مجھے جہاں تک یاد آتا ہے میری خواہش نیچے جانے کی نہیں تھی پاؤں سے چل کر اترنا بھی نہیں۔ لمحہ بھر کے لیے میں بے ہوش سا ہو گیا تھا اس لیے میرے اس بیان پر اگر کسی کو شک ہو تو قسم کھا کر شاید میں اس کو نا منظور بھی نہ کر سکوں گا۔ ہوش آنے پر دیکھا کہ جہاز کے اندر وسط سے بہت دور ایک کونے میں تنہا کھڑا ہوں۔ پاؤں پر نظر ڈالی تو دیکھتا ہوں کہ اسی دوران میں جادو کے کھیل کی طرح پل بھر میں کھیل چھا کر اور صندوق وغیرہ سے گھر کو اپنے اپنے لیے محفوظ جگہ بنالی ہے اور اطمینان سے بیٹھ کر اپنے پڑوسی کا تعارف حاصل کرنا شروع کر دیا ہے۔ اتنی دیر بعد اب کہیں میرے اس نمبر والے قلعے نے آ کر اپنی شکل دکھائی اور کہا: ”ٹریک اور بستر اوپر رکھا آیا ہوں اگر آپ کہیں تو نیچے لے آؤں؟“

میں نے جواب دیا: ”نہیں بلکہ کس طرح ممکن ہو تو یہاں سے نجات دلا کر مجھے بھی اوپر لے چلو۔“ کیونکہ وہاں اتنی سی جگہ بھی مجھے کہیں خالی نظر نہ آئی کہ دوسروں کے بستر لیٹے بغیر یا ان سے ہاتھ پائی کی نوبت آئے بغیر میں کہیں اپنا قدم رکھ سکوں۔ اس سے تو یہ کہیں اچھا تھا کہ بارش ہو تو اوپر بجلی

جاؤں مگر یہاں تو ایک ٹھہرنا ممکن نہیں۔ زیادہ پیہوں کے لالچ سے قلعے کا کافی کوشش اور بحث مباحثے کے بعد کمبلوں اور شطرنجیوں کے کناروں کو الٹا پلٹا ہوا مجھے اپنے ساتھ لیے اوپر آیا اور میرا سامان دکھا کر انعام لے کر چلتا بنا۔ یہاں بھی وہی حال تھا۔ بستر بچھانے کے لیے جگہ نہ تھی اس لیے مجبور ہو کر اپنے ٹریک کے اوپر ہی بیٹھنے کا انتظام کر کے میں نہایت یکسوئی سے ماتا گنگا کے دونوں کناروں کی شان دیکھنے لگا۔

سینئر نے چلنا شروع کر دیا تھا۔ بہت دیر سے پیاس لگ رہی تھی۔ ان دو گھنٹوں میں جو طوفان سر سے گزر گیا اس سے جن کا سینہ خشک نہ ہو جائے ایسے سخت دل دنیا میں کم ہی ہوں گے مگر مصیبت یہ ہوئی کہ پاس نہ لگا اس نہ لوٹا۔ ساتھ کے مسافروں میں اگر کوئی بنگالی ہو تو کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ کر میں باہر نکلا نیچے اترنے کے اس گڑھے کے نزدیک پہنچتے ہی ایک ہنگامہ سانسائی پڑا۔ میری واقعیت کا دائرہ اتنا محدود ہے کہ اس ہنگامے کی تشبیہ نہیں دے سکتا۔ گونشالہ میں آگ لگا دینے سے ایک قسم کے ہنگامے کی بات ضرور کہی جاتی ہے لیکن اتنا برا ہنگامہ ہونے کے لیے جتنی بڑی گونشالہ کی ضرورت ہے اتنی بڑی گونشالہ مہابھارت کے زمانہ میں راجدراٹ کے ہاں ہو تو علیحدہ بات ہے مگر اس کلجک میں اس کا جو تصور سے بھی بعید ہے۔

خوف اور دھڑکتے ہوئے دل سے دو ایک سڑھیاں اتر کر میں نے جھانکا تو معلوم ہوا کہ مسافروں نے اپنے اپنا نیشنل (قومی) گانا شروع کر دیا ہے۔ کابل سے لے کر برہم پتر اور کینا کماری سے لے کر چین کی سرحد تک جتنی بھی طرح کی سریں اور سرگم ہیں۔ جہاز کے اس بند پیٹ کے اندر ان کا عجیب و غریب ملاپ ہوا تھا۔ ایسے عظیم الشان گانے سننے کا موقع خوش نصیبی سے ملتا ہے اور گانا ہی فنون لطیفہ میں سب سے افضل ہے۔ یہ بات اس جگہ کھڑے کھڑے ہی میں نے کمال عقیدت کے ساتھ قبول کر لی لیکن سب سے بڑی حیرت تو یہ تھی کہ وہاں اتنے زیادہ ماہرین فن جمع کیسے ہوئے؟

میں کا ایک اس بات کا فیصلہ نہ کر سکا کہ میرا نیچے اترنا مناسب ہے یا نہیں۔ سنا ہے انگریزوں کے شاعر اعظم شکسپیر نے کہا کہ ”نغمہ جس انسان کو بخود نہیں بنا سکتا وہ خون تک کر سکتا ہے۔“ مگر صرف منٹ بھر سن لینے سے ہی جو نغمہ انسانی خون کو سرور کرتا ہے ایسا نغمہ شاید انہوں نے اپنی زندگی میں سنا نہ ہو گا۔ جہاز کی یہ جگہ کوئی سنگیت مہاو دیال ہے یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اگر نہ ہوتا تو یہ کون سوچ سکتا کہ کاپلی لوگ بھی گانا گاتے ہیں۔

ایک طرف یہ عجیب و غریب نظارہ تھا اور میں منہ کھولے دیکھ رہا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا کہ قریب ہی کھڑا ایک شخص اپنی پوری طاقت سے ہاتھ ہلا کر میری توجہ اپنی طرف کشش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کافی تکلیف اور پریشانی سے بیٹھا راوگوں کی لال سرخ آنکھیں سر پر رکھ کر میں اس کے

چلی۔ جس کے سبب جہاز خوب ہلا جلا مگر دوسرے ہی دن صبح سے وہ پرسکون انداز سے چلنے لگا۔ جس کو سمندری بیماری کہتے ہیں میری وہ خرابی تو شاید بچپن میں ہی کشتی پر ہی رفع ہو چکی تھی اس لیے مجھے بالکل کوئی تکلیف نہ ہوئی البتہ نند مستری کے کنبہ کے ساتھ کیا حالت ہوئی..... رات کس طرح کئی یہ معلوم کرنے کے لیے میں نیچے جا پہنچا۔ کل کے گویوں میں سے بیشتر اس وقت تک بھی اوٹھ پڑے ہوئے تھے۔ میں نے سمجھ لیا کہ رات کی خرابی کی وجہ سے ہی یہ لوگ ابھی تک گانے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ نند مستری اور اس کی بیس سال کی گھر والی دونوں بنیدہ بنے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے پر نام کیا۔ ان کے چہرے کے جذبہ سے معلوم ہوا کہ کچھ دیر پہلے ہی دونوں میں کچھ لڑائی جھگڑا ضرور ہو چکا ہے۔ میں نے پوچھا..... ”رات کیا حال رہا مستری جی؟“

نند بولا..... ”اچھا رہا“

اس کی گھر والی گرج اٹھی..... ”خاک اچھا رہا! میاری میا، کیسا ہنگامہ ہو گیا۔“ قدرے بے تاب ہو کر میں نے پوچھا..... ”کیسا ہنگامہ۔“

نند مستری نے میرے چہرے کی طرف دیکھا پھر جمائی لی، چٹکیاں بجائیں اور آخر کار کہا..... ”ہنگامہ تو کچھ ایسا نہیں تھا بابو جی، کہتا ہوں، کلکتے کی گلیوں کے موڑوں پر ساڑھے بیس طرح کا چھینیا بیچتے ہوئے آپ نے کسی کو دیکھا ہے؟ اگر دیکھا ہو تو ہم لوگوں کی حالت کو آپ بخوبی سمجھ سکیں گے۔ وہ جس طرح انگوٹھے کے نیچے دو تین انگلیوں کی چوٹ مار کر بھنے ہوئے چاول، دال، مٹر، مسور، چنے، سیم کے بیج وغیرہ سب کو ملا کر دیتا ہے۔ دیوتا کی مہر سے ہم سب بھی عین اس طرح گڈم گڈم ہو گئے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے سب کوئی اپنے اپنے کپڑے پہچان کر پھر اپنی اپنی جگہ آ کر بیٹھے ہیں۔ اس کے بعد وہ نگر کی طرف دیکھ کر بولا..... ”بابو جی، قسمت سے اصل دیشنوی جاتی نہیں جاتی اور نہ میری نگر.....“

نگر بھوکے شیر کی طرح گرج اٹھی..... ”اب پھر وہی“

”نہیں، تو جانے دو“ کہہ کر نند مستری اداس ہو کر دوسری طرف دیکھتا ہوا خاموش ہو گیا۔

ایک کالی میاں بیوی جو خوش قسمت کا مجسمہ تھے سر سے پاؤں تک زمین کی تمام گندگی لا دے ہوئے نہایت رغبت کے ساتھ روٹی کھا رہے تھے۔ مشتعل نگر ان بد نصیبوں کی طرف اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ کر شعلہ زیر ہو رہی تھی۔ نند نے اپنی گھر والی کو مخاطب کر کے پوچھا..... ”تو پھر آج کھانا پینا کچھ نہ ہوگا، کیوں؟“

گھر والی نے کہا..... ”موت اور کسے کہتے ہیں، ہوگا کیسے سنو تو؟“

معاملہ نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے میں نے پوچھا..... ”ابھی تو کافی سویرا ہے..... کچھ دن چڑھ

پاس جا پہنچا۔ اس نے براہ من سمجھ کر مجھے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور بتایا کہ میں رنگون کا مشہور مستری نند ہوں۔ پاس ہی ایک موٹی سی عورت بیٹھی ہوئی ایک تک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کسی انسان کی اتنی بڑی بڑی فٹ بال کی سی آنکھیں اور اتنی موٹی جڑی ہوئی بھونٹیں پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔

نند مستری اس عورت کی تعریف کرتے ہوئے بولا..... ”بابو جی یہ میری گھر والی.....“ بات پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ وہ پھٹکار کر گرج اٹھی..... ”گھر والی!..... یہ میرے سات، بھانور کے مالک کہتے ہیں گھر والی! خبردار، کہے دیتی ہوں مستری! ہر کسی کے سامنے جھوٹ بول کر مجھے بدنام مت کیا کرو!..... ہاں۔“

میں تو حیرت کے مارے دیکھتا رہ گیا۔

نند مستری کچھ مرعوب سا ہو کر بولا..... ”آہ، ناراض کیوں ہوتی ہو نگر؟ گھر والی اور کسے کہتے ہیں؟ بیس سال.....“

نگر نہایت غصے سے بولی اٹھی..... ”بیس سال ہو گئے ہیں تو کیا ہوا؟ پھولے نصیب! دیشنوی ذات کی لڑکی ہو کر میں کیوٹ کی گھر والی کہلاؤں۔“

”کیسے، کس طرح؟ بیس سال سے تمہارے گھر میں ضرور ہوں لیکن کیا کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ میں نے ایک دن میں تمہیں اپنے چوکے میں گھسنے دیا ہے؟ نگر دیشنوی مر جائے گی لیکن اپنی ذات نہ کھوے گی جانتے ہو؟“ اتنا کہہ کر وہ دیشنوی ذات کی لڑکی اپنی ذات کے غرور سے میرے منہ کی طرف دیکھتی ہوئی اپنی دونوں فٹ بال کی سی آنکھیں گھمانے لگی۔

نند مستری شرمندہ ہو کر بار بار کہنے لگا..... ”دیکھا بابو جی دیکھا؟ ابھی تک اسے جاتی کا غرور

ہے۔ دیکھا آپ نے میں ہوں اسی لیے برداشت کر لیتا ہوں اور کوئی ہوتا تو.....“ بیس سال کی اس گھر والی کی طرف دیکھ کر وہ بے چارہ اپنی بات بھی مکمل نہ کر سکا۔ میں اور کچھ نہ بولا اور اس سے ایک گلاس لے کر وہاں سے چل دیا۔ اوپر پہنچ کر اس دیشنوی کی باتیں یاد کر کے میں اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکا لیکن لمحہ بھر بعد ہی سوچا یہ تو ایک عام اور معمولی ان پڑھ عورت ٹھہری لیکن گاؤں اور شہروں میں بھی کیا ایسے بے شمار تعلیم یافتہ لوگ نہیں ہیں جو آئے دن اسی قسم کے مضحکہ خیز فعل کیا کرتے ہیں اور جو سمجھتے ہیں کہ خواہ کچھ بھی کر رہے ہو لیکن کھانا چھوٹا بچا لینے سے کوئی پاپ نہیں ہوتا تب ممکن ہے کہ اس ملک کے مردوں کا حال دیکھ کر ہنسی نہیں آتی ہنسی آتی ہے صرف عورتوں کی حالت دیکھ کر۔ آج سرشام ہی آسان میں تھوڑے تھوڑے بادل جمع ہو رہے تھے۔ رات ایک بجے کے بعد معمولی سی بارش ہوئی اور ہوا بھی

آنے پر.....

نند میری طرف دیکھ کر بولا..... ”کلکتے سے ایک ہانڈی میں عمدہ رس گلے لایا تھا بابو جی جہاز پر سوار ہونے تک کہتا رہا، آؤ مگر کچھ کھا لیکن۔ روح کو ایذا نہ دیں، لیکن نہیں..... لیکن نہیں.....“ میں رنگون لے جاؤں گی، (مگر سے) لے اب لے جا رنگون، کیا لے جاتی ہے!“

نگر نے اس سخت الزام کا صاف طور سے کوئی جواب نہ دے کر غرور سے میری طرف دیکھا اور پھر اس بد نصیب کا بلی کو اپنی نظر سے پہلے کی مانند جلانے لگی۔

میں نے آہستہ سے پوچھا..... ”رس گلوں کا کیا ہوا؟“

نند نگر کو مخاطب کر کے طنز سے بولا..... ”ان کا کیا ہو یہ کہہ نہیں سکتا وہ دیکھیے پھوٹی ہانڈی اور وہ دیکھیے بچھونے پر گرا ہوا رس۔ اس سے زیادہ کچھ جاننا چاہو تو پوچھو اس حرامزدے سے اتنا کہہ کر نگر کی نگاہوں کا تعاقب کر کے وہ بھی تیز نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے بڑی مشکل سے ہنسی کو روکتے ہوئے منہ نیچا کر کے کہا..... ”تو جانے دو، کیا تمہارے پاس چڑوا تو ہے؟“

نند بولا..... اس طرف سے بھی چھٹی مل گئی ہے۔ بابو جی کو ایک دفعہ دیکھا تو دو گرا!“

نگر نے ایک چھوٹی سی پوٹلی کو پاؤں سے ٹکراتے ہوئے کہا، ”دکھا دو نہ تم ہی۔“

نند بولا..... ”جو بھی کہو بابو، کا بلی تو تم تک حرام نہیں کہی جاسکتی۔ یہ لوگ جس طرح رس گلے کھا جاتے ہیں اسی طرح اپنے کا بلی کی موٹی موٹی روٹیاں بھی باندھ دیتے ہیں۔ بھیکنا نہیں نگر، رکھ چھوڑ، تمہارے ٹھاکر جی کے بھوکے کام میں آ جائیں گی۔“

نند کے اس مذاق پر میں زور سے ہنس پڑا مگر دوسرے ہی لمحہ نگر کے منہ کی طرف دیکھ کر ڈر گیا۔ غصہ کے مارے اس کا تمام چہرے سیاہ پڑ گیا۔ بلند لہجے میں جہاز کے تمام مسافروں کو چونکا کر وہ چلا اٹھی..... ”جاتی تک مت جانا بھلا مستی! کہے دیتی ہوں..... اچھا نہ ہوگا، ہاں!“

اس کی چلا ہٹ سے جن لوگوں نے منہ اٹھا کر اس طرف دیکھا، ان کی حیران نگاہوں کے رو برو، شرم کے مارے نند کا چہرے ذرا سا نکل آیا۔ نگر کروہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اپنی بے موقعہ اور وہابیات دل لگی کی وجہ سے پیدا ہوئے اس کے غصے کو کسی طرح فرو کرنے میں ہی اس کی خیریت تھی۔ شرمندہ ہو کر وہ فوراً بول اٹھا..... ”سری قسم نگر، غصے مت ہو میں تو محض مذاق کر رہا تھا۔“

نگر نے گویا یہ بات سنی ہی نہ ہو۔ پتلیاں اور بھونکیں ایک دفعہ بائیں طرف اور ایک دفعہ دائیں طرف گھما کر اور گلے کے لہجے پر ایک اور پردہ چڑھا کر وہ بولی..... ”مذاق کیسا؟ جاتی کے متعلق بھی

کوئی مذاق کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی روٹیوں سے بھوک لگایا جائے گا؟ کیوٹ کے منہ میں آگ۔ ضرورت ہو تو تم ہی رکھ چھوڑو۔ باپ کے نام پر ان کا پنڈ دان کر دینا۔“

رسی کھول دینے سے کمان جس طرح سیدھی ہو جاتی ہے نند اسی طرح سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا اور اس نے نگر کا جھوٹا، پکڑ لیا..... ”حرامزادی تو باپ تک جاتی ہے۔“

نگر کمر کا کپڑا اسنبھالتے ہوئے ہانپتے ہانپتے بولی..... ”اور حرامزادے تو جاتی تک جائے گا۔“ اتنا کہہ کر کانوں تک منہ پھاڑ کر اس نے نند کے بازو کے ایک حصہ میں کاٹ کھایا۔ چشم زدن میں ہی نند مستری اور نگر ویشٹوی کی کشتی گہری ہو اٹھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب لوگ گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ بھیڑ جمع ہو گئی۔ سمند کی بیماری کی تکلیف کو بھول کر ہندوستانی واہ واہ کرنے لگے۔ پنجابی چھپی چھپی کرنے لگے اڑیا جیس چیس کرنے لگے ایک طرح سے مکمل لڑکا کاٹھ، مچ گیا۔ میں سناٹے میں آ گیا اور میرے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اتنی معمولی سی بات پر شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر اس قسم کا برہنہ ناچ ہو سکتا ہے اس کا میں تصور تک بھی نہ کر سکتا تھا اور اس کے علاوہ وہ ایک بنگالی شوہر اور بیوی کی طرف سے یہ سب کچھ جہاز بھر کے لوگوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں زمین میں گڑا جانے لگا۔ قریب ہی ایک جو پوری دربان نہایت اطمینان کے ساتھ تماشا دیکھ رہا تھا۔ میری طرف مخاطب ہو کر بولا..... ”بابو جی، بنگال تو خوب اچھی لڑنے والی ہے، ہنپی ہی نہیں۔“

میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکا۔ چپ چاپ گردن جھکائے کسی طرح بھیڑ کو چیرتا ہوا اوپر بھاگ آیا۔

اس دن پھر میرا دل نہ چاہا کہ نیچے جاؤں اس لیے نند اور نگر کی لڑائی کا خاتمہ کس طرح ہوا۔ صلح نامہ میں کون کون سی شرطیں طے ہوئیں میں کچھ بھی نہیں جانتا لیکن بعد میں میں نے دیکھا کہ شرائط خواہ کچھ بھی ہوں مصیبت کے وقت وہ سکریپ آف پیپرز کاغذ کا ردی نگر کسی کام نہیں آتا۔ جب جسے ضرورت ہے کھیل کی طرح اسے پھاڑ ڈالتا ہے اور دوسرے کے گھر میں گھس جاتا ہے بیس سالوں سے وہ اسی طرح کرتے آئے ہیں اور خود پر ماتما بھی اس بات کی قسم نہیں لے سکتے کہ آئندہ بیس سال تک ایسا نہ کرتے رہیں گے۔

تمام دن بھر تو ابر کے ٹکڑے ادھر ادھر گھومتے رہے لیکن اب شام کو تقریباً ایک گہرا اور سیاہ بادل تمام فضاے آسمانی کو ڈھانپ کر آہستہ آہستہ سراٹھا کر اوپر آنے لگا۔ معلوم ہوا کہ خلاصیوں کی آنکھوں اور چہرے پر گہرا ہٹ کے آثار پیدا ہو اٹھے ہیں۔ ان کی نقل و حرکت میں بھی ایک قسم کی پریشانی نظر آنے لگی ہے جو اس سے پہلے نہ تھی۔

کار ایک ایسی جگہ مل گئی جس کا میں نے پہلے تصور ہی نہ کیا تھا۔ ایک کنارے بہت سی بھیتوں، مرغیوں اور بٹخوں کے پنجرے ایک کے اوپر دوسرے پڑے ہوئے تھے۔ اچھل کر میں انہیں کراہ پر بیٹھ گیا۔ معلوم ہوا کہ ایسی محفوظ جگہ شاید تمام جہاز بھر میں کہیں نہیں ہے مگر ابھی تک بہت سی باتوں کا جاننا باقی تھا۔

بارش، ہوا، تاریکی اور جہاز کا جھولنا رفتہ رفتہ زیادہ سے زیادہ ترہونے لگے۔ سمندر کی لہروں کی شکل و صورت دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں سوچا شاید یہی وہ سائی کلون ہے لیکن وہ سمندر کے مقابلہ میں صرف گائے کے کھر کے گڑھے کی مانند ہی تھا اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے مجھے کچھ دیر اور بھی ٹھہرنا پڑا۔ اچانک سینے میں کپکپی پیدا کرتا ہوا جہاز بھول پول بج اٹھا اور دیکھا تو معلوم ہوا کسی سحر کے اثر سے آسمان کا چہرہ بھی تبدیل ہو گیا ہے۔ وہ بادل اب نہیں رہے۔ ایسا معلوم ہوا کہا چاروں طرف سے پھٹ کر اور ہلکا ہو کر آسمان ادھر کی طرف اڑا جا رہا ہے۔ دوسرے ہی لمحہ سمندر کے ایک حصے سے ایسی خوفناک گرج سنائی دی کہ اس کو ادا کرنے کے لیے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں۔

لڑکپن میں، اندھیری راتوں دادی کی چھاتی سے لگ کر ایک کہانی سنا کرتا تھا کسی راجہ کے بیٹے نے ڈبکی لگا کر تالاب کے اندر سے چاندی کی ایک ڈبیانکا لی تھی اور اس نے سات سوراکشوں کی جان سونے کے ایک بھونرے کو چنگی سے مسل کر مار ڈالا تھا اور اس کے بعد ان راکشوں کی سات سو بیویاں موت کے غم سے غمگین ہو کر چیتنی چلاتی اور تمام روئے زمین کو پاؤں کے بوجھ سے کچل کر چور چور کرتی ہوئیں دوڑ آئی تھیں۔ ایسا ہی کوئی یہ انقلاب بھی تھا لیکن فرق اتنا تھا کہ اب ان سات سو کی بجائے کروڑوں راکش عورتیں تھیں۔ وہ مضطرب و بے قرار ہو کر ہنگامہ کرتی ہوئی اسی طرف دوڑی آ رہی تھیں۔ آ بھی گئیں۔ راکش عورتیں ہی نہیں بلکہ طوفانی ہوائیں۔ تب میں نے سوچا کہ ان کی نسبت تو وہ راکش عورتیں ہی آ جاتیں تو اچھا تھا۔

اس لرزہ خیز طوفان کی طاقت کا ذکر کرتا تو دور کی بات ہے۔ ہوش بجا کر اس کو محسوس کرنا بھی انسانی طاقت سے بعید ہے۔ تمام تر قوت تیز گم کر کے صرف ایک ہی خیال میرے دل میں جا گرین ہو چکا تھا۔ کہ دنیا کی معیاد ختم ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ میرے پاس ہی لوہے کا ایک کھونٹا تھا اور میں نے اپنے آپ کو گٹے کی چادر سے اس کے ساتھ خوب کس کر باندھ رکھا تھا ہر آن میرے دل میں یہی خیال اٹھنے لگا کہ بس یہی طوفان مجھے کھونٹے سے چھڑا دے گا اور سمندر کی لہروں پر اڑا کر پھینک دے گا۔

اچانک معلوم ہوا کہ سیاہ رنگ کا پانی اندر کے دھکوں سے اچھل اچھل کر آہستہ آہستہ جہاز کے اوپر چڑھ رہا ہے۔ دور نظر دوڑانے پر نگاہ پھر واپس نہ لوٹ سکی۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ کوئی پہاڑ ہے لیکن

ایک بوڑھے سے خلاصی کو ہلا کر پوچھا۔ ”اجی چودھری جی، آج رات کو بھی کل کی طرح طوفان آئے گا کیا؟“

التجا ہے چودھری بھی قابو میں آگئے کھڑے ہو کر بولے۔ ”آقا، نیچے چلے جائیے، کپتان نے کہا ہے سائی کلون (طوفان) اٹھ سکتا ہے۔“

پندرہ منٹ بعد ہی دیکھا کہ اس کی بات غلط نہ تھی جتنے بھی مسافر اوپر تھے ان سب کو خلاصی لوگ جبراً ہولڈر میں اتارنے لگے۔ دو چار لوگوں کے اعتراض کرنے پر سیکنڈ آفیسر نے خود آ کر انہیں دھکے مار کر اٹھا دیا اور ان کے بستر وغیرہ کو لالتوں سے ہٹانا شروع کر دیا۔ میرا ٹریک بستر تو خلاصی لوگ جھٹ پٹ نیچے اٹھا لے گئے۔ مگر میں خود ایک طرف کھسک گیا۔ میں نے سنا کہ سب کو..... یعنی جو بد قسمت دس روپے سے زیادہ کرایہ نہ دے سکتے تھے انہیں جہاز کے پیٹ میں (اندر) بھر کر اس کام نہ بند کر دیا جائے گا۔ ان کی اور جہاز کی خیریت کے لیے یہی ایک طریقہ تھا۔

لیکن مجھے خود اپنے لئے خیریت کا یہ طریقہ بالکل ہی پسند نہ آیا۔ اس سے پیشتر سائی کلون جیسی شے کو سمندر تو کیا خشکی پر بھی کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لیے اس بات کا اندازہ کر لیا کہ اس کی شکل و صورت کیا ہوتی ہے اور اس میں تباہی کرنے کی کتنی طاقت ہوتی ہے۔ یہ بالکل ہی مشکل امر تھا۔ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اگر میری قسمت میں اس مصیبت سے دو چار ہونا لکھا ہی ہے تو میں اسے اچھی طرح دیکھنے بغیر نہ چھوڑوں گا۔ تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے ہو کر ہی رہے گا اور طوفان میں اگر غرق ہونا ضروری ہی ہے تو پبلنگ کے چوہے کی طرح پنجرے میں قید ہو کر اوپر سر پٹک پٹک کر کھارے پانی میں کیوں مروں؟ اس کی نسبت تو جہاں تک ہو سکے ہاتھ پاؤں ہلا کر، لہروں کے جھولے پر جھومتے اترتے ہوئے ایک غوطہ لگا کر پاتال کے شای محل کا مہمان ہونا کہیں زیادہ اچھا ہے۔ مگر یہ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ راجا کا جہاز اپنے آگے پیچھے لاکھوں کروڑوں پیروؤں کو ساتھ لئے بغیر کالے پانی میں ایک قدم بھی نہیں چلتا اور انہیں لوگوں کا ناشتہ کر ڈالنے میں گھڑی بھر کی دیر بھی نہیں لگتی۔

بہت دیر سے ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی شام کے قریب ہوا اور بارش دونوں کا ہی زور بڑھ گیا یہ حالت ہو گئی کے بھاگ نکلنے کا بھی کوئی راستہ نہ رہا۔ جہاں بھی ممکن ہو آسانی سے پناہ کی کوئی جگہ تلاش کئے بغیر تو کام نہیں چل سکتا۔ شام کی تاریکی میں جب میں اپنی جگہ پرواہیں آیا تو اوپر کا ڈیک خالی ہو چکا تھا۔ مستول کے پاس ایک کرو دیکھا کہ عین سامنے ہی بوڑھا کپتان ہاتھ میں دو رین لینے ادھر ادھر دوڑ رہا ہے۔ اس خوف سے کہ یکا یک اس کی نگاہ مبارک پڑ کر اتنی مصیبت کے بعد بھی دوبارہ اسی گڑھے میں نہ گھسنا پڑنے ایک ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں آرام سے بیٹھ سکوں۔ تلاش کرتے کرتے آخر

دوسرے ہی لمحہ وہم جاتا رہا تو ہاتھ جوڑ کر میں نے کہا بھگوان جس طرح تم نے یہ آنکھیں عطا کی ہیں اس طرح ان کو مبارک بھی کر دیا۔ اتنے دنوں تک تو دنیا میں ہر جگہ آنکھیں کھولے گھومتا پھرا ہوں مگر تمہاری یہ دنیا تو میں نے کہیں بھی نہیں دیکھی۔ جہاں تک نظر کام کرتی ہے ایک جسم اور کوہ آسا ہر سر پر چاندی کا تاج زیب کئے تیز رفتار سے آگے بڑھتی آرہی ہے۔ دنیا میں اتنا رعب و اجوبہ اور بھی کہیں ہے؟

سمندر کی راہ نامعلوم کتنے لوگ آیا جاتا کرتے ہیں۔ میں خود بھی تو کتنی ہی مرتبہ اس راستے آیا گیا ہوں مگر ایسا منظر تو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ جس انسان نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا اسے سمجھا کر بتانا تصور کے باپ کی بھی طاقت میں نہیں کہ پانی کی لہر اتنی بڑی ہو سکتی ہے۔

دل ہی دل میں کہا اے لہروں کے سر تاج، تمہاری ایک لکر سے ہمارا جو کچھ ہوگا اسے تو ہم جانتے ہی ہیں لیکن ابھی تو تمہارے یہاں پہنچنے میں آدھے منٹ کی دیر ہے کم از کم اتنی دیر تک تو میں جی بھر کر تمہارا دیدار کر لوں۔“

یہ جذبہ کسی شے کی غیر معمولی بلندی اور وسعت دیکھ کر ہی اس طرح دل میں پیدا نہیں ہوا کرتا کیونکہ اگر ایسا ہو تو اس کے لیے ہمالیہ کا ہر ایک حصہ کافی ہے مگر جو شے اس طرح مجسم ہو کر بھاگی چلی آرہی تھی اس کی بے مثل طاقت نے مجھے فریفتہ کر ڈالا۔

سمندر کے پانی کے نگرانے سے ایک قسم کا شعلہ بار بار چمک اٹھتا ہے وہ شعلہ عجیب و غریب خطوط میں اگر اس کے سر پر نہ کھیلتا ہوتا تو سنجیدہ اور سیاہ لہروں کی تیزی میں اس تاریکی میں شاید اس طرح نہ دیکھ سکتا۔ اس وقت جتنی دور تک بھی میری نظر جاتی تھی اتنی دور تک اس روشنی نے چھوٹے چھوٹے جزیروں کو جلا کر اس خوفناک خوبصورتی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے کھول دیا۔

جہاز کا بھول پون بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لگا تار کانپتی ہوئی آواز میں بجتے لگا اور خوفزدہ اور گھبرائے ہوئے ملاحوں کا گروہ اللہ کے کانوں تک اپنی فریاد پہنچانے کے لیے گلا پھاڑ پھاڑ کر ایک ساتھ چلانے لگا۔

جس کی تشریف فرمائی سے اتنا خوف، اتنی چیخ و پکار، اتنی دوڑ دھوپ ہو رہی تھی وہ عظیم لہر آخر آ پہنچی۔ ایک خوفناک قسم کی الٹ پلٹ کے درمیان ہر ولہ کی طرح ہمیں معلوم ہو کہ ہم ڈوب گئے ہیں اس لیے درگاہ کا نام چنے سے اب کیا حاصل ہوگا؟ آس پاس اوپر نیچے چاروں طرف سیاہ پانی ہی پانی ہے۔ جہاز کے ہمراہ سب لوگ پاتال کے شاہی محل میں دعوت کھانے جارہے ہیں۔ اس میں اب کوئی شک نہ رہا۔ اس وقت فکر صرف یہی تھا کہ دعوت کا سامان اور کھانا پیانا ہاں کس قسم کا ہوگا؟

تقریباً ایک منٹ بعد ہی دکھائی دیا۔ ”نہیں..... ڈوبے نہیں ہیں۔ جہاز کے ساتھ ہم سب

صرف پانی کے اوپر تیر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لہر پر لہر آنے کا سلسلہ بھی ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اتنی دیر بعد اب معلوم ہوا کہ کپتان صاحب نے سب لوگوں کو جانوروں کی طرح گڑھے میں بند کر کے تالا لگوا دیا تھا۔ ڈیک کے اوپر سے گاہے گاہے پانی کی دھار بہنے لگی۔ میرے نیچے کی ٹخیں اور مرغیاں کتنی ہی مرتبہ پھڑ پھڑا کر اور بھیڑیں کئی بار میں میں، کر کے مر گئیں۔ صرف میں ہی ان کے اوپر پناہ لیے ہوئے لوہے کے کھونٹے کو زور سے پکڑے ہوئے سانس کی آمد و رفت کو قائم رکھا۔

اسی وقت ایک اور آفت آ سوار ہوئی۔ صرف پانی کے چھینٹے ہی جسم میں سوئی کی طرح نہیں چھو رہے تھے بلکہ تمام کپڑے اور دھوتی تک کے بھیگ جانے کی وجہ سے نہایت تیز ہوا سے اتنی سخت سردی لگنے لگی کہ دانت کٹا کٹ بجتے لگے۔ خیال آیا کہ فی الحال پانی میں ڈوبنے سے تو کسی طرح بچ بھی سکتا ہوں لیکن نمونیا کے ہاتھوں کس طرح نجات پاؤں گا اور یہ تو میں نے بلا شک و شبہ محسوس کر لیا کہ اسی طرح اگر اور بھی کچھ دیر بیٹھا رہا تو نجات پانا بچ بچ ہی ناممکن ہو جائے گا۔ لہذا جس طرح بھی ہوا اس جگہ کو چھوڑ کر کسی اور جگہ پناہ لینی چاہیے جہاں پانی کے چھینٹے برجھیں کی نوک کی طرح میرے جسم میں نہ چھیں۔ ایک بار سوچا کہ بھیڑوں کے پنجرے میں گھس جاؤں تو کیسا ہو؟ لیکن وہ بھی کتنا محفوظ ہے؟ اس کے اندر اگر کھارے پانی کی لہر داخل ہو جائے تو میں میں کر کے نہ ہی لیکن بالآخر ماں ماں، کر کے تو ضرور ہی اپنا قصہ ختم کرنا ہی پڑے گا۔

صرف ایک ہی طریقہ تھا۔ جہاز جب اپنی چال تبدیل کرتا ہے تو بھاگنے کا کچھ موقع مل جاتا ہے اس لیے اس وقت اگر اور کہیں جا کر گھس سکوں تو شاید جان بچ جائے۔ جو سوچا تھا وہی کیا مگر پنجروں پر سے نیچے اتر کر تین بار دوڑ کر اور تین بار بیٹھ کر جب کسی طرح سیکنڈ کلاس کے مسافروں کے دروازے پر پہنچا تو دیکھا کہ دروازہ بند ہے لوہے کے دروازے نے ہزار دھکامشتی کرنے پر بھی راستہ نہ دیا۔ اس لئے راستہ پھر طے کر کے اسی طرح فٹ کلاس کے دروازے پر آ حاضر ہوا۔ اس دفعہ قسمت نے خوش ہو کر اس نرالے کمرہ میں پناہ دے دی اور ذرا سا بھی پس و پیش کے بغیر میں دروازہ بند کر کے پلنگ پر جا سویا۔

رات کے بارہ بجے سے پہلے ہی طوفان تو ختم گیا لیکن سمندر کا غصہ اگلے دن صبح تک بھی فرو نہ ہوا۔

میرے سامان اور دیگر ہر ای مسافروں کا کیا حال ہوا اور خصوصاً بیوی کے ساتھ مستری جی نے رات کس طرح گزاری۔ یہ جاننے کے لیے میں صبح نیچے اتر گیا۔ کل نند مستری نے ذرا سی دل لگی کرتے ہوئے کہا تھا کہ بابو جی ساڑھے بیس قسم کے چیتے کی طرح ہم لوگ آپس میں تھم گھا ہو گئے

”بابو صاحب ایک بنگالی عورت آپ کو بلا رہی ہے۔“

عورت، سمجھا کہ نگر ہوگی، کیوں بلا رہی ہے یہ بھی اندازہ کر لینا مشکل نہ تھا۔ یقیناً ہی مستری کے ساتھ شوہر اور بیوی کے حقوق ثابت کرنے کے سوال پر اختلاف رائے ہو گیا ہوگا مگر میری ضرورت کیوں آپڑی۔

(آگنی پریشکا) کے سوا کسی بھی غیر آدمی نے آ کر کبھی اس کا فیصلہ کیا ہو یہ سوچنا بھی مشکل

ہے۔

میں نے کہا..... ”گھنٹہ بھر بعد آؤں گا کہہ دینا۔“

اس نے مغموم ہو کر کہا..... ”نہیں بابو صاحب بڑی منت سے بلا رہی ہے۔“

”منت سے“ لیکن نگر تو منت کرنے والی عورت نہیں ہے پوچھا۔ اس کا ساتھی مرد کیا کر رہا

ہے؟“

وہ بولا..... ”اسی کی بیماری کی وجہ سے تو وہ آپ کو بلا رہی ہے۔“

بیماری ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اس لیے میں اٹھ کھڑا ہوا وہ مجھے اپنے ساتھ لے آیا۔ کافی دور ایک کونے میں لیٹے ہوئے کچھ موٹے موٹے رے رکھے تھے۔ ان کی آڑ میں ایک بائیس تیس سال کی بنگالی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے اس کو دیکھا نہ تھا۔ پاس ہی ایک نیلی شطرنجی پر تقریباً اسی عمر کا ایک نہایت کمزور اور لاغر جوان مردے کی طرح آنکھیں بند کئے پڑا تھا..... یہی بیمار تھا۔

میرے پاس پہنچتے ہی اس عورت نے آہستہ آہستہ اپنے سر کا کپڑا آگے کھینچ لیا لیکن میں اس کا چہرے دیکھ چکا تھا۔

اس چہرے کو اگر حسین کہا جاتے تو بحث اٹھ سکتی ہے لیکن نظر انداز کر دینے کے قابل بھی نہ تھا۔ بلند پیشانی عورتوں کے جن میں کوئی خاص وقعت نہیں رکھتی۔ تاہم اس حسینہ کی فراخ پیشانی پر سلیم عقل اور فہم و فراست کا وہ نقش دیکھا جو زندگی میں شاذ و نادر ہی دیکھا تھا۔ میری ان داغی کی پیشانی بھی خوب فراخ تھی۔ اس کی پیشانی بھی اس سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی ماگ میں سیندور جھلک رہا تھا۔ ہاتھ میں لوہے کی چوڑیاں اور شٹھ کی مالا کی علاوہ اور کوئی زیور نہ تھا جسم پر ایک سیدھی سادھی رنگین ساڑھی تھی۔

کوئی تعارف نہ ہونے کے باوجود بھی اتنے قدرتی لہجہ میں اس نے بات کی کہ میں حیران رہ گیا۔ وہ بولی..... ”آپ کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی جان پہچان ہے کیا آپ انہیں ایک دفعہ بلا سکتے ہیں؟“

تھے اور ابھی کچھ دیر پہلے سب لوگ اپنی اپنی جگہ آ کر بیٹھے ہیں۔ آج کا گتھم گتھا ساڑھے تیس قسم میں شمار ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہ مجھے معلوم نہیں مگر اس وقت کوئی بھی اپنی اصلی جگہ پر لوٹ کر جانے نہ پایا تھا یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

ان لوگوں کی حالت دیکھ کر سچ مچ ہی رونا آ گیا۔ ان تین چار سو مسافروں میں سے کسی کی طاقت کی بات تو کیا..... شاید صحیح و سالم بھی کوئی نہیں بچا تھا۔ عورتیں جس طرح سل پر بنے سے مصالہ گزرتی ہیں کل کا سائی کون تمام رات بھر اسی طرح ان لوگوں کا مصالہ رگڑتا رہا۔ ساز و سامان کے ساتھ صندوق پیٹیوں وغیرہ کے ساتھ یہ سب لوگ رات بھر جہاز کے اس کنارے سے اس کنارے تک لڑھکتے پھرتے رہے تھے اور دوسری دو حاجات اس کثرت سے ہو گئیں کہ بدبو کے مارے کھڑا ہونا بھی دو بھر ہو رہا تھا اور اس وقت ڈاکٹر بابو جہاز کے مہتر اور ملاحوں کو ساتھ لیے ان لوگوں کی صفائی کرنے کا انتظام کر رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب اوپر سے نیچے تک بار بار بات میرا ملاحظہ کر کے شاید مجھے سینکڑوں کلاس کا مسافر خیال کئے بیٹھے تھے۔ نہایت استعجاب کے ساتھ بولے جناب تو خوب تازہ نظر آ رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ آرام فرمانے کے لیے کوئی ہیماک (جہاز پر رہنے والا ایک طرح کا جھولن کھٹولا) مل گیا ہوگا، کیوں نا؟“

”ہیماک“ کہاں سے ملتا صاحب! ملا تھا بھینڑوں کا ایک پنجرہ۔ اس لیے تروتازہ معلوم ہو رہا ہوں۔“

ڈاکٹر صاحب منہ پھاڑ کر میری طرف دیکھتے رہ گئے میں بولا..... ”یہ نا چیز بھی اسی جہنم کا مسافر ہے لیکن کمزور ہونے کے باعث یہاں گھس نہ سکا اور شروع ہی سے ڈیک کے اوپر رہا۔ کل سائی کون کی اطلاع پا کر کچھ دیر بھینڑوں کے پنجروں پر بیٹھ کر اور رات کو فرسٹ کلاس کے کمزے میں زبردستی قبضہ کر کے جان بچائی کیا فرماتے ہیں آپ؟ میں نے کچھ نا جائز تو نہیں کیا؟“

تمام کہانی سن کر ڈاکٹر صاحب اس قدر خوش ہوئے کہ باقی دو دن کاٹنے کے لیے اپنے ذاتی کمرہ میں رہنے کی دعوت انہوں نے اس وقت دے دی۔ میں ان کی دعوت کو قبول نہ کر سکا لیکن اتنا فائدہ ضرور اٹھایا کہ صرف ایک کرسی میں ان سے لے لی۔

دوپہر کے وقت بھوک سے بے تاب ہو کر مردوں کی طرح دنیا کی تمام کھانے پینے والی چیزوں کا تصور باندھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کس طرح اور کہاں جا کر کھانے کو کچھ مل سکتا ہے؟ عین اسی وقت جب کہ میں اس تشویش میں مبتلا تھا۔ کھدر پور کے مسلمان درزیوں میں سے ایک نے آ کر کہا.....

ڈاکٹر صاحب بولے..... ”تو بس ٹکرا جاؤ ایسی کوئی بری بھی نہیں ہے۔ اس آدمی کی شکل دیکھی تھی؟ اس پر ٹائیفائیڈ کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ ممکن نہیں کہ وہ زیادہ دن زندہ سلامت رہے۔ اس دوران میں اس پر نظر جمائے رکھنا ایسا نہ ہو کوئی اور سالا مال ہضم کر جائے۔“

میں بھونچکا ہو کر رہ گیا۔ کہا..... ”آپ یہ سب کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟“

ڈاکٹر صاحب ذرا سے بھی مرعوب نہ ہوئے انہوں نے جواب دیا..... ”اچھا وہ چھو کرا ہی اسے گھر سے بھگا لایا ہے تم کیا سمجھتے ہو۔ شری کانت بابو، خوب فارورڈ ہے۔ گفتگو تو خوب اچھی کرتی ہے۔“

میں نے کہا..... ”یہ خیال آپ کے دل میں کیوں آیا؟“

ڈاکٹر صاحب بولے..... ”ہر ایک سفر میں تو دیکھتا ہوں کہ ایک ایسا کیس ہو ہی جاتا ہے گذشتہ مرتبہ بھی ایک اسی قسم کی جوڑی تھی۔ ایک بار برامیں جا کر قدم تو رکھو خود دیکھ لو گے کہ میری بات سچ ہے یا نہیں۔“

ان کی برامدالی بات کی حقیقت کو بعد میں میں نے خوب اچھی طرح محسوس کیا لیکن اس وقت تو میں لرزہ بر اندام ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے رخصت لے کر میں نند مستری کی خبر لینے کے لیے نیچے آیا۔ گھر والی کے ہمراہ پھل آبار (پھلوں کے کھانے) کی تیاری کر رہے تھے۔ نمسکار کرنے کے بعد سب سے پہلے اس نے یہ سوال کیا کہ بابو یہ عورت کون ہے؟“

نگر سر درد ہونے کی وجہ سے اپنے سر پر ایک کپڑا پکڑی کی طرح باندھ رہی تھی۔ یک لخت

پھنکار کر بول اٹھی..... ”یہ معلوم کرنے کی تمہیں کیا غرض پڑی ہے بتاؤ تو سہی؟“

مستری نے مجھے ثالث مقرر کر کے کہا..... ”صاحب دیکھی اس عورت کی اوجھی طبیعت، کون بنگالی عورت رنگون جا رہی ہے یہ دریافت کرنا بھی گویا کوئی گناہ ہے؟“

نگر اپنا سر درد بھول گئی اور پکڑی کو پرے پھینک کر میری طرف تانے لگی اس نے اپنی دونوں گول گول آنکھیں چھا کر کہا..... ”صاحب! ویشنوی نگر نے آج تک مستری جیسے کتنے انسانوں کو باندھ بنا کر اپنے ہاتھوں سے نکال دیا ہے اب بھی کیا یہ میری تجربہ کار آنکھوں میں خاک جھونک سکتے ہیں؟ ارے تم ڈاکٹر ہو یا وید کہ میں جو نبی ذرا سا پانی لینے کے لیے گئی تم جھٹ دہاں جا پہنچے۔ کیوں وہ تمہاری کون ہے؟ یہ اچھا نہ ہوگا، کہہ دیتی ہوں مستری! اگر دوبارہ پھر کبھی جاتے دیکھوں گی تو یا تم ہو گے یا میں؟“

نند مستری نے گرم ہو کر کہا..... ”میں کیا تمہارا پالتو بندر ہوں کہ زنجیر پکڑ کر تم جس طرف لے

میں نے کہا..... ”آج ہی ان سے جان پہچان ہوئی ہے۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نیک انسان ہیں لیکن انہیں بلائی کیوں ہو؟“

اس نے جواب دیا..... ”اگر بلا نے پر فیس دینی پرتی ہو تو پھر ضرورت نہیں جس طرح بھی ہوگا یہ کچھ تکلیف اٹھا کر خود ہی اوپر چلے جائیں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے اس مریض کو دکھا دیا۔

میں نے سوچ کر کہا..... ”جہاز کے ڈاکٹر کو شاید کچھ بھی دینا نہیں ہوتا مگر انہیں ہو کیا گیا ہے؟“

میں نے سوچا تھا کہ مریض ان کا شوہر ہے لیکن بات چیت سے کچھ شک پیدا ہوا۔ اس کے منہ پر جھک کر اس نے پوچھا..... ”گھر سے چلتے وقت ہی تمہیں پیٹ کی شکایت تھی نا؟“

مریض نے سر ہلا دیا تو اس نے سراٹھا کر کہا..... ”ہاں انہیں گھر پر ہی پیٹ کی بیماری تھی لیکن کل سے بخار آ گیا ہے۔ اس وقت دیکھتی ہوں کہ بخار تیز ہو گیا ہے کچھ دوائی دیئے بغیر کام نہ چلے گا۔“

میں نے بھی خود ہاتھ ڈال کر اس کے جسم کا بخار دیکھا۔ درحقیقت بخار تیز تھا۔ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے میں اوپر چلا گیا۔

ڈاکٹر صاحب نیچے آئے مریض کا ملاحظہ کر کے اور دوائی کا پرزہ دے کر بولے، چلو شری کانت بابو، کمرے میں چل کر کچھ گپ شپ کریں۔“

ڈاکٹر صاحب خوب رنگین مزاج تھے اپنے کمرے میں لے جا کر بولے..... ”چائے پیتے ہیں؟“

میں نے کہا ”ہاں پیتا ہوں۔“

”اور بسکٹ؟“

”وہ بھی کھاتا ہوں“

”اچھا“

کھانا پینا ختم ہونے کے بعد دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر صاحب بولے..... ”آپ اس عورت سے کیسے جا نکر آئے؟“

میں نے کہا ”اس نے خود ہی مجھے بلا بھیجا تھا۔“

ڈاکٹر صاحب اس طرح سر ہلا کر بولے گویا سب کچھ جانتے ہو بولے..... ”بلانا ہی چاہئے۔“

شادی وغیرہ کی ہے یا نہیں؟“

میں نے کہا..... ”نہیں“

کہ میرے دل میں بلا خواہش ہی اگرچہ سخت تنقید کا جذبہ برابر بیدار ہوا اٹھاتا تھا تاہم اس عورت کی تمام تر گفتگو کے درمیان میں کسی جگہ بھی کوئی نامناسب یا غیر موزوں مقام تلاش نہ کر سکا۔

ابھی میں دوسرے کو قابو کر لینے کی حیرت انگیز طاقت تھی۔ اس دوران میں اس نے نہ صرف میرا نام اور پتہ ہی دریافت کر لیا بلکہ میں اس کے لاپتہ شوہر کو جس طرح بھی ممکن ہوگا تلاش کر دوں گا۔ اس بات کا وعدہ بھی مجھ سے لے لیا۔ اس کا شوہر آٹھ سال پہلے برما میں ملازمت کرنے کے لیے آیا تھا۔ دو سال تک اس کے خط وغیرہ آتے رہے لیکن اب لگاتار چھ سالوں سے اس کا کچھ پتہ نہیں ہے گھر پر قبیلے کا اور کوئی نہیں ہے۔ ماں تھیں وہ بھی تقریباً ایک مہینہ پہلے گزر گئیں۔ باپ کے گھر کسی نگران سے محروم ہو کر رہنا ناممکن سمجھ کر بھائی کو رضامند کر کے برما آئی ہے۔

کچھ دیر خاموش رہ کر یکا یک وہ بول اٹھی..... ”اتنی سی کوشش بھی نہ کر کے اگر گھر میں ہی پڑی رہتی تو کیا یہ میرے حق میں اچھا ہوتا اس کے علاوہ اس عمر میں بدنامی خرید لیتے کتنی دیر لگتی ہے؟“ میں نے پوچھا..... ”کیا آپ جانتی ہیں کہ اتنے دنوں تک انہوں نے تمہاری کوئی خبر کیوں نہیں لی؟“

”اس سے پہلے وہ کہاں تھے؟ کچھ معلوم ہے؟“

”جانتی ہوں، رنگون میں ہی تھے۔ برما ریلوے میں کام کرتے تھے مگر کتنے ہی خط لکھے کبھی کوئی جواب نہ ملا اور کبھی کوئی خط واپس بھی نہ آیا۔“

یہ تو فیصلہ شدہ امر تھا کہ ہر خط ابھی کے شوہر کو مل گیا ہے مگر اس نے جواب کیوں نہیں دیا؟ اس کے متعلق میں نے ابھی ابھی ڈاکٹر صاحب سے سنا تھا۔ بیشتر بنگالی وہاں کسی برمی حسینہ کو گھر بیٹھا کرنی گزرتی بسا لیتے ہیں اور ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جو عمر بھر واپس نہیں آتے۔

مجھے خاموش دیکھ کر ابھی نے پوچھا..... ”کیا آپ یہی سمجھ رہے ہیں کہ وہ زندہ نہیں ہیں؟“ میں نے سر ہلا کر جواب دیا..... ”بلکہ اس کے بالکل برعکس وہ زندہ ہیں یہ تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں۔“

ابھی نے فوراً میرے پاؤں چھو کر پرنام کیا اور کہا..... ”آپ کے منہ میں پھول چندن پڑیں،

شری کانت بابو، میں اور کچھ نہیں چاہتی، وہ زندہ ہیں۔ بس اتنا ہی میرے لیے کافی ہے۔“

میں پھر خاموش ہو رہا۔ ابھی خود بھی کچھ دیر خاموش رہ کر بولی..... ”آپ کیا سوچ رہے

ہیں یہ میں جانتی ہوں۔“

”جانتی ہو؟“

”جانتی کیوں نہیں؟ آپ مرد ہو کر بھی جس بات کا خیال کر رہے ہیں۔ عورت ہوتے ہوئے

جاؤ گی اسی طرف جاؤں گا۔ میری خواہش ہوگی تو اس بے چارے کو دیکھنے جاؤں گا۔ تمہارے دل میں جو آئے کر۔“ اتنا کہہ کر اس نے پھل آہار میں جی لگایا۔

نگر نے بھی صرف ”اچھا“ کہہ کر اپنی پگڑی باندھنا شروع کر دیا۔ میں بھی وہاں سے چل دیا اور چلتے چلتے یہ سوچتا گیا کہ اسی طرح ان دونوں نے بیس سال گزار دیتے ہیں کئی مرتبہ ہاتھ جلا کر نگر اتنا سیکھی ہے کہ جہاں سچائی کی کوئی قید نہیں ہوتی وہاں لگام کو ذرا سا بھی ڈھیلا کر دینا اچھا نہیں ہوتا۔ دھوکہ کھانا ہی پڑتا ہے۔ یا تو آنکھوں پہر چوکنما ہو کر زبردستی سے اپنا قبضہ جمائے رکھنا پڑے گا ورنہ جوانی کی طرح نند مستری بھی کسی دن لاعلمی میں کھسک جائے گا۔

لیکن جس کی طرف اشارہ کر کے نگر کے دل میں یہ نارحسد جلی تھی اور جس کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے طنز کیا تھا وہ کون ہے؟ نگر نے کہا تھا..... ”یہی کام کرتے ہوئے میں نے اپنے بال سفید کئے ہیں۔ ایسی کوئی عورت نہیں جو میری آنکھوں میں خاک جھونک سکے۔“ ڈاکٹر صاحب نے اپنی رائے ظاہر کی تھی کہ ایسے واقعات روزانہ دیکھتے رہنے سے ان کی آنکھوں کو خاص مہارت ہو گئی ہے اور اس معاملہ میں اگر کوئی غلطی ہو تو وہ ایسی آنکھوں کا نکال پھینکنے کے لیے تیار ہیں۔

ایسا ہی قاعدہ ہے۔ دوسرے کے متعلق سوچتے وقت کبھی کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ وہ عالم الغیب نہیں ہے یا کہیں بھی اسے دھوکہ اور غلطی ہو سکتی ہے کوئی یہی کہتا ہے کہ انسان پہچاننے میں وہ بے مثل ہے اور اس معاملہ میں وہ پختہ کار جوہری ہے لیکن باایں ہمہ دنیا میں ایسی مثال ملتی مشکل نہیں کہ خود اپنے دل کو بھی کسی نے ٹھیک طور پر پہچانا ہو مگر ہاں میری طرح جس نے بھی کہیں سخت چوٹ کھائی ہے اسے یقیناً ہی غماظ ہونا پڑا ہے اور اس بات کو اسے دل ہی دل میں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دنیا میں جب ان دا جیتی جیسی عورتیں بھی ہیں تو اپنی عقل کے غرور سے دوسرے کو حقیر اور کم عقل سمجھ کر خود دانہ بننے کی نسبت سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے بھی ناکھ بنے رہنے میں زیادہ عقلمندی ہے لہذا ان دو تجربہ کار اور جہانگیرہ رد عورتوں کی نصیحت کو میں غلط سمجھ نہ سکا لیکن ڈاکٹر صاحب نے جو کہا تھا کہ نہایت صحیح معلوم ہوا اور محض یہی بات رہ رہ کر مجھے چھبے لگی۔

☆☆☆

بہت رات گزر جانے پر میں دوبارہ بلایا گیا اس وقت اس عورت کا حسب نسب معلوم ہوا۔ نام ابھی تھا۔ اتر اڑھی کا بیٹھہ اور گھر بابو جے کے نزدیک ہے۔ جو انسان بیمار پڑا ہے وہ گاؤں کے رشتہ سے بھائی ہوتا ہے۔ اس کا نام ہے روئی سنگھ۔ ”دوائی سے روئی سنگھ کو کافی فائدہ ہے۔“ اس طرح کہنا شروع کر کے تھوڑے ہی عرصہ میں ابھی نے مجھے اپنا راز دار بنالیا لیکن مجھے یہ تو تسلیم کرنا ہی چاہئے

بھی کیا مجھے ڈرنہ ہوگا؟“ رہنے دیجئے، مجھے اس کا ڈرنہ نہیں ہے میں اپنی سوت کے ساتھ مزے سے گریستی چلا سکوں گی۔“

پھر بھی میں خاموش ہی رہا مگر میرے دل کی بات کا اندازہ کرنے میں اس سمجھدار عورت کو کچھ بھی دیر نہ ہوئی بولی..... ”آپ سوچ رہے ہیں کہ گریستی چلانے کے لیے اکیلے میری رضامندی سے کام نہ چلے گا۔ میری سوت کا رضامند ہونا بھی ضروری ہے۔ آپ یہی سوچ رہے ہیں نا؟“

میں بھونچکا رہ گیا اور بولا..... ”ٹھیک ہے اگر ایسا ہی ہو تو پھر تم کیا کرو گی؟“

اس بار ابھیا کی آنکھیں پھلپھلا آئیں۔ وہ میرے منہ کی طرف اپنی تیز نگاہیں جما کر بولی..... ”ایسی مصیبت میں آپ مجھے کچھ بھی امداد نہ دیں گے۔ شری کانت باپو میرے بھیا بڑے سیدھے سادے نیک انسان ہیں اس لئے اس وقت ان سے تو میری کوئی بھلائی نہ ہوگی۔“

رضامند ہو کر میں نے کہا..... ”بن پڑے گا تو ضرور تمہاری مدد کروں گا مگر ان معاملات میں غیر لوگوں کے ذریعہ عموماً کوئی فائدہ نہیں ہوا کرتا بلکہ الٹا نقصان ہو جاتا ہے۔“

”یہ سچ ہے“ کہہ کر ابھیا کچھ سوچنے لگی۔

☆☆☆

دوسرے دن گیارہ بارہ بجے کے درمیان جہاز رنگون پہنچنے والا تھا لیکن صبح ہونے سے پیشتر ہی سب لوگوں کی آنکھوں اور چہروں پر خوف اور پریشانی کے نشانات نظر آنے لگے۔ چاروں طرف سے ایک آواز سنائی دینے لگی کیروئٹین کیروئٹین دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ٹھیک لفظ (Qwarantine) ہے۔ اس وقت برما کی حکومت پلگ کے خطرہ کے پیش نظر بہت زیادہ محتاط تھی شہر سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر ریت کے ایک میدان میں کانٹے دار تار سے تھوڑی سی جگہ گھیر کر بنائی گئی تھی اور اس میں بہت سی جھونپڑیاں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ ڈیک کے تمام مسافروں کو بلا سوچے سمجھے اس میں اتار دیا جاتا تھا۔ وہاں اگر کسی کا کوئی رشتہ دار شہر میں ہوتا اور وہ پورٹ ہیلتھ آفیسر سے جا کر کسی سفارش سے معافی نامہ حاصل کر لیتا تو علیحدہ بات تھی۔

ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں بلا کر مجھ سے بولے ”شری کانت باپو ایک معافی نامہ حاصل کئے بغیر آپ کا یہاں آنا مناسب نہیں ہوا۔ کاروئٹین میں لے جا کر یہ لوگ انسان کو اتنا تنگ کر دیتے ہیں کہ ذبح خانے میں گائے بیل بھیڑ وغیرہ جانوروں کو بھی اتنی تکلیف برداشت نہیں کرنا پڑتی۔ عام انسان تو اسے کسی طرح برداشت کر لیتے ہیں لیکن تکلیف تو شریف لوگوں کو ہوتی ہے۔ ایک تو یہاں کوئی مزدور نہیں ملتا۔ اپنا سامان خود اپنے ہی کندھوں پر لا کر ایک سیدھی اور ٹوٹی پھوٹی سیڑھی سے چڑھنا اترنا پڑتا

ہے۔ اس کے بعد کل سامان وہاں کھول کر بکھیر دیا جاتا ہے۔ اور سٹیم میں ابال کر برباد کر دیا جاتا ہے اور صاحب کڑی دھوپ میں تو تکلیف کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔“

بے حد خوفزدہ ہو کر میں نے پوچھا..... ”کیا اس کا کوئی حل نہیں ڈاکٹر صاحب!“

انہوں نے سر ہلا کر کہا..... نہیں ہاں جب ڈاکٹر صاحب جہاز پر چڑھ آئیں گے تو میں ان سے کہہ دیکھوں گا۔ ان کا کلرک آگر آپ کی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کے لئے تیار ہو گیا تو.....“

لیکن ان کی بات پوری ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ باہر ایک واقعہ ہوا جس کی یاد سے میں خود بھی شرم کے مارے مرا جاتا ہوں۔ کچھ گول مال سن کر دونوں کمرے سے باہر نکلے۔ دیکھا کہ جہاز کا سینڈ آفیسر چھ سات ملاحوں کو بے دھڑک ٹھو کریں مار رہا ہے اور وہ بوٹ کی ٹھو کریں کھا کر جہاں ہو سکتا ہے بھاگ رہے ہیں۔“

یہ انگریز نوجوان برا اکھڑ تھا اس لیے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اس کی پہلے بھی جھڑپ ہو چکی تھی اور آج پھر ایک جھڑپ ہو گئی۔

ڈاکٹر غصے ہو کر بولے..... ”تمہارا یہ فعل مذمت کے قابل ہے کسی دن اس کے لیے تمہیں نام ہونا پڑے گا۔“

وہ پلٹ کر کھڑا ہو گیا اور بولا..... ”کیوں؟“

ڈاکٹر صاحب کچھ سودیشی خیال کے تھے وہ غصے سے کہنے لگے..... ”یہ لوگ جانور نہیں ہیں غریب انسان ہیں۔ ہمارے آدمی فطرتاً نرم دل اور امن پسند ہونے کی وجہ سے کپتان صاحب سے تمہاری شکایت نہیں کرتے اسی لئے تم کو ظلم کرنے کا حوصلہ ہوا ہے۔“

ایک ایک صاحب کا منہ ایک طنزیہ ہنسی سے بھر گیا ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ کھینچ کر اس نے انگلی سے دکھاتے ہوئے کہا.....

Look Doctor there's your countrymen, you ought to be

proud of them

(ڈاکٹر یہ دیکھو تمہارے ملک کے آدمی، تمہیں ان پر ضرور فخر ہونا چاہئے)

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، کچھ اونچے کنستروں کی آڑ میں کھڑے ہو کر وہ لوگ دانت باہر نکال کر ہنس رہے ہیں اور اپنے جسم پر پڑی ہوئی گرد کو جھاڑ رہے ہیں۔ صاحب تھوڑا سا ہنس کر اور ڈاکٹر کے منہ پر دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے ہلا کر دائیں باتیں گھومتا ہوا سیٹی دیتا ہوا نکل گیا۔ فتح یابی کا ایک غرور اس کے جسم سے پھوٹ پڑنے لگا۔

خیال بھی نہ تھا کہ آپ اتنے بے رحم ہیں۔ اٹھئے، نیچے چلئے آپ نہ ہوں گے تو اس بیمار انسان کو ساتھ لے کر میں اکیلی کیا کروں گی؟ آپ ہی بتائیے؟“

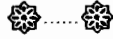
اپنا سامان لے کر جب میں چھوٹے سیئر پر سوار ہوا تو ڈاکٹر صاحب اوپر کے ڈیک پر کھڑے تھے۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر وہ ہاتھ ہلا کر چلاتے ہوئے بولے..... ”نہیں نہیں آپ کو جانے کی ضرورت نہیں۔ لوٹ آئیے، لوٹ آئیے۔ آپ کے لیے اجازت مل گئی ہے آپ.....“

میں نے بھی ہاتھ ہلاتے ہوئے چلا کر کہا..... ”ہزار ہزار شکریہ؟ لیکن ایک اور حکم ہے مجھے جانا ہی پڑ رہا ہے۔“

دفعتہً ان کی نگاہ ابھیا اور روڈنی پر گئی وہ مسکراتے ہوئے بولے..... ”پھر مجھے بیکار ہی تکلیف کیوں دی؟“

”اس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔“

”نہیں نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں پہلے ہی جانتا تھا..... گڈ بائی، یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب ہنستے ہوئے چہرے سے چلے گئے۔



ڈاکٹر صاحب کا چہرہ شرم، ندامت اور غصے کے مارے سیاہ پڑ گیا۔ تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے وہ غصہناک لہجہ میں بولے..... ”بے حیا ساو، دانت باہر نکال کر ہنس رہے ہو۔“

اس دفعہ اتنی دیر بعد دیسی لوگوں کی خودداری شاید واپس لوٹ آئی۔ سب لوگوں نے ایک ساتھ ہنسنے بند کر کے تیزی سے جواب دیا..... تم ڈاکٹر بابو، سالہا کہنے والے کون ہوتے ہو؟ کسی کا قرض کھا کر تو ہم لوگ نہیں ہستے؟“

میں زبردستی ڈاکٹر صاحب کو کھینچ کر ان کے کمرے میں واپس لے آیا۔ کرسی پر دھم سے گرتے ہوئے ان کے منہ سے صرف اوں، نکلا۔ اور دوسری کوئی بات ان کی زبان سے باہر نکلی بھی ممکن نہیں تھی۔ گیارہ بجے کے قریب کارونٹین کے پاس ایک چھوٹا سا سیئر آ کر جہاز کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈیک کے تمام مسافروں کو یہ سیئر اس خوفناک مقام میں لے جائے گا۔ مال و اسباب باندھنے کی دھوم مچ گئی۔

مجھے کوئی خاص جلدی نہ تھی کیونکہ ڈاکٹر صاحب کا آدمی ابھی کہہ گیا تھا کہ مجھے وہاں جانا نہ پڑے گا۔ اس لیے میں کھڑا کھڑا مسافروں اور ملاحوں کی چلاہٹ نہایت اطمینان سے سن رہا تھا دفعتہً پیچھے سے ایک آواز سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا کہ ابھیا کھڑی ہے۔ حیرت سے پوچھا..... ”آپ یہاں کیسے؟“

ابھیا بولی..... ”کیوں کیا اپنا سامان وغیرہ نہ باندھو گے؟“

میں نے کہا..... ”نہیں مجھے ابھی کافی دیر ہے۔ مجھے وہاں جانا نہیں پڑے گا۔ سیدھے شہر میں کر جا کر اتروں گا۔“

ابھیا بولی..... ”نہیں جلدی سے اپنا سامان وغیرہ ٹھیک کر لینا چاہئے۔“

میں نے کہا..... ”مجھے اب بھی کافی وقت ہے۔“

ابھیا نے خوب زور سے سر ہلا کر کہا..... ”نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے چھوڑ کر آپ کسی طرح بھی نہ جاسکیں گے۔“

میں نے حیران ہو کر جواب دیا..... ”یہ کیا میں جانہ سکوں گا۔“

ابھیا بولی..... ”تو پھر میں جانہ سکوں گی۔ میں سمندر میں کود سکتی ہوں لیکن اکیلی وہاں نہ جا سکوں گی۔ وہاں کی تمام باتیں سن چکی ہوں۔“ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ میں حواس باختہ سا ہو کر بیٹھا رہا۔ یہ کیوں ہے جو زبردستی آہستہ آہستہ زور ڈال کر اپنی زندگی کے ساتھ جکڑ رہی ہے؟

آنکھل سے آنکھیں پونچھ کر وہ بولی..... ”مجھے تنہا چھوڑ کر کیا تم چلے جاؤ گے، مجھے تو کبھی یہ

کارونٹین نام کے قید خانہ میں بھیجنے کا قانون صرف قلیوں کے لیے ہے شریفوں کے لیے نہیں اور جو شخص جہاز کا کرایہ دس روپیہ سے زیادہ ادا نہیں کرتا قانون کی نگاہ میں وہی قلی ہے۔ پرانے کے باغیوں کا ضابطہ اس کے متعلق کیا کہتا ہے مجھے معلوم نہیں لیکن جہاز کا قانون یہی ہے اور ذمہ دار افسران تجربہ کی بنا پر کیا سمجھتے ہیں یہ تو وہی جانبیں مگر قانونی طور پر اس سے زیادہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے اس سفر میں ہم سب قلی تھے اور صاحب لوگ یہ سمجھتے تھے کہ قلی کی زندگی میں سفر کے لیے سامان کچھ خاص زیادہ ممکن نہیں اور بالکل ہی نہ ہو تو زیادہ اچھا ہے۔ تاکہ انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لے جانے کے لیے کندھوں پر اٹھانے کی ضرورت ہی درپیش نہ ہو۔ اس لئے اترنے کے گھاٹ پر کارونٹین مسافروں کا سامان لے جانے کا اگر کوئی انتظام نہیں ہے تو اس کے لیے ناراض ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ گویہ حقیقت ہے تاہم یہ سب ہماری قسمت کی برائی ہی سمجھتے کہ ہم تین جانوں کے سر پر آگ برساتا ہوا آفتاب اور پاؤں تلے اس سے بھی زیادہ تپتی ہوئی ریت، ایک بڑے سے اجنبی دریا کے کنارے بڑے بڑے گٹھڑ سامنے رکھ کر بدحواس ہو کر ایک دوسرے کا منہ تاکتے ہوئے کھڑے تھے۔ ساتھ کے مسافروں کا حال پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔ وہ لوگ اپنے لوٹے کبل پیٹھ پر رکھ کر اور اپنا سامان اپنی اپنی بیویوں کے سر لاد کر مزے سے مقررہ مقام پر چلے گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے روٹی ابھیا بسترؤں کے ایک بڈکل پر کانپتے کانپتے دھم سے بیٹھ گئے۔ بخار، پیٹ کا درد اور کافی تھکاوٹ ان تمام وجوہات کے یکجا جمع ہونے سے ان کی حالت ایسی تھی کہ ان کے لیے چلنا تو درکنار بیٹھنا بھی ناممکن ہو گیا۔ لیٹ جانے میں ہی خیریت تھی۔ ابھیا ٹھہری عورت۔ اس لیے میں، میری اور ان کی چھوٹی چھوٹی گٹھڑیاں ہی بچیں۔ میری حالت قابل غور تھی۔ ایک تو بلا وجہ ہی مصیبت کے منہ میں جا رہا ہوں دوسرے ایک کندھے پر تو ایک بے بس عورت کا بار تھا اور دوسرے کندھے پر ایک مریض انسان جھول رہا تھا اور ان کے علاوہ گٹھڑیوں کا بوجھ علیحدہ۔ مجھے اسی وقت اتنی زیادہ پیاس لگ

رہی تھی کہ تمام گلا خشک ہو رہا تھا۔ ایک اجنبی جگہ میں حواس باختہ کھڑا تھا۔ میری اس تصویر کا تصور کر کے بطور ایک تماشائی کے لوگوں کو خوب لطف محسوس ہو سکتا ہے۔ کچھ صاحب دل ناظرین شاید میری اس بلاغرض نیکی کی تعریف بھی کریں گے۔ لیکن مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ مجھ بد قسمت کا دل اس وقت جھنجھلاہٹ اور افسوس سے یکبارگی معمور ہو رہا تھا۔ اپنے آپ کو ملامت کرتا ہوا دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ اتنا بڑا گدھا ملک الافلاک میں بھی نہ ہوگا لیکن کمال حیرت کی بات یہ ہے کہ اگرچہ میرا یہ نام میرے جسم پر مرقوم نہ تھا تو بھی جہاز بھر کے اتنے لوگوں کی موجودگی میں بار برداری کے لیے صرف مجھے ہی کیوں انتخاب کیا۔

لیکن میری حیرت اور ہوئی اس کی مسکراہٹ سے اس نے سر ہلا کر ذرا سا ہنس دیا۔ اس کے خندہ چہرے کو دیکھ کر مجھے صرف تعجب ہی نہ ہوا بلکہ اس مصیبت کا ٹکس بھی صاف نظر آیا اور سب سے بڑھ کر تعجب تو مجھے اس دیہاتی عورت کی بات سن کر ہوا۔ کہاں تو اسے احسان مند ہو کر حیا سے زمین میں گر کر بھیک مانگنی چاہئے تھی اور کہاں سے اس نے ہنس کر یہ کہا..... ”کہیں یہ خیال مت کر بیٹھنا کہ خوب دھوکہ کھایا۔ جا سکتے تھے اور پھر بھی نہیں گئے اسی کا نام خیرات ہے لیکن میں یہ عرض کر دوں کہ اتنی بڑی خیرات کرنے کا موقعہ زندگی میں شاید کم ہی ملے گا لیکن چھوڑو ان باتوں کو۔ سامان اسی جگہ پڑا رہنے دو اور چلو دیکھیں انہیں کہیں سایہ دار جگہ میں سلا جا سکتا ہے یا نہیں بالآخر گٹھڑیوں کا لالچ چھوڑ کر میں روٹی ابھیا کو پیٹھ پر لاد کر کارونٹین کی طرف روانہ ہوا ابھیا نے صرف ایک چھوٹا سا ہنڈ بیگ لے کر میرا تعاقب کیا باقی تمام سامان وہاں ہی پڑا رہا۔ شکر ہے کہ وہ کھویا نہیں کوئی دو گھنٹہ بعد اس کے آنے کا انتظام ہو گیا۔

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ حقیقی مصیبت، مصیبت کے تخیل سے زیادہ آسان اور قابل برداشت ہوتی ہے اگر پہلے ہی اس راز کو سمجھ لیا جائے تو بہت سی پریشانیوں سے نجات مل سکتی ہے لہذا اگرچہ کچھ کچھ دشواریاں اور تکالیف مجھے برداشت کرنا پڑیں تاہم یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ہم لوگوں کی کارونٹین کی معیاد کے دن اچھی طرح سے کٹ گئے۔ اس کے علاوہ پیسہ خرچ کئے پر جب ہم راج کے ہاں بھی سسرال کی طرح عزت اور آرام حاصل کیا جا سکتا ہے تو اس کا روٹین کی حقیقت ہی کیا ہے؟

جہاز کے ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ یہ صورت خوب ”فارورڈ“ ہے مگر ضرورت کے موقع پر یہ عورت کہاں تک ”فارورڈ“ ہو سکتی ہے اس کا شاید انہوں نے تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ روٹی بابو کو جب میں نے اپنی پیٹھ سے اتار دیا ابھیا بولی..... ”بس آپ کو اب کچھ بھی نہ کرنا پڑے گا۔ شری کانت بابو، آپ آرام کیجئے اور جو کچھ کرنا ہوگا میں خود ہی کر لوں گی۔“

آرام کی تو مجھے جی جی ہی ضرورت تھی۔ پاؤں تھکاوٹ کے مارے ٹوٹ رہے تھے میں نے

جیران ہو کر پوچھا..... ”آپ کیا کریں گی۔“

ابھیانے جواب دیا..... ”کام کیا کچھ کم ہے، سامان وغیرہ لانا ہوگا۔ ایک اچھا سا کمرہ تلاش کر کے آپ دونوں کے لیے بستر تیار کروینے ہوں گے۔ کھانا بنا کر جو کچھ ہو دونوں کو کھلا دینا پڑے گا..... پھر جا کر مجھے فراغت ہوگی اور تبھی تھوڑا سا بیٹھ کر آرام کروں گی۔..... نہیں نہیں، میرے سر کی قسم، اٹھے گا نہیں، میں ابھی ابھی سب انتظام کئے دیتی ہوں۔“ پھر قدرے ہنس کر کہا..... ”سوچتے رہو گے کہ عورت ہو کر یہ سب انتظام اکیلی کس طرح کر سکے گی۔ یہی نا؟ لیکن کیوں نہ کر سکوں گی؟ اچھا آپ کو ہی تلاش کر لینے والا کون تھا؟ میں ہی تھی نا کہ اور کوئی؟“ اتنا کہہ کر اس نے چھوٹے سے بکس کو کھولا اور اس میں سے کچھ روپے نکال کر آنچل میں باندھ لیے اور کارونٹین کے دفتر کی طرف چل دی۔

وہ خواہ کچھ کر سکے یا نہ کر سکے۔ کسی طرح بیٹھنے کے لیے تھوڑی سی جگہ مل جانے سے میری جان بچ گئی۔ آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا ہو گا کہ ایک چیز اسی مجھے بلانے آیا روٹنی کو ساتھ لے کر اس کے ہمراہ گیا۔ دیکھا رہائش کا کمرہ تو اچھا ہی ہے۔ میم ڈاکٹر ان صاحبہ خود کھڑے ہو کر نوکر سے سب صاف کروا رہی ہیں۔

ضروری اشیاء آنچنی ہیں اور دو کھانوں پر دو آدمیوں کے لیے بستر تک بچھا دیئے گئے ہیں ایک طرف نئی ہنڈیا، چاول، دال، آلو، گھی، میدہ، بکڑی وغیرہ سب موجود ہے۔ مدراسی ڈاکٹرین کے ساتھ ابھیانے پھوٹی ہندی میں بات چیت کر رہی ہے مجھے دیکھتے ہی بولی..... ”تب تک آپ کچھ نیند لے لیں، میں سر پر گھڑا ڈال کر اس وقت کے لیے چاول دال ملا کر تھوڑی سی کھجڑی تیار کئے دیتی ہوں۔ شام کے لیے پھر دیکھا جائے گا۔“ یہ کہہ کر تویہ لے کر میم صاحبہ کو سلام کر کے ایک ملاح کو ساتھ لے کر وہ نہانے کے لیے چلی گئی..... اسی طرح اس کی نگرانی میں ہم لوگوں کے دن اچھی طرح کٹ گئے۔ یہ کہنے میں ذرا سی بھی مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لے رہا۔

ابھیانے دو باتیں آخر تک دیکھ رہا تھا۔ ایسی حالت میں ایسے عورت مرد میں جن میں باہمی کوئی رشتہ نہیں ہوتا تعلقات خود بخود گہرے ہونے شروع ہو جاتے ہی لیکن ابھیانے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ اس کے برتاؤ میں ایک ایسی شے تھی جو ہر وقت یاد دلایا کرتی تھی کہ ہم لوگ محض مسافر ہیں جو ایک جگہ ٹھہر گئے ہیں کسی کے ساتھ کسی کا کوئی حقیقی رشتہ نہیں۔ دو دن بعد پھر زندگی میں کبھی ملاقات ہی نہ ہو گی۔ دوسری بات یہ تھی کہ ایسی مسرت انگیز محنت اور لگن بھی میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ دن بھر وہ ہم لوگوں کی خدمت میں مصروف رہتی اور سب کام خود ہی کرنا چاہتی۔ ہاتھ بٹانے کے لیے کوشش کرتے ہی وہ ہنس کر کہا کرتی..... یہ تو خود میرا کام ہے ورنہ روٹنی بھیا کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ اتنی تکلیف اٹھاتے اور

آپ کو بھی اس جیل خانہ میں آنے کی کیا پڑی تھی؟ میرے لیے ہی آپ لوگوں کو یہ سب تکلیف برداشت کرنی پڑی ہیں۔“

اکثر ایسا ہو جاتا کہ کھانے پینے کے بعد تھوڑی سی گپ شپ چل رہی ہوتی اور دفتر کی گھڑی میں دو بج جاتے وہ ایک دم کھڑی ہو جاتی اور کہتی..... ”جاتی ہوں آپ لوگوں کے لیے چائے تیار کر لاؤں۔ دو بج گئے ہیں۔“ میں دل ہی دل میں کہتا..... ”تمہارا شوہر خواہ کتنا ہی بڑا گناہگار کیوں نہ ہو، انسان تو ضرور ہوگا۔ اگر کبھی اسے حاصل کر لوگی تو وہ تمہاری قدر و قیمت ضرور سمجھے گا۔“

اس کے بعد ایک دن معیا ختم ہو گئی۔ روٹنی بھی تندرست ہو گیا۔ ہم لوگ بھی سرکاری اجازت نامہ لے کر پھر گھڑیاں باندھ کر رنگون کو چل پڑے ارادہ کیا تھا کہ شہر کے مسافر خانے میں دو ایک دن کے لیے ٹھہرنے کا کوئی مقول انتظام کر کے میں اپنی جگہ پر چلا جاؤں گا اور پھر جہاں جہاں میں رہو گا اس کے شوہر کو تلاش کر کے اسے خبر بھیجے رہنے کی کوشش کروں گا۔

شہر میں جس دن ہم نے قدم رکھا اس دن برما والوں کے ایک تہوار کا دن تھا۔ یوں تو تہوار ان کے آئے دن لگے ہی رہتے ہیں گروہ کے گرو زن و مرد ریشمی پوشاک زیب تن کئے اپنے مندروں کو جا رہے تھے۔ عورتوں کی آزادی کا صوبہ ہے اسلئے وہاں کے جشن ہائے مسرت میں عورتوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے۔ بوڑھی، نوجوان بچیاں..... ہر عمر کی عورتیں عمدہ اور نفیس پوشاکیں پہن کر ہنسی بولتی گاتی بجاتی جا رہی تھیں۔ ان میں سے بیشتر گوری تھیں۔ بادل کی طرح گھنے بالوں کا بو بھونوے فیصدی عورتوں کے گھٹنے کے نیچے تک لٹکتا تھا۔ گلے میں پھولوں کے ہار گھونگھٹ کا جھنجھٹ نہیں۔ مردوں کو دیکھ کر تیزی سے ہٹا جانے کی جلدی میں ٹھوکر کھا کر گر جانے کا اندیشہ نہیں۔ پریشانی یا حیا کا خطرہ نہیں۔ گویا چشمے کے آزاد بھاء کی مانند بلا روک ٹوک بھی جا رہی ہیں۔ پہلی ہی نگاہ میں میں تو فریفتہ ہوا تھا۔ اپنے ہاں کے ساتھ ان کا مقابلہ کر کے دل میں ان کی تعریف کر کے بولا..... یہی تو زندگی ہے یہی ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر زندگی کا لطف ہی کیا ہے؟ ان کی خوش نصیبی حسد کی طرح میرے دل میں بیوست ہو گئی۔ میں نے سوچا۔ اطراف و جوانب میں وہ مسرت و انبساط کی ایک دنیا آباد کرتی جا رہی ہیں کیا اس شے کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ عورتوں کو آزادی دے کر اس ملک کے مردوں نے کیا کوئی دھوکہ کھایا ہے؟ اور ہم لوگ کیا ان کو سرتا پا جکڑ کر اور ان کی زندگی کو اپاچ بنا کر فائدہ میں رہے ہیں؟ ہماری عورتیں بھی اگر کسی ایسے ہی دن.....

ناگاہ کچھ شور غل سن کر میں نے لوٹ کر جو کچھ دیکھا وہ آج بھی میرے دل پر اسی طرح نقش ہے۔ گھوڑا گاڑیوں کے کرایے کے متعلق جھگڑا ہو رہا تھا۔ گاڑی بان ہمارے ہاں کا ہندوستانی مسلمان

تھانے میں لے جا کر باڈر دکھا کر حد درجہ کی تکلیف نہیں دیتا تھا۔ دل میں کوئی گناہ نہ ہو، تو ان دنوں کسی اجنبی یا واقف کار کو بے خوفی سے گھومنے پھرنے کا حق تھا، اور آج کل کی طرح اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کی نازک اور اہم ذمہ داری بھی نووارد بنگالیوں پر عائد نہ ہوتی تھی۔ اس لیے مجھے خوب یاد ہے کہ اس دن صبح سے لے کر دوپہر تک بلا کھٹکے میں گلی گلی میں گھومتا پھرا۔ راستے میں ایک بنگالی سے ملاقات ہو گئی۔ مزدور کے سر پر تو کاری کا ایک بو جھرکھے ہوئے پسینہ پونچھتے ہوئے تیزی کے ساتھ وہ چلا جا رہا تھا، میں نے پوچھا..... ”صاحب ہند مستری کا مکان کہاں ہے؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں؟“ وہ آدمی رک کر کھڑا ہو گیا..... ”کون نند؟ کیا آپ ربٹ گھر کے نند بگاڑی کو تلاش کر رہے ہیں۔“

میں نے کہا..... ”یہ تو میں نہیں جانتا صاحب! کہ وہ کس گھر کے ہیں، انہوں نے صرف اتنا ہی پتہ بتایا تھا کہ وہ رنگون کے مشہور و معروف نند مستری ہیں۔“ اس آدمی نے ایک تذلیل آمیز جذبہ چہرے پر لا کر کہا ”اوہ، مستری، یوں تو ہر ایک اپنے آپ کو مستری کہلاتا ہے، لیکن مستری ہونا کیا آسان ہے؟ مرکٹ صاحب نے جب مجھ سے کہا تھا کہ ”ہری پڈ“ تمہارے علاوہ مستری ہونے کے قابل مجھے کوئی دوسرا آدمی نظر نہیں آتا تو آپ جانتے ہیں کہ بڑے صاحب کے پاس کتنی لاتعداد درخواستیں پڑی ہوئی تھیں..... تقریباً ایک سو، آری اور تیشے میں زور ہو تو درخواستوں کی ضرورت ہی کیا ہے؟ لیکن صاحب آپ جانتے ہیں.....“

میں نے محسوس کیا کہ بے خبری میں ہی میں نے اس انسان کو ایسی جگہ پر چوٹ پہنچائی ہے جس کی تلافی مشکل ہے اس لیے فوراً گفتگو کا موضوع تبدیل کر کے کہا..... ”تو پھر نند نام کے کسی بھی انسان کو آپ نہیں جانتے؟“

”یہ آپ نے خوب کہا..... چالیس سال سے رنگون میں رہتا ہوں۔ میں اسے نہیں جانتا؟ نند کیا ایک ہے؟ تین تین نند ہیں۔ آپ نے نند مستری کہا تھا۔ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں آپ؟ شاید بنگال سے اوہ پھر یہ کہنے کہ گھر کے مرد کو پوچھ رہے ہیں۔“

میں نے سر ہلا کر کہا..... ”ہاں، ہاں، وہی۔“

وہ بولا..... ”تو پھر یہ کہنے، پورا پتہ ملے بغیر کیسے پہچانوں؟ آئیے میرے ساتھ، تقدیر کے زور سے نند کا کھار ہا ہے ورنہ نند بگاڑی بھی کیا کوئی مستری ہے؟“

’صاحب آپ کون ہیں۔‘

یہ سن کر کہ میں براہمن ہوں اس آدمی نے راہ میں ہی مجھے پرنام کیا بولا..... وہ آپ کی نوکری

تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آٹھ آنے کرایہ طے ہوا ہے اور نیلے بھلے گھر کی بری عورتیں گاڑی پر سے اتر کر ایک زبان ہو کر کہہ رہی تھیں کہ نہیں پانچ آنے ہوا ہے۔ دو چار منٹ کہا سنی ہونے کے بعد ہم بس ”بلم بلم“ ہوا بلم، سڑک کے کنارے ایک آدمی گنے کے موٹے موٹے کٹڑے کر کے بیچ رہا تھا۔ دفعہ تینوں نے جھپٹ کر تین کٹڑے اٹھائے اور گاڑی بان پر متفقہ حملہ کر دیا۔ آہ وہ کتنی بے دھڑک مارتھی۔ بے چارہ گاڑی بان عورتوں کے جسم پر ہاتھ بھی نہ اٹھا سکتا تھا اور جان بچانے کے لئے اگر ایک کورو کتا تو دوسری کی چوٹ سر پر پڑتی۔ اس کورو کتا تو تیسری کی چوٹ آ پڑتی۔ چاروں طرف لوگوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ لیکن صرف تماشا دیکھنے کے لیے اس غریب بے چارے کی کہاں گئی ٹوپی صافہ اور کہاں گیا ہاتھ کا چابک۔ اور زیادہ برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے آخر وہ میدان چھوڑ کر پولیس پولیس! سپاہی سپاہی چلاتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔

میں ابھی حال ہی میں بنگال اور وہ بھی دیہات میں سے آ رہا تھا۔ کھٹکے میں عورتوں کو آزادی ہے۔ سنا ضرور تھا لیکن آنکھوں نہیں دیکھا۔ لیکن آزادی حاصل کر کے شریف گھروں کی عورتیں بھی ایک جوان مرد پر کھلے عام سڑک پر حملہ کر کے لٹھ بازی کر سکتی ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کے اتنے طاقتور ہونے کا خیال میرے تصور سے بھی بعید تھا۔ کافی دیر تک حیرت زدہ ہو کر کھڑے کھڑے دیکھتے رہنے کے بعد میں اپنے کام کے لیے نکل پڑا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ عورتوں کی آزادی اچھی ہے یا بری سوسائٹی کی مسرت میں اس سے اضافہ ہو گیا کی۔ اس کا فیصلہ تو کسی اور دن کروں گا لیکن آج آنکھوں جو کچھ دیکھا اس سے میری دل کی عجیب ہی حالت ہو گئی۔

ابھی اور روٹی کو ان کی نئی رہائش اور نئی گھر گریہ ہستی میں داخل کر کے جس دن میں خود اپنی رہائش کے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے کے لیے رنگون کی شاہراہ پر نکل پڑا اس دن میں یہ کہنا نہیں چاہتا کہ ان دونوں کے باہمی تعلقات کے متعلق میرے دل میں کسی طرح بھی نفرت چھو نہیں گئی تھی لیکن اس ناپاک خیال کو دور کرنے میں بھی مجھے زیادہ دیر نہ لگی کیونکہ دو خاص عمر کے عورت مردوں کو کسی حالت میں دیکھنے محض سے ہی ان کے درمیان کسی خاص تعلق کا تصور کر لینا کتنی عظیم غلطی ہے۔ یہ ہدایت مجھے بچپن ہی میں مل چکی تھی اور مستقبل کے پر اسرار رموز کو بھی مستقبل کے ہاتھ سونپ دینے میں بھی کسی قسم کی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔ لہذا صرف اپنا ہی بوجھ کندھے پر لا کر میں اس دن صبح کے وقت ان کی نئی رہائش گاہ سے باہر نکلا۔

آج کل کی طرح اس وقت کسی بھی نئے بنگالی کو برما میں قدم رکھتے ہی پولیس کے ظاہر اور خفیہ سپاہیوں کا ہجوم ان سے لگا تا سوالات کر کے ان پر طعن و تشنیع کر کے اور بے عزتی کر کے اور بلا تصور

شک نہیں ہے ان لوگوں نے دیدہ دانستہ ہی اس بڑے بھاری وہم کو خواہ مخواہ پال رکھا ہے۔ درحقیقت جس ملک میں کھانے پینے میں چھوٹا چھوٹا خیال رائج نہیں ہے اس ملک میں قدم رکھتے ہی اچھی طرح نظر آ جاتا ہے کہ چھوٹ پشوں کی کھانے پینے کی چھوٹا چھوٹا رکھنے کی یہ رسم نامعلوم کس طرح راتوں رات غائب ہو جاتی ہے۔ ولایت جانے سے ذات چلی جاتی ہے اس کی ایک خاص وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہاں ممنوع گوشت کھانا پڑا ہے۔ یہاں تک کہ جو لوگ اپنے ملک میں بھی کبھی گوشت نہیں کھاتے ان کی ذات بھی چلی جاتی ہے کیونکہ جن لوگوں نے ذات برادری سے خارج کرنے کا اجارہ لے رکھا ہے وہ نچ لوگ کہتے ہیں کہ وہاں گوشت نہ کھالینے پر بھی سمجھ لینا چاہئے کہ کھایا ہی ہے۔“

اور ان کا یہ فرمانا بالکل غلط بھی نہیں ہے برما تو تین چار دن کا راستہ ہی ہے۔ پھر بھی میں نے دیکھا ہے کہ نوے فیصدی بنگالی شریف انسان جن میں شاید براہمنوں کی ہی اکثریت ہوگی..... کیونکہ اس زمانہ میں ان کا لالچ دوسری تمام قوموں کو مات کر چکا ہے (جہاز کے ہوٹل میں ہی سستے داموں پیٹ بھر لیتے ہیں۔ پھر کہیں جا کر برما کے ساحل پر قدم رکھتے ہیں اس ہوٹل میں مسلمان اور رگوانیز باروچی کیا بناتے ہیں۔ یہ سوال نامرغوب ہو سکتا ہے لیکن وہ لوگ خالص ویشنو پکا کر کیلے کے پتے میں نہیں پروتے ہوں گے۔ یہ اندازہ کر لینا تو بھٹ پاڑے کے بھٹا چار یہ کے لیے بھی شاید مشکل نہیں ہے..... اور میں تو ٹھہر ایک ساتھی مسافر۔ جو لوگ کم از کم یہ سب نہیں کھانا چاہتے وہ بھی ہارتسلیم کر کے بالآخر سادہ روٹی یا سبزی وغیرہ تو کھاتے ہی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ ممنوع گوشت سے لے کر کرمان اور رمھا (کیلے کی دو اقسام) تک سب کچھ ملا جلا کر جہاز کے کولڈ روم میں رکھا جاتا ہے۔ اور یہ کام کسی کی نظر سے چھپا کر کرنے کا رواج بھی میں نے جہاز کے قواعد و ضوابط میں نہیں دیکھا ہاں پھر بھی سہولت کی بات یہ ہے کہ برما جانے والے مسافروں کی ذات جانے کا قانون شاید کسی طرح شاستر بنانے والوں کی سول کوڈ کی نظر بچا گیا ہے ورنہ شاید پھر ایک چھوٹی موٹی برہمن کانفرنس کی ضرورت لاحق ہوتی..... جانے دو، نیک انسان کی بات آج یہیں تک رہے۔

ہوٹل میں جو لوگ صف باندھ کر کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تھے وہ شریف انسان نہیں تھے..... کم از کم لوگ انہیں شریف تسلیم نہیں کرتے۔ سب لوگ کارگر تھے ساڑھے دس بجے کی چھٹی میں کھانا کھانے آئے تھے۔ شہر کے اس حصے میں ایک بڑا وسیع میدان ہے جس کے تین طرف مختلف دستکاریوں کے کارخانے ہیں اور اس بستی کے درمیان ایک طرف داداٹھا کر کا یہ ہوٹل ہے۔ یہ ایک عجیب بستی ہے ایک قطار میں ایک سے ایک ملحقہ، بوسیدہ لکڑی کی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں۔ ان میں چینی، برمی، مدراسی، اڑیا، تیلنگی، چٹاگانگ کے ہندو اور مسلمان وغیرہ سبھی رہتے ہیں اور ہماری

لگا دے گا، صاحب سے سفارش کر کے آپ کی نوکری ضرور لگا سکتا ہے مگر دو مہینے کی تنخواہ اسے پیشگی رشوت میں دینی ہوگی۔ دے سکو گے کیا؟ دے سکو تو اٹھارہ مہینے آنے یومیہ نوکری لگا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔“

میں نے اسے بتایا کہ فی الحال تو میں نوکری کر امید میں نہیں جا رہا ہوں۔ کچھ پناہ حاصل کرنے کی غرض سے ہی باہر نکلا ہے اور اس کی امید مندرستی نے مجھے جہاز پر ہی دلائی تھی۔

یہ سن کر ہری پدمستری نے حیرت سے پوچھا..... ”صاحب آپ نیک آدمی ہیں تو نیک آدمیوں کے ذریعے میں کیوں نہیں جاتے؟“

”میں نے کہا ذریعہ کہاں ہے؟ یہ تو میں جانتا ہی نہیں۔“

اس نے خود بھی یہ تسلیم کیا کہ مجھے بھی معلوم نہیں۔

مگر اس وقت تلاش کر کے بتانے کی امید ولا کر وہ بولا..... ”لیکن اس وقت تو نند سے ملاقات نہ ہو سکی، وہ کام پر گیا ہے، مگر زنجیر لگائے سو رہی ہے اور پکار کر اس کی نیند میں خلل ہونے میں خیریت نہیں۔“

یہ تو میں خوب جانتا تھا اس لیے راستہ کے درمیان مجھے پس و پیش کرتے دیکھ کر اس نے ہمت دلا کر کہا..... ”نہ گئے وہاں تو کیا! داداٹھا کر عالیشان ہوٹل سامنے ہی ہے۔ وہاں غسل کر کے اور کھانا کھا کر نیند لے لیجئے اس وقت تک پھر دیکھا جائے گا۔“

ہری پد کے ساتھ باتیں کرتے کرتے جب میں داداٹھا کر کے ہوٹل پر پہنچا تو ہوٹل کے ڈائینگ روم (کھانے کے کمرے) میں تقریباً پندرہ آدمی کھانا رکھا رہے تھے۔ انگریزی میں دو لفظ ہیں ”انسلٹ“ اور ”پریجوڈس“ لیکن ہمارے ہاں صرف ایک ہی لفظ ہے تربیت یہ سمجھ لینا مشکل ہے کہ جو ایک ہے وہ دوسرا نہیں یعنی انگریزی میں دونوں الفاظ علیحدہ علیحدہ مطلب کو ظاہر کرتے ہیں لیکن داداٹھا کر کے ہوٹل میں داخل ہو کر یہ بات آج پہلے پہل ہی مجھے معلوم ہوئی کہ ہم لوگوں کی جات پات کی تفریق کھانا پینا وغیرہ چیزیں انسلٹ کی رو سے تربیت نہیں ہیں اور اگر یہ تربیت ہو بھی تو نہایت حقیر ہے۔ اس کی قیود سے آزاد ہونا کتنا آسان ہے یہ سب ظاہر طور سے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ ہمارے وطن میں ذات پات کی تفریق کا جو ایک لاتناہی سلسلہ قائم ہے اس سلسلہ کو پاؤں میں پھن کر جھجھکتے ہوئے پھرنے میں کتنا فخر اور بہتری ہے۔ اس پر اس وقت تنقید اور تبصرہ نہیں کروں گا البتہ یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہو کر کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ اس کو اپنے چھوٹے چھوٹے سے گاؤں میں، بے کھٹکے بنے ہوئے آباد اجداد کا چلایا ہوا رواج بنا کر قائم رکھائے ہوئے ہیں اور اس کے نظام کو توڑنے کی سختی کے متعلق جنہیں مطلقاً کوئی

ذات کے بنگالی بھی رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک رہ کر میں نے پہلے پہل یہ سیکھا ہے کہ کسی کی قوم کو حقیر کہہ کر اور اس سے نفرت کر کے اور کو دور رکھنے کی مذموم عادت کو ترک کر دینا کوئی بڑا مشکل کام نہیں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جن کو ضرورت نہیں ہوتی وہ اس عادت کو ترک نہیں کرتے لیکن جن دجوات کی بنا پر وہ ترک نہیں کرتے ان کو ظاہر کرنے سے جھگڑا بڑھ جائیگا۔

دادا ٹھاکر نے نہایت گرم جوشی سے میرا خیر مقدم کیا اور ایک چھوٹا سا کمرہ دکھا کر کہا.....
”جتنے روز آپ کی خوشی ہو اس میں رہیں اور ہمارے ہاں کھانا کھائیں، نوکری وغیرہ ملنے کے بعد بل ادا کر دیجئے گا۔“

میں نے کہا..... ”مجھے تو آپ پہچانتے نہیں ہیں ایک مہینہ بٹھہر کر اور کھاپی کر بغیر بل ادا کئے بھی تو جاسکتا ہوں؟“

دادا ٹھاکر نے اپنی پیشانی دکھاتے ہوئے ہنس کر کہا..... ”اسے تو آپ اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے صاحب!“

میں نے جواب دیا..... ”جی نہیں اس کا مجھے رتی بھر بھی لالچ نہیں ہے۔“
دادا ٹھاکر سر ہکلاتے ہوئے اس دفعہ نہایت سنجیدہ چہرے بنا کر بولے..... ”دیکھئے تقدیر ہی ہے صاحب! تقدیر! اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں یہی میں سب لوگوں سے کہا کرتا ہوں۔“

درحقیقت یہ ان کا زبانی جمع خرچ نہیں تھا۔ اس سچائی پر ان کو کتنا زبردست اعتقاد تھا اس کا ہاتھوں ہاتھ ثبوت دینے کے لیے چار پانچ مہینے کے بعد، ایک دن وہ علی الصبح ہی بہت سے لوگوں کی امانتیں..... روپے پیسے، انگوٹھی گھڑی وغیرہ ساتھ لے کر محض ان کی مایوس پیشانیوں کو برما میں اس خالی ہوٹل کی میز پر ٹپکنے کے لیے چھوڑ کر اپنے وطن چلے گئے۔

خیر جو بھی ہو اس وقت دادا ٹھاکر کی بات سننے میں بری محسوس نہ ہوئی اور میں بھی ان کا ایک نیا موکل بن کر ایک ٹوٹے سے کمرے پر قبضہ جما کر بیٹھ گیا۔ رات کو ایک کچی عمر کی بنگالی خادمہ میرے کمرے میں آسن بچھا کر کھانے کے لیے جگہ بنانے لگی۔ قریب ہی ڈرائنگ روم میں لوگوں کے کھانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے دریافت کیا کہ مجھے وہاں کھانا کیوں نہیں کھلایا گیا۔ یہاں کس لئے لائی ہو؟“

اس نے جواب دیا..... ”وہ لوگ ہلکے درجے کے لوہا کاٹنے پینے والے مزدور ہیں بابو ان کے ساتھ آپ کو کیسے کھلایا جاسکتا ہے؟“

یعنی وہ تھے، کمین، میں تھا معزز انسان،..... میں نے ہنس کر کہا..... ”مجھے بھی یہاں کیا کیا

کاٹنا پینا پڑے گا اس کا کافی الحال کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں آج کھلاتی ہو تو کھلا جاؤ مگر کل سے مجھے بھی ان ہی کے ساتھ اسی کمرے میں کھلانا۔“

خادمہ بولی..... ”آپ براہمن ہیں آپ کو وہاں کھانے کی ضرورت نہیں۔“
”کیوں، وہ سب بنگالی تو ہیں؟“

خادمہ نے آواز کو قدرے دھیمّا کر کے کہا..... ”بنگالی تو ضرور ہیں لیکن ان میں ایک ڈوم بھی ہے۔“

ڈوم! ہمارے اپنے ملک میں یہ قوم اچھوت ہے۔ چھو جانے پر نہانا ضروری ہے یا نہیں یہ معلوم نہیں لیکن یہ ضروری ہوں کہ کپڑے تبدیل کر کے سر پر گنگا جل چھڑکنا پڑتا ہے۔ نہایت حیرت کے ساتھ میں نے پوچھا..... ”اور سب؟“

خادمہ بولی..... ”اور سب اعلیٰ قوم کے ہیں۔ کانسٹھ ہیں۔ کیورت (کیوٹ) ہیں۔ آہیر ہیں، لوہار.....“

یہ لوگ کوئی اعتراض نہیں کرتے؟“
خادمہ اب قدرے ہنس کر بولی..... ”اس پردیس میں سات سمندر پار آ کر کیا اتنی پاکیزگی چل سکتی ہے بابو؟ وہ کہتے ہیں کہ گھر لوٹ کر گنگا اٹھان کر کے کفارہ کر لیں گے۔“

”شاید ہی کر لیں مگر مجھے علم ہے کہ جو دو چار آدمی گاہے بگاہے بنگال جاتے ہیں وہ چلتے چلتے کلکتے کی گنگا میں ایک آدھ مرتبہ اٹھان تو ضرور کر لیتے ہوں مگر پرائیویٹ کوئی نہیں کرتا۔ غیر ملکی آب و ہوا کے تاثرات سے یہ لوگ اس پر اعتقاد ہی نہیں رکھتے۔“

میں نے دیکھا کہ ہوٹل میں صرف دو حصے ہیں۔ ایک براہمنوں کے لیے اور دوسرا تمام غیر براہمنوں کے لیے۔ کھانے کے بعد کیوٹ کے ہاتھ سے ڈوم اور ڈوم کے ہاتھ سے لوہار نے حقہ پکڑ لیا اور بلا زور کوٹک پی لیا۔ دو دن بعد اس لوہار کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے میں نے پوچھا..... ”اچھا اس طرح تمہاری جاتی نہیں جاتی؟“

لوہار بولا..... ”جاتی کیوں نہیں صاحب! جاتی تو ہے“
”تو؟“

اس نے پہلے پہل اپنے آپ کو ڈوم ظاہر نہیں کیا تھا۔ کہا تھا کہ میں کیوٹ ہوں۔ بعد ازاں ہی سب راز کھلا۔“

”پھر تم لوگوں نے کچھ نہ کہا؟“

آتی ہے انہوں نے مجھے غیر سمجھنا شروع کر دیا۔ انگریزی پڑھنے لکھنے نیک انسانوں کے قریب یہ لوگ انتہائی مصیبت کے وقت جاتے ضرور ہیں اور ان سے اصلاح مشورہ بھی کرتے ہیں لیکن نہ تو ان پر بھروسہ کرتے ہیں اور انہیں اپنا آدمی ہی خیال کرتے ہیں۔ ملک کے اس برے رواج کو وہ آج بھی دور نہیں کر سکے کہ میں انہیں چھوٹا سمجھ کر دل ہی دل میں نفرت کرتا ہوں یا ان کی غیر حاضری میں ان کا مذاق اڑایا ہوں۔ صرف اسی لیے ان کے درمیان کام کرنے کی میری کتنی ہی سیکمیں قفل ہو گئی ہیں۔ لیکن خیر آج اس بات کو رہنے دیجئے۔

میں نے دیکھا کہ بنگالی عورتوں کی تعداد بھی اس طرف کچھ کم نہیں ہے اگرچہ ان کے خاندان کا پورا پورا پتہ نہ دینا ہی بہتر ہے تاہم آج وہ کسی دوسری ہی شکل میں تبدیل ہو کر ایک دم پورے پورے عیال داروں کی بیویاں بن چکی ہیں۔ مردوں کے دلوں میں تو شاید آج بھی ذات پات، کی پرانی یاد قائم ہے لیکن عورتیں تو نہ کبھی اپنے وطن میں آتی ہیں اور نہ ہی اپنے وطن کے ساتھ کوئی تعلق ہی رکھتی ہیں۔ ان کے بچے بچیوں سے پوچھا جائے تو وہ یہی کہتے ہیں کہ ”ہم بنگالی ہیں، یعنی مسلمان، عیسائی، برہمن وغیرہ نہیں۔۔۔۔۔ بنگالی ہندو ہیں۔ قرب و جوار میں بیاہ شادیاں نہایت آزادانہ طور سے ہوتی ہیں محض بنگالی ہونا ہی کافی ہے اور چٹا گانگ کے کسی بنگالی براہمن سے منتر پڑھوا کر دونوں کے ہاتھ ملا کر ایک کر دینا ہی کافی ہے۔ بیوی ہو جانے پر دوبارہ شادی کا رواج نہیں ہے۔۔۔۔۔ اور یہ اس لیے کہ پردہت دوبارہ منتر پڑھنے کے لیے رضامند نہیں ہوتا۔ لیکن بیوی کو بھی یہ پسند نہیں کرتیں اور پھر دوسرا گھر بسالیتی ہیں۔ ان کے لڑکے بچے ہوتے ہیں اور بھی کہتے ہیں کہ ہم بنگالی ہیں، اور ان کی شادیوں میں بھی وہی پردہت آ کر دید کے منتر پڑھا کر شادی کرا جاتے ہیں۔ اس دفعہ انہیں ذرا سا بھی اعتراض نہیں ہوتا۔ شوہر سے انتہائی طور پر ستائی جانے پر یہ دوسرے کا سہارا بھی لے لیتی ہیں لیکن اس کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ اور ہر ممکن اذیت کو برداشت کرتی ہیں۔ بائیں ہمدہ ہندو ہیں اور درگا پوجا سے شروع کر کے مہاکالی وغیرہ کوئی بھی چارہ نہیں چھوڑتیں۔“

☆☆☆

راستے میں جن لوگوں کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہو کر اس دور دراز پردیسی علاقہ میں داخل ہوا تھا واقعات کی رفتار سے وہ تو شہر کے ایک کنارے رہ گئے اور مجھے پناہ ملی شہر کی دوسری طرف لہذا ان پندرہ سولہ دنوں میں اس طرف نہ جا سکا۔ اس کے علاوہ تمام دن ملازمت کی امیدواری میں گھومتے گھومتے اتنا عاجز آ جاتا تھا کہ شام کے وقت اپنی قیام گاہ پر لوٹتے ہوئے اتنی طاقت نہیں بچتی تھی کہ کہیں بھی جا سکوں۔ رفتہ رفتہ جوں جوں دن گزرنے لگے میرے دل میں یہ خیال مضبوط ہوتا گیا کہ اس دور

”صاحب اور کیا کہتے۔ کام تو بہت ہی برا ہوا۔ یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے لیکن مبادا اسے شرمندگی اٹھانی پڑے یہ سوچ کر سب نے دیدہ دانستہ معاملے کو دبا لیا۔“

”لیکن اگر تم اپنے وطن میں ہوتے تو کیا ہوتا؟“

وہ گویا لرزا اٹھا بولا۔۔۔۔۔ ”تو“ کیا پھر کوئی بچ سکتا تھا؟“ اس کے بعد وہ ذرا سا خاموش رہ کر وہ خود ہی کہنے لگا۔۔۔۔۔ ”مگر آپ جانتے ہیں بابو، میں براہمنوں کی بات نہیں کہتا۔۔۔۔۔ وہ تمام ذاتوں کے گورو ٹھہرے، ان کی تو بات ہی علیحدہ ہے ورنہ باقی تمام ذاتیں یکساں ہیں۔ خواہ تیلی، مالی، نمولی، نائی، بڑھئی، لوہار، کھہار اور گاندھی ان نونشاخوں کے ہندو ہوں خواہ ہاڑی ڈوم وغیرہ ہوں۔ کسی کے جسم پر کچھ لکھا تو ہوتا نہیں ہے۔ سبھی بھگوان کے بنائے ہوئے ہیں۔ سب ایک ہیں۔ سبھی پیٹ کی آگ میں جل کر دور دراز پردیس میں آئے ہیں اور لوہا پیٹ رہے ہیں۔ ذرا سوچیے تو بابو، ہری موڈل ڈوم ہے تو کیا ہوا؟ شراب پیتا نہیں۔ گانچے کو چھو تا تک نہیں۔ اس کے رہن بہن اور عادات و اطوار کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک اونچی ذات کا نہیں۔۔۔۔۔ ڈوم کا لڑکا ہے؟ اور لکشمں وہ تو شریف کا بیٹا ہے لیکن ایک بار اس کے طور اطوار تو دیکھو جو دوبارہ جیل جاتے بچے ہیں۔ ہم سب نہ ہوتے تو اب تک جیل میں پڑے پڑے مہتر کے ہاتھ کی روٹیاں کھاتے ہوتے۔“

اس کی یہ بات سن کر نہ تو مجھے لکشمں کے متعلق کسی طرح کی بے تابی ہوئی اور نہ ہری موڈل نے اپنے ڈوم پن کو چھپا کر کتنا بڑا ظلم کیا ہے اس پر ہی کسی طرح کی بحث کرنے کی خواہش ہوئی۔ میں صرف یہی سوچنے لگا کہ جس ملک میں شریف انسان تک جاسوس لگا کر اپنے جنم کے پڑوسی کی کنزوریاں ڈھونڈ کر اور اس کے ماں باپ کی شراہ کو بگاڑ کر دلی تسکین حاصل کرتے ہیں اسی ملک کے گنوار اور نا تعلیم یافتہ بچے قوم ہونے پر بھی ان لوگوں نے ایک اجنبی بنگالی کا اتنا بڑا بھاری جرم بھی معاف کر دیا اور حرق۔۔۔۔۔ یہی نہیں بلکہ بعد ازاں اس پردیس میں کہیں اسے شرمندہ اور حقیر ہو کر نہ ہٹا پڑے اس خیال سے اس سلسلہ کو اٹھایا تک نہیں۔ یہ سب ناممکن کام کس طرح ممکن ہوا؟ غیر ملکی لوگ بے شک نہ سمجھ سکیں لیکن ہم تو سمجھ سکتے ہیں کہ کتنی فراخ دلی اور دل کی کتنی بڑی وسعت اس کے لیے درکار ہوتی ہے۔ تمام زندقہ بھرا اپنے چھوٹے سے گاؤں میں ہی بیٹھ کر گزاردینے سے بڑھ کر انسان کیلئے سب معاملات میں تنگ دل بنادینے والا دشمن اور کوئی نہیں۔ خیر جانے دو اس بات کو۔

ان لوگوں کے ساتھ میں بہت دنوں تک رہا لیکن جب تک انہیں یہ معلوم نہ ہوا کہ میں پڑھا لکھا ہوں تب تک ہی ان کے ساتھ بے تکلفی سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہا ان کے ہر قسم کے رنج و راحت میں میں ان کا شریک ہوتا تھا مگر جس گھڑیاں کو یہ معلوم ہوا کہ میں شریف انسان ہوں اور مجھے انگریزی

کواڑ کی آڑ میں سے ابھیانے اپنے ہنستا ہوا چہرہ باہر نکال کر گپ شپ اشارہ کر کے مجھے اندر بلوایا۔۔۔۔۔ پریشانی کے عالم میں میں نے کہا۔۔۔۔۔ چلے ناروئی بھیا، اندر چل کر گپ شپ کریں۔“
روئی بھیا نے جواب دیا۔“ گپ شپ۔۔۔۔۔ اس وقت مر جاؤں تو جان بچے یہ جانتے ہو شری کانت بابو؟“

”نہیں جانتا“ مجھے یہ تسلیم کرنا ہی پڑا۔ جواب میں انہوں نے صرف ایک تیز آہ بھری ہے اور کہا۔۔۔۔۔ ”دو دن بعد ہی معلوم ہو جائے گا۔“

جب ابھیانے گپ چپ دوبارہ بھلایا تو مزید بحث نہ کر سکا اور اندر چلا گیا۔ رسوئی گھر کے علاوہ دوسرے اور بھی تھے۔ مقابل کا کمرہ ہی بڑا تھا اور اسی میں روئی بابو سوتے تھے۔ ایک طرف رسی کی کھاٹ پر ان کے بستر رکھے تھے اندر گھستے ہی دیکھا فرش پر آسن بچھا تھا، ایک طرف شستری میں پوری تر کاری، تھوڑا سا حلوہ اور ایک گلاس پانی رکھا ہوا تھا۔ معمولی عقل کا انسان بھی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ لوگ جیوش نہیں جانتے تھے کہ میری آمد کا علم انہیں ہو گیا ہو اور انہوں نے دوپہر سے ہی میرے لیے یہ انتظام کر رکھا ہو اس لئے لمحہ بھر میں ہی سمجھ گیا کہ کچھ لڑائی جھگڑا چل رہا ہے اس لیے روئی بھیا کا چہرہ غم بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ کہہ رہے تھے کہ مر جاؤں تو جان بچے۔ میں چپ چاپ کھاٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ ابھیانے کچھ دور کھڑی ہو کر پوچھا۔۔۔۔۔ ”آپ اچھے تو ہیں؟ اتنے دنوں بعد شاید غریبوں کا خیال آیا ہے؟“

کھانے کے تھاں کی طرف اشارہ کر کے میں نے جواب دیا۔۔۔۔۔ ”میری بات بعد میں ہوتی رہے گی لیکن یہ کیا ہے؟“

ابھیانہی اور کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔۔۔۔۔ ”کچھ نہیں۔ یہ تو بتائیے کہ آپ کیسے ہیں؟“
”کیسا ہوں یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا پھر کسی دوسرے کو کس طرح بتاؤں؟“ پھر کچھ سوچ کر بولا۔۔۔۔۔ روئی بھیا کہتے تھے۔۔۔۔۔ ”میرے منہ کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ روئی بھیا اپنی صھٹی چٹپوں سے ایک غیر قدرتی آواز کرتے ہوئے پھڑ پھڑا کر اندر گھس آئے اور کسی کی طرف دیکھے بغیر ہی انہوں نے پانی کا گلاس اٹھالیا۔ ایک ہی سانس میں انہوں نے اسے آدھا خالی کر دیا۔ باقی دو تین گھونٹ زبردستی پی کر خالی گلاس لکڑی کی میز پر رکھ دیا اور یہ کہتے کہتے باہر چل دیئے۔۔۔۔۔ ”جانے دو، خالی پانی پی کر ہی بیت بھر لوں۔ میرا یہاں اور کون بیٹھا ہے جو بھوک لگنے پر کھانے کو دے گا۔“

میں نے حیرت زدہ ہو کر ابھیانہ کی طرف دیکھا۔ چشم زدن کے لیے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس لمحہ اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور ہنس کر کہا۔۔۔۔۔ ”بھوک لگی ہو تو پانی کے گلاس کی نسبت،

دراز علاقہ میں آنے پر بھی ملازمت کا حصول میرے لیے اتنا ہی مشکل ہے جتنا خود اپنے ملک میں۔
ابھیانہ کی بات یاد آ گئی۔ جس انسان پر بھروسہ کر کے وہ گھر بار چھوڑ کر اپنا شوہر تلاش کرنے آئی تھی پتہ نہ ملنے پر اس کا کیا حال ہوگا؟ گھر چھوڑ کر باہر آنے کا راستہ کافی وسیع اور کھلا ہونے پر بھی واپس لوٹنے کا راستہ بھی اتنا ہی فراخ بنا رہ سکتا۔ اتنی بڑی امید بنگال کی آب و ہوا میں پرورش پانے کی وجہ سے مجھے کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل نہ تھا کہ کافی دنوں تک گزارہ کرنے کے قابل دولت جمع کر کے بھی انہوں نے اپنے قدم نہیں بڑھایا تھا۔ اس لیے ان کے لئے محض وہی چارہ کار تھا جو نوے فیصدی بنگالی اختیار کیا کرتے ہیں۔ یعنی مہینہ پندرہ دن کے بعد کسی غیر کی نوکری کر کے مرتے دم تک بمشکل تمام روح اور جسم کا تعلق قائم رکھ کر زندہ رہنا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ روئی بابو کے لیے بھی اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا لیکن رنگوں کے اس بازار میں صرف اپنا ہی پیٹ بھرنے کے لیے نوکری حاصل کرتے وقت جب میرا یہ حال ہے تو ایک عورت کا بار اپنے کندھوں پر لا کر ابھیانہ کے اس گرم سم اور کمزور بھیا کا کیا حال ہوا ہوگا اس کا خیال آتے ہی میں خوف زدہ ہوا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو کل ایک مرتبہ جا کر ان کی خبر ضرور لوں گا۔

دوسرے دن شام کے وقت تقریباً دو کوس فاصلہ طے کران کی رہائش گاہ پر پہنچا اور دیکھا کہ باہر کے برآمدے میں ایک چھوٹے سے موڑھے پر روئی بھیا بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کا چہرہ بادلوں سے محیط اسازھ کے پہلے دن کی مانند سنجیدہ ہو رہا تھا بولے۔۔۔۔۔ ”اوہ! شری کانت بابو! آپ، اچھے تو ہیں؟“
میں بولا۔۔۔۔۔ ”جی اچھا ہی ہوں۔“

”جائیے اندر جا کر بیٹھئے۔“
میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔۔۔۔۔ ”آپ لوگ تو سب اچھے ہیں؟“
”ہوں، اندر جائیے نا، وہ گھر میں ہی ہیں۔“
”اچھا جاتا ہوں۔۔۔۔۔ آپ بھی آئیے نا؟“

”نہیں، میں یہاں ہی کچھ دیر آرام کروں گا۔ محنت کرتے کرتے میں تو یک طرح سے مر جا رہا ہوں۔ دو گھڑی پاؤں پھیلا کر کچھ بیٹھ لوں یہی غیبت ہے۔ اگر چہ ان کے چہرے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی تھی کہ وہ محنت کرتے کرتے مرے جا رہے ہیں تاہم دل ہی دل میں کچھ متفکر ہوا تھا۔ روئی بھیا کے اندر بھی اتنی سنجیدگی اتنے دنوں سے اس شکل میں موجود ہے بغیر اپنی آنکھوں سے دیکھتے اس پر یقین کر لینا مشکل تھا۔ لیکن اصل معاملہ کیا ہے؟ میں خود بھی تو داسے کی خاک چھان چھان کر تنگ آ چکا ہوں۔ میرے یہ روئی بھیا بھی کیا۔۔۔۔۔

روہنی بھیا میری طرف پلٹ کر بلند لہجہ میں بول اٹھے ”سینے شری کانت بابو! یہ سب باتیں سن رکھیں۔ ان کے لیے ہی میں نے وطن چھوڑا، گھر لوٹنے کا راستہ بند ہو گیا۔ اب ان کے منہ کی بات سنیں۔ اف۔۔۔۔۔“

ابھیانے بھی اس مرتبہ غصے سے جواب دیا۔۔۔۔۔ ”میرا جو ہونا ہوگا ہو جائے گا، تمہیں مجبور نہیں کرتی جب جی چاہے گھر لوٹ جاؤ۔ میرے لئے تم اتنی مصیبت کیوں اٹھاؤ گے میں تمہاری کون ہوتی ہوں؟ اس طرح طعنہ زنی کی نسبت۔۔۔۔۔“

اس کی بات ابھی پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ روہنی بھیا تقریباً چنچ اٹھے۔ ”سینے شری کانت، دور روٹی پکا دینے کے لیے۔۔۔۔۔ یہ باتیں آپ ذرا سن رکھیں۔ اچھا آج سے کبھی تم نے اگر میرے لئے رسوئی گھر میں قدم رکھا تو تمہیں بہت ہی بڑی۔۔۔۔۔ بلکہ ہوٹل میں۔۔۔۔۔“ کہتے کہتے ان کا گلا گریہ سے بھر آیا۔ وہ دھوتی کا کنارہ منہ پر رکھ کر تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے مکان سے باہر ہو گئے۔ ابھیانے اپنا اتر اہوا چہرہ نیچے جھکا لیا۔۔۔۔۔ نامعلوم آنکھوں کے آنسو چھپانے کے لیے یا کسی اور غرض سے لیکن میں تو یکبارگی حواس باختہ ہوا اٹھا۔ چند دنوں سے دونوں کے درمیان ان بن ہو رہی تھی یہ تو صاف نظر آ رہا تھا لیکن اس کی تہ میں جو بات پوشیدہ ہے وہ تو بھوک اور پیاس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتی مجھے یہ سمجھنے میں ذرا سی دیر بھی نہ لگی۔ تو پھر کیا شوہر کو تلاش کرنے کی بات بھی میں اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اس خاموشی کو توڑنے کے لیے مجھے خود بھی جھک محسوس ہونے لگتی۔ پس و پیش کرنے کے بعد بالآخر میں نے کہا مجھے بہت دور جانا ہے اس لیے اب چلتا ہوں؟

ابھیانے منہ اوپر اٹھا کر کہا۔۔۔۔۔ اب کب آئیے گا؟

”بہت دور۔۔۔۔۔“

”تو پھر ذرا ٹھہر جائیے“ کہہ کر ابھیابا ہر چلی گئی پانچ چھ منٹ بعد لوٹ کر آئی اور میرے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ دے کر بولی۔۔۔۔۔ ”جس کام کی غرض سے میں یہاں آئی ہوں وہ سب اس میں مختصراً لکھ دیا ہے۔ پرزہ کر جو درست معلوم ہو کیجئے گا۔ میں آپ سے مزید کچھ کہنا نہیں چاہتی۔“ اتنا کہہ کر اور گلے میں آنچل ڈال کر آج اس نے مجھے پر نام کیا اور پھر اٹھ کر پوچھا۔۔۔۔۔ ”آپ کی رہائش کس جگہ ہے؟“

سوال کا جواب دے کر میں اس کاغذ کے چھوٹے سے پرزے کو منٹھی میں دبا کر آہستہ آہستہ نکل آیا۔ برآمدے کے باہر کا وہ موڑ اس وقت خالی تھا۔ روہنی بھیا کو بھی میں اس پاس کہیں دیکھ نہ سکا۔ قریب ہی راستے کو بغل میں چائے کا دکان پر دیکھ کر اس میں گھس گیا اور لیمپ کی روشنی میں اس خط کو

کھانے کا تھال ہی انسان کو پہلے نظر آتا ہے۔“

روہنی نے اس بات پر کان ہی نہ دھرے اور وہ باہر چل دیے لیکن ابھی آدھ منٹ بھی نہ گزرا ہوگا کہ وہ واپس لوٹ آئے اور کوڑا کے سامنے کھڑے ہو کر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔۔۔۔۔ ”تمام دن بھر دفتر میں محنت کرنے کے بعد بھوک کے مارے سر چکر رہا تھا شری کانت بابو! اس لئے اس وقت آپ سے بات نہ کر سکا، کچھ خیال نہ کیجئے گا۔“

میں نے کہا۔۔۔۔۔ ”نہیں۔“

انہوں نے پھر کہا۔۔۔۔۔ آپ جس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں وہاں میرے لئے بھی کیا تھوڑا سا انتظام ہو سکتا ہے؟

اس کے چہرے سے ظاہر ہونے والے جذبات دیکھ کر میں بے اختیار ہنس پڑا ہوا۔۔۔۔۔

لیکن وہاں پوریوں اور موہن بھوگ کا انتظام نہیں ہے۔“

روہنی بھیا بولے۔۔۔۔۔ ضرورت ہی کیا ہے۔ بھوک کے وقت اگر کوئی ذرا سا گڑ پانی ہی دے دے تو وہی آب حیات ہے۔ یہاں تو وہ بھی کون دیتا ہے؟

میں نے جاننے کی غرض سے ابھی پر نگاہ ڈالی فوراً ہی وہ آہستہ سے بولی۔ ”سر میں درد تھا اس لیے بے وقت سو گئی تھی اور یہی وجہ ہے کہ کھانے بنانے میں آج ذرا سی دیر ہو گئی شری کانت بابو؟“

میں نے تعجب کے ساتھ کہا۔۔۔۔۔ ”بس یہی جرم ہے؟“

ابھی اسی طرح استقوال سے بولی۔۔۔۔۔ ”یہ کیا کوئی معمولی جرم ہے۔ شری کانت بابو؟“

”معمولی نہیں تو اور کیا ہے؟“

ابھیانے جواب دیا۔۔۔۔۔ ”آپ کے نزدیک معمولی ہو سکتا ہے لیکن جو صاحب زبردستی گلے پڑی ہوئی کو کھانے کے لیے دیتے ہی وہ اس کو معاف نہیں کر سکتے۔ میرے سر درد کرتا رہے تو ان کا کام کس طرح چل سکتا ہے؟“

روہنی بابو ایک دم تڑپ اٹھے اور گرج کر بولے۔۔۔۔۔ ”تم میرے گلے پڑی ہوئی ہو یہ میں نے کب کہا؟“

ابھیابولی۔۔۔۔۔ ”کہو گے کس لیے ہزار مرتبہ اظہار تو کر چکے ہو؟“

روہنی بھیا بولے۔۔۔۔۔ ”اظہار کر رہا ہوں، اور تمہارے دل میں جلیبی کی طرح پھیر ہے۔ تم نے

مجھ سے کب کہا تھا کہ سر درد کر رہا ہے؟“

ابھیانے کہا۔۔۔۔۔ ”کہنے کا فائدہ ہی کیا تھا۔ کیا تم یقین کر لیتے؟“

کھول میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھ لیا۔ پنل سے تحریر تھی لیکن طرز تحریر بالکل مراد نہ تھی۔ سب سے پہلے اس نے اپنے شوہر کا نام اور اس کا پرانا پتہ دے کر نیچے لکھا تھا..... ”آج آپ اپنے دل میں جو خیال لئے جا رہے ہیں اسے میں جانتی ہوں اور مصیبت کے موقع پر آپ کا کتنا بھروسہ ہے وہ بھی غالباً آپ جانتے ہی ہیں اس لیے میں نے آپ کا پتہ دریافت کر لیا ہے۔“

ابھی کی اس تحریر کو میں نے کئی بار پڑھا لیکن کچھ ٹھوڑی سی باتوں کے علاوہ اور کسی بھی خاص بات کا اندازہ نہ کر سکا۔ آج ان لوگوں کا باہمی برتاؤ اپنی نظر سے دیکھ کر باہر کا کوئی انسان جو کچھ بھی سوچ سکتا ہے اس کا اندازہ نہ کر لیتا ابھی جیسی ہوشیار اور عقلمند عورت کے لیے کوئی مشکل نہ تھا لیکن اس کے باوجود بھی اس کا اندازہ صحیح ہے یا غلط اس کے متعلق ذرا سا بھی اشارہ اس نے نہیں کیا۔

اس کے شوہر کا نام اور پتہ تو میں نے پہلے بھی سنا تھا لیکن مصیبت کے وقت وہ اس کی تلاش کرنا چاہتی ہے یا نہیں یا اور کون سی مصیبت کا امکان سمجھ کر اس نے میرا یہ پتہ دریافت کر لیا ہے..... وغیرہ وغیرہ کسی بھی بات کا ذکر تک میں اس کا تحریر سے باوجود کوشش بسیار کے تلاش نہ کر سکا۔ گفتگو کے دوران میں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ روٹی کی دفتر میں ملازمت حال کر چکا ہے۔ کس طرح حاصل کر چکا ہے یہ بھی مجھے معلوم نہ ہو سکا لیکن ہاں میری طرح کھانے پینے کی تشویش انہیں نہیں ہے..... پوریاں بھی کھانے کو مل جاتی ہیں..... پھر ابھی انہیں کس قسم کی مصیبت کے لیے مجھے تیار کر رکھا ہے اور ایسا کرنے میں کیا فائدہ ہوگا؟ ابھی ہی جانے۔

باہر نکل کر تمام راستہ بھر میں ان ہی لوگوں کے متعلق سوچتے سوچتے اپنی قیام گاہ پر پہنچا۔ کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکا۔ محض یہی فیصلہ کیا کہ ابھی کا شوہر کوئی بھی کیوں نہ ہو اور خواہ جہاں بھی کسی حالت میں کیوں نہ ہو اس کی بیوی کے پرزور اصرار کے بغیر اس کو ڈھونڈھ نکلنے کی باتابی مجھے مجبوراً روکنی ہی پڑے گی۔

دوسرے دن سے میں پھر اپنی نوکری کی امیدواری میں مصروف ہو گیا مگر ہزار ہا تفکرات اور پریشانیوں کے باوجود بھی ابھی کی تشویش کو دل سے اکھاڑ کر پھینک نہ سکا۔ لیکن تشویش خواہ کتنی ہی کیوں نہ کروں ایک کے بعد ایک دن اپنی قدرتی رفتار سے نکلنے لگا۔ ادھر قسمت پر شا کر رہنے والے داداٹھا کر کا مسرور چہرہ ابر آلود سا ہونے لگا۔ کھانے کے وقت پہلے تو سبزیوں کی مقدار اور پھر تعداد رفتہ رفتہ کم ہونے لگی مگر نوکری نے میرے متعلق مطلقاً کوئی تبدیلی نہ کی۔ جس نظر سے اس نے پہلے دن دیکھا تھا مہینہ بھر سے مجھے غصہ اور افسوس آ گیا مگر اس وقت تک مجھے اس بات کا علم نہ تھا کہ جب تک نوکری کرنے کی

وہ بازار میں راستے کے کنارے ساگ بیزی خرید رہے تھے۔ میں چپ چاپ ان کے پاس کھڑا ہو کر دیکھتا رہا۔ اگرچہ ان کا لباس اور جوئے بوسیدگی کی انتہائی حالت کو پہنچ چکے تھے..... جھلسا دینے والی گرمی میں سر پر ایک چھتری تک نہیں ہے۔ لیکن کھانے کا سامان وہ بڑے آدمیوں کی طرح ہی خرید رہے تھے۔ اس کام میں جستجو اور جانچ پرکھ کی بھی کوئی حد نہیں۔ خواہ کتنی ہی زحمت اور کتنا ہی جھنجھٹ کیوں نہ اٹھانا پڑے اچھی چیز خریدنے میں وہ ہمہ تن محو تھے چشم زدن میں تمام بیوپاری میری نظر کے سامنے تھا۔ اس خرید و فروخت کر در پردہ ان کی بے تابانہ محبت کس مرکز پر جا کر ٹھہرتی ہے آفتاب کی روشنی کی طرح مجھے صاف صاف معلوم ہوئی کسی لیے یہ سب کچھ لے کر انہیں اپنے گھر پہنچنا ہی چاہیے اور کس لیے ان سب چیزوں کی قیمت ادا کرنے کے لیے ان کو ملازمت اختیار کرنی پڑی اس راز کو مل کرنے میں مجھے کچھ بھی دیر نہ لگی۔ آج میں صاف طور سے سمجھ گیا کہ انسانوں کے اس چنگل میں اس نے اپنے راستے کیوں حاصل کر لیا ہے اور میں ابھی تک کیوں ناکام رہا ہوں؟

یہ دہلا پٹا انسان رنگوں کی شاہراہ پر ایک بڑی سی گٹھڑی لیے ہوئے سینکڑوں جگہ سے پھٹے سلعے کپڑوں میں لمبوس گھر کی طرف جا رہا تھا..... آڑ میں سے میں نے اس کی مضطرب چہرے کی طرف دیکھا اپنی طرف دیکھنے کی گویا اسے فرصت ہی نہ تھی۔

جس شے سے اس کا دل معذور ہو رہا تھا اس کے مقابلہ میں کپڑے لتوں کی ہستی ہی کیا تھی؟ اور میری یہ حالت تھی کہ اپنے کپڑوں کے معمولی میلے پن کی وجہ سے ہی میں ہر قدم پر شرم کے مارے سکر کر پتھر ہوا جا رہا تھا۔ راہ چلتے ہوئے کسی بالکل اجنبی کی بھی اپنے اوپر نظر پڑتے دیکھ کر شرم کے مارے مرا جا رہا تھا۔

روٹی بھیا چلے گئے۔ میں نے انہیں پکارا نہیں اور وہ جلد ہی دوسرے لوگوں کے ہجوم میں غائب ہو گئے۔ ایسا کیوں ہوا میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ لیکن اس مرتبہ آنسوؤں کی روانی میں میری دونوں آنکھیں دھندلی ہو گئیں اور چادر کے کنارے سے پونچھتے ہوئے راستے کے کنارے کتارے میں آہستہ آہستہ اپنی قیام گاہ پر لوٹ آیا اور دل ہی دل میں بار بار کہنے لگا کہ محبت سے بڑھ کر کوئی طاقت نہیں۔ محبت سے سے بڑھ کر کوئی معلم شاید دنیا میں ہے ہی نہیں۔ ایسا کوئی مشکل مرحلہ نہیں جس کو یہ پار نہ کر سکے۔

تاہم کئی صدیوں کا قدیم اعتقاد میرے کانوں میں چپ چاپ کہنے لگا کہ یہ نیک نہیں ہے۔ یہ پاکیزہ نہیں ہے..... انجام کار اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔

قیام گاہ پر پہنچتے ہی ایک بڑا القافہ ملا کھول کر دیکھا۔ ملازمت کی درخواست منظور ہو گئی ہے ساگوں کی لکڑی کا ایک بہت بڑا سوداگر بے شمار درخواستوں کی موجودگی میں بھی مجھ غریب پر ہی خوش ہوا

تھا۔ میرے پر ماتما کے لیے بھی ممکن تھا یا نہیں اس میں بھی شک ہے۔ ابھی اٹھ کر گئی اور ایک خط لاکر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ کچھ دن ہوئے وہ بر مار یوے کمپنی کے دفتر سے آیا تھا۔ بڑے صاحب نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ابھی کا شوہر تقریباً دو سال پیشتر کسی بڑے بھاری جرم کی پاداش میں کمپنی کی نوکری سے برخواست کر دیا گیا ہے اور اس کے بعد وہ کہاں چلا گیا ہے اس کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں جانتے۔

ہم دونوں ہی بہت دیر تک سن ہوئے بیٹھے رہے آخر کار ابھی اے ہی اس خاموشی کو توڑا پوچھا..... ”اب آپ کیا مشورہ دیتے ہیں۔“

میں نے آہستہ سے کہا..... ”اب کیا رائے دوں؟“

ابھی اسر ہلا کر بولی..... ”نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ ایسی حالت میں آپ کو ہی میرا فرض بتانا پڑے گا۔ اس خط کے ملنے کے بعد سے ہی میں بڑی امید کے ساتھ آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں۔“

میں نے دل ہی دل میں کہا..... ”بہت خوب، کیا میری ہی رائے لے کر گھر سے باہر نکلی تھی جو میرے رائے کے لیے راہ دیکھ رہی ہو۔“

بہت کافی دیر تک خاموش رہنے کے بعد میں نے دریافت کیا..... ”واپس گھر لوٹ جانے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟“

ابھی نے جواب دیا..... ”کچھ بھی نہیں۔ آپ کہیں تو جا بھی سکتی ہوں مگر میرا تو وہاں کوئی نہیں ہے۔“

”روٹی بابو کیا کہتے ہیں؟“

”وہ کہتے ہیں کہ نہیں جائیں گے۔ کم از کم دس سال تک تو وہ اس طرف نظر بھی نہ اٹھائیں گے۔“

بہت دیر تک چپ رہ کر میں نے کہا..... ”وہ آپ کا بار کیا ہمیشہ سنبھالے رہ سکیں گے؟“

ابھی بولی..... ”آپ ہی بتائیے کہ غیر کے دل کی بات میں کیا جانوں؟ اس کے علاوہ وہ خود بھی کس طرح جان سکتے ہیں؟ اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے چپ رہی پھر بولی۔ ”ایک بات اور بھی ہے میرے لیے وہ ذرا سے بھی ذمہ دار نہیں ہیں۔ قصور کہو یا غلطی کہو جو کچھ بھی ہے میری ہی ہے۔“

گاڑی بان نے باہر سے پکارا..... ”بابو اور کتنی دیر ہوگی؟“

گویا میری جان فٹ گئی۔ اس مشکل سے نجات حاصل کرنے کا میرے لیے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ میرا دل اس بات پر یقین کرنے کے لیے کبھی تیار نہ تھا کہ ابھی بحر مصیبت میں گر

ہے بھگوان اس کا بھلا کریں۔

نوکری کے نام سے میں واقف نہ تھا لہذا اسے حاصل کر کے دل میں یہ شک باقی ہی رہا کہ وہ بہت دنوں تک قائم رہے گی یا نہیں۔ وہ صاحب میرے آقا ہوئے تھے وہ اگرچہ سچے صاحب (انگریز) تھے تاہم بنگالی خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ کیونکہ وہ کلکتہ کے دفتر سے تبدیل ہو کر بر ما آئے تھے۔ وہ بیٹے کی ملازمت کے بعد ہی انہوں نے بلوا کر کہا..... ”شری کانت بابو، تم اس میز پر آ کر کام کرو تو خواہ بھی پہلے کی نسبت تقریباً اڑھائی گنا پاؤ گے۔“

میں نے بظاہر اور دل ہی دل میں بھی صاحب کو لاکھوں دعائیں دیتے ہوئے اس ہڈی پیل نگلی ہوئی میز کو خیر باد کہہ کر ہری باناٹ کی مڑھی ہوئی میز پر دخل جمالیا۔ انسان کی جب بہتری ہوئے لگتی ہے تو اسی طرح ہوتی ہے ہم لوگوں کو ہوٹل کے ادا اٹھا کرنے بالکل ہی جھوٹ نہیں کہا تھا۔

کرائے کی گاڑی پر سوار ہو کر یہ خوشخبری سنانے کے لیے ابھی کے ہاں پہنچا۔ روٹی بھیا دفتر سے لوٹ کر ناشتہ کرنے کے لیے بیٹھے تھے لیکن آج انہیں صرف پانی پی کر ہی اپنی بھوک مٹاتے نہیں دیکھا بلکہ آج جس طرح وہ اپنی بھوک پوری کر رہے تھے اس طرح پوری کرتے دنیا میں اور کسی کو اعتراض ہو تو ہو لیکن مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اس لیے یہ کہنا فضول ہے کہا بھیا کی دعوت پر میں نے انکار نہیں کیا تھا۔ کھانا ختم ہوتے ہی روٹی بھیا کوٹ پہننے لگے۔ ابھی نے جھنجھلا کر کہا..... ”تم سے میں برابر کہتی آ رہی ہوں روٹی بھیا! کہ یہ کمزور جسم لے کر تم اتنی سخت محنت مت کرو۔ کیا تم کسی طرح بھی نہ سنو گے؟ اچھا یہ تو بتاؤ کہ ہم اتنے زیادہ روپوں کو کیا کریں گے؟ دن تو ہمارے اچھی طرح کٹ رہے ہیں۔“

روٹی بھیا کی آنکھوں سے پیار جھڑنے لگا وہ کچھ ہنس کر بولے..... ”اچھا اچھا یہ اچھی کہی، ایک رسوینا تک تو رکھ نہیں سکتا۔ چو لہے کے پاس دونوں وقت کام کرتے کرتے تمہارا جسم سوکھ گیا ہے۔“ اتنا کہہ کر اور پان کھا کر جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہوئے باہر چل دیئے۔

ابھی ایک ہلکی سی آہ دبا کر زبردستی ذرا سانس کر بولی..... ”دیکھیے تو شری کانت بابو، ان کا ظلم، تمام دن جی تو زکرت کرنے کے بعد گھر آ کر کچھ آرام کر لیں یہ بھی تو نہیں ہو سکتا۔ اب رات کو بھی نو بجے تک لڑکوں کو پڑھانے باہر چلے گئے ہیں۔ میں کتنا کہتی ہوں لیکن کسی طرح سنتے ہی نہیں۔ دو آدمیوں کا کھانا بنانے کے لیے رسوینا رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بتائیے ہے نایہ سب ان کی زیادتی؟“

یہ کہہ کر اس نے ایک طرف کو آنکھیں پھیر لیں۔

میں آہستہ آہستہ قدرے ہنس دیا۔ نا، یا ہاں کسی طرح کا بھی جواب دینا میرے لیے ممکن نہ

میرے گاڑی میں بیٹھے ہی گاڑی چل دی مگر دس قدم بھی نہ گیا تھا کہ یاد آیا، چھڑی تو وہاں ہی بھول آیا ہوں۔ فوراً گاڑی کھڑی کی اور مکان میں داخل ہوتے ہی دیکھا کہ عین دروازے کے سامنے ہی ابھیا الٹی بڑی ہے اور تیرے گھائل ہوئے جانور کی طرح کسی نامعلوم درد سے بھھاڑ کھا کر گویا جان توڑ رہی ہے۔

کیا کہہ کر اسے تشفی دوں یہ میری عقل سے بالا تر بات تھی۔ کسی بدحواس کی طرح کچھ دیر گم سم کھڑا رہ کر اسی طرح چپ چاپ لوٹ آیا۔ ابھیا جس طرح رو رہی تھی بدستور روتی رہی۔ اس کو یہ معلوم ہی نہ سکا کہ اس کے اس بے پایاں اضطراب اور بے پناہ درد کا ایک خاموش شاہد بھی اس کائنات میں موجود ہے۔

راج لکشمی کا اصرار میں ابھی تک بھولا نہ تھا۔ پڑنے خط لکھنے کی بات جب سے یہاں آیا تھا، میرے دل میں جاگزیں تھی لیکن اول تو یہ کہ دنیا میں جس قدر بھی مشکل کام ہیں ان میں سے خط لکھنا بھی کسی سے بھی کم نہیں سمجھتا۔ اس کے علاوہ پھر لکھوں بھی کیا؟ حسن اتفاق کہ ابھیا کا نالہ و گریہ میرے دل میں اس طرح بھاری ہوا تھا کہ اس کا کچھ حصہ باہر نکالے بغیر مجھے کسی طرح بھی قرار ہی نہ آتا تھا۔ اس لیے اپنی قیام گاہ پر پہنچتے ہی کاغذ قلم کے کربائی جی کو خط لکھنے بیٹھ گیا..... اسے چھوڑ کر میرے درد و غم کا حصہ دار اور تھا ہی کون؟ دو تین گھنٹے بعد اس ادبی بحث، کو ختم کر کے جب میں نے قلم رکھا تو رات کے بارہ بج چکے تھے مگر اس لیے کہ شاید صبح کی روشنی میں یہ خط ڈاک میں ڈالتے ہوئے شرم محسوس ہو میں نے اپنے مزاج گرم رہتے رہتے ہی ان کو اسی وقت لیٹرنگس کے سپرد کر دیا۔

مجھے شک تھا کہ ایک شریف گھرانے کی خاتون کے درد و اضطراب کی داستان کی کسی غیر عورت پر ظاہر کرنا مناسب ہے یا نہیں لیکن ابھیا کی اس انتہائی مصیبت کے موقع پر وہ راج لکشمی جس نے ایک دن پیاری بائی کی پیاس کو دبا دیا تھا اس کے لیے کیا نیک رائے دیتی ہے۔ یہ معلوم کرنے کی خواہش نے مجھے ایک دم بے قابو کروا دیا اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس سوال کو الٹ پلٹ کر میں نے

کر غوطے کھا رہی ہے میں نے عورتوں کی کتنی ہی الٹی پلٹی حالتیں دیکھی ہیں اس لیے میں بخوبی سمجھتا ہوں کہ ان ظاہرہ آنکھوں پر اعتبار کر لینا بہت بڑی نا انصافی ہے۔

گاڑی بان نے ایک دفعہ بھر بلایا اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیری اٹھ کھڑا ہوا اور بولا..... ”میں جلد ہی بھر کسی دن آؤں گا۔“ یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل آیا۔ ابھیا اور کچھ نہ بولی..... موم حیات مجسمہ کی طرح بے حس و حرکت زمیں کی طرف دیکھتی رہ گئی۔



”یہ نوکری نہ بھی رہے تو آپ جیسے ہوشیار انسان کے لیے تشویش ہی کس بات کی ہے؟ ریلوے کی ملازمت چھوٹ جانے کے بعد آپ کو کتنے دن بیکار رہنا پڑا تھا؟“

میری بات سن کر وہ پہلے تو کچھ گھبرایا پھر بولا..... ”آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ بالکل جھوٹ نہیں ہے لیکن صاحب آپ جانتے ہیں کہ فیلی مین (عیالدار) ہوں۔ بہت سے بچے کچے.....“

”آپ نے کیا کسی بری عورت سے شادی کر لی ہے؟“
وہ یکا یک بول اٹھا..... ”معلوم ہوتا ہے کہ سالے صاحب نے رپورٹ میں سب کچھ لکھ دیا ہے۔ اسی لیے آپ کی ناراضگی کا علم ہو سکتا ہے۔“

انتاکہ کر میرے منہ کی طرف دیکھ کر کچھ نرم ہو کر بولا..... ”آپ کیا اس پر یقین کرتے ہیں؟“
میں نے گردن ہلا کر کہا..... ”اس میں برائی ہی کیا ہے؟“

حوصلہ پا کر وہ بولا..... ”ٹھیک فرماتے ہیں صاحب! میں تو یہ سب سے ہی کہتا ہوں کہ جو کچھ کروں گا بولڈی (دلیرانہ طور پر) کروں گا۔ میں اس قماش کا نہیں ہوں کہ ظاہر کچھ اور باطن کچھ اور۔“

آپ جانتے ہی ہیں کہ میں مرد ہوں جو کچھ کہوں گا صاف صاف کہوں گا چھپانے کی ضرورت ہی کیا؟ اس کے علاوہ گھر پر تو میرا کوئی ہے ہی نہیں..... اور جب یہاں رہ کر ہی ہمیشہ کے لیے ملازمت کر کے پیٹ بھرنے تو آپ سمجھتے ہی ہیں صاحب!“

میں نے سر ہلا کر بتایا کہ میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔“
پھر پوچھا کہ ”گھر پر کیا تمہارا کوئی بھی نہیں ہے؟“
اس کے چہرے پر ذرا سی بھی میل نہ آئی اس نے جواب دیا..... ”جی نہیں کوئی نہیں..... اگر

کوئی ہوتا تو پھر میں اس سورج ماما کے ملک میں آ سکتا؟ صاحب آپ یقین نہ کریں گے۔ میں ایسے ویسے گھرانے کا لڑکا نہیں ہوں کبھی ہم لوگ بھی زمین دار تھے۔ آج بھی اگر آپ ہمارے دیس کے مکان کو دیکھیں تو آپ کی آنکھیں چکر جائیں لیکن اوائل عمر میں ہی سب مر کھپ گئے..... میں نے کہا جانے بھی دو۔ گھربار، دھن، دولت، زمین جائیداد یہ سب ہیں کس لیے؟ سب کچھ ذات برادری میں تقسیم کر کے میں برما چلا آیا۔“

کچھ مستحکم لہجہ میں پوچھا..... ”کیا آپ ابھی کو جانتے ہیں؟“
وہ چونک اٹھا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بولا..... ”آپ کو اس کا کس طرح علم ہے؟“
میں نے کہا..... ”ایسا بھی ممکن ہے کہ آپ کا پتہ لگا کر اس نے اپنے گزارے کے لیے اس دفتر میں درخواست دی ہو۔“ وہ کچھ مسرور لہجہ میں بولا..... ”اوہ، یوں فرمائیے تو میں بھی تسلیم کرتا ہوں

ایک مرتبہ بھی نہیں سوچا۔ ابھی کے شوہر کے نہ ملنے کی بات بھی بار بار دماغ میں گھوم رہی تھی لیکن پتہ مل جانے پر یہ الجھن اور بھی زیادہ پیچیدہ ہو سکتی ہے۔ یہ تشویش ایک بار بھی پیدا نہ ہوئی اور اس گورکھ دھندے کو حل کرنے کا بار بھی پر ماتما نے میرے ہی سپرد کر رکھا ہے یہ بھی کسی نے سوچا تھا؟

تین چار دن بعد میرا ایک بری کلرک میری میز پر ایک فائل رکھ گیا۔ اس پر نیلی پنسل سے لکھا ہوا بڑے صاحب کا نوٹ تھا۔ انہوں نے مجھے کیس کا فیصلہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ معاملے کو شروع سے آخر تک پڑھ کر کچھ لحوں کے لئے میں دم بخود رہ گیا۔ واقعہ مختصر ایہ تھا کہ ہمارے پردم دفتر کے ایک کلرک کو وہاں کے ایک انگریز منیجر نے لکڑی چرانے کے شبہ میں معطل کر کے رپورٹ کی تھی کلرک کا نام دیکھ کر ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہی ہماری ایشیا کا شوہر ہے۔ اس کی بھی چار پانچ صفحہ کی کیفیت درج تھی۔ برما ریلوے میں بھی کسی سنگین جرم کی وجہ سے یہ نوکری سے برطرف ہوا تھا یہ اندازہ کر لینے میں بھی مجھے کچھ زیادہ دیر نہ لگی۔

تھوڑی ہی دیر بعد اس کلرک نے آ کر کہا کہ ایک شریف آدمی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے میں تیار ہی تھا اور میں یقیناً جانتا تھا کہ پردم سے وہ شخص اپنے کیس کی پیروی کرنے آیا ہے۔ اس لیے کچھ دیر بعد اس نے مجھ درشت دیئے تو بلا وجہ ہی میں نے پچان لیا کہ یہی ابھی کا شوہر ہے۔ اس کی طرف دیکھتے ہی میرا دل نفرت سے معمور ہوا اٹھا۔ پہنے تھا وہ ہیٹ کوٹ لیکن جس قدر پرانے اتنے ہی گندے۔ تمام چہرہ سیاہ، بڑی بڑی مونچھوں اور داڑھی سے ڈھکا ہوا نیچے کا ہونٹ شاید ڈیرھانچ موٹا تھا اور پان اس نے اس کثرت سے کھائے تھے کہ ان کا رنگ دونوں طرف جم گیا تھا۔ بات کرتے ہوئے خوف معلوم ہوتا تھا کہ کہیں تھوک کے چھینٹے نہ پڑیں۔

اس بات کو میں جانتا ہوں کہ شوہر ہی عورت کا دیوتا ہے..... وہ ہی اس کی یہ دنیا اور وہ عقیدے ہیں لیکن اس جسم بدی کے ساتھ ابھی کا مقابلہ کرتے ہوئے میری روح تک لرز اٹھی۔ ابھی اور خواہ جو بھی ہو ایک حسین اور باذوق خاتون ہے لیکن یہ بھینسا برما کے کس جنگل سے یکا یک باہر نکل آیا ہے اس کا علم اس برما کو ہو گا جس نے اس کی تخلیق کی ہے۔

بیٹھنے کا اشارہ کر کے میں نے دریافت کیا کہ تمہارے خلاف جو الزام لگایا گیا ہے اس میں کہاں تک سچائی ہے؟ اس کے جواب میں وہ دس منٹ تک وہابیات بکتا رہا جس کا مقصد یہ تھا کہ میں بالکل ہی بے تصور ہوں اور میری موجودگی میں پردم دفتر کا صاحب دونوں ہاتھوں سے لوٹ نہیں چا سکتا تھا یہی اس کی مخالفت کا باعث تھا اور اس نے یہ چال اس لیے اختیار کی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو مجھے برطرف کر کے اپنے ایک آدمی کو بھرتی کر لیا جائے مجھے اس کی بات پر مطلقاً یقین نہ آیا میں نے کہا.....

کہ ایک وقت وہ میری بیوی تھی۔“

”اور اب؟“

”کوئی نہیں، میں اسے چھوڑ کر یہاں چلا آیا ہوں۔“

”اس کا جرم؟“

اس نے چہرے پر ایک مصنوعی درد کا جذبہ لا کر کہا ”آپ جانتے ہیں صاحب! فیملی سیکرٹ (گھریلو راز) بتانا مناسب نہیں مگر اس وقت آپ میرے حقیقی ہمدرد ہیں اس لیے کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ ایک بد چلن عورت ہے، اسی روحانی کوفت کی وجہ سے ہی مجھے وطن چھوڑنا پڑا ہے۔ ورنہ کیا کوئی شوق سے اس ملک میں پاؤں رکھ سکتا ہے؟ آپ ہی فرمائیے کہ اس میں کوئی ایسی ویسی عداوت کی بات ہے؟“

”جواب کیا دوں؟“ شرم کے مارے میرا سر گوں ہو گیا۔ شروع سے ہی میں نے اسے پرلے درجے کے دروغ گو کی ایک بات پر بھی یقین نہیں کیا تھا لیکن اب مجھے صاف صاف معلوم ہو گیا کہ یہ جتنا کم ظرف ہے اتنا ہی بے درد بھی ہے۔

ابھیا کے متعلق میں کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن پھر بھی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں جو الزام شوہر ہو کر بھی اس مکار نے اس پر بلا جھجک لگا دیا غیر ہو کر بھی میں اسے زبان سے کہہ نہیں سکتا۔ کچھ دیر بعد سر اٹھا کر میں نے کہا..... ”اس کے اس جرم کی بات آپ نے آتے وقت تو اس سے نہیں کہی تھی اور جب یہاں آ کر بھی کچھ دن تک آپ اسے خط وغیرہ اور روپیہ پیسہ بھیجتے رہے تو بھی اس پر خط کے ذریعہ یہ بات ظاہر نہیں کی؟“

وہ سید کا راعظم بے حیائی سے اپنے موٹے ہونٹوں کو پھاڑ کر ہنستا ہوا بولا۔ ”یہی تو بات ہے آپ جانتے ہی ہیں صاحب! کہ ہم شریف آدمی ہیں، ہم لوگ چپ چاپ سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں لیکن ہلکے لوگوں کی طرح اپنی بیوی کے کلک کی بات کا ڈھنڈور انہیں پیٹ سکتے۔ خیر یہ سب دکھ کی باتیں چھوڑ دیجئے صاحب! ایسی عورتوں کا نام زبان پر لاتے ہی گناہ ہوتا ہے..... ہاں تو پھر کیس تو آپ ہی ڈسپوز (فیصلہ) کریں گے نا؟ میری جان بچی، خیریت ہوئی لیکن پھر بھی عرض کئے دیتا ہوں کہ صاحب بچو کو یونہی چھوڑ نہ دیا جاتے بلکہ اچھی طرح ایسا سبق پڑھایا جائے کہ پھر زندگی بھر کبھی میری مخالفت کی جرأت نہ ہو سکے۔ وہ بھی سمجھ جائے کہ میرے مہربان مربی کا کچھ زور ہے سمجھنے نا؟ آپ؟ میں کہتا ہوں کہ کیا اس حرامزادے کو ہیڈ آفس میں کھینچا نہیں جاسکتا؟“

میں نے کہا..... ”نہیں“

اس نے ہنسی کی ایک پھل جھڑی سے فائل کو کچھ آگے سرکاتے ہوئے کہا۔ ”لیجئے مذاق چھوڑیے۔ میں نے اچھی طرح اطمینان کر لیا ہے کہ بڑے صاحب بالکل آپ کی مٹھی میں ہیں؟ خیر مرنے دیجئے اسے اور بھی ایک مرتبہ وہ میرے پیچھے لگ کر دیکھ لے۔ اچھا کیا بڑے صاحب کا آرڈر، نکال کر آج ہی میرے ہاتھ نہیں دیا جاسکتا؟ رات کے نو بجے ہی میں چلا جاتا۔ رات کو بیکار تکلیف اٹھانی نہ پڑتی۔ کیا فرماتے ہیں آپ؟“

میں یکا یک جواب نہ دے سکا۔ کیونکہ خوشامد چیز ہی ایسی ہے کہتے ہیں خوشامد کرا خوش نہ آئید۔ برخلاف بات منہ پھلاتے ہوئے جھجکی محسوس ہونے لگی لیکن اس رکاوٹ کی کوئی پرواہ نہ کی اپنے آپ کو سخت بنا کر کہہ ہی دیا۔ ”بڑے“ صاحب کا حکم حاصل کر لینے سے آپ کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ آپ اور کہیں نوکری تلاش کیجئے۔“

ایک ساعت میں ہی وہ کاٹھ ہو گیا اور کچھ دیر بعد بولا..... ”اس کے معنی؟“

”اس کے معنی یہ ہیں کہ میں آپ کو ڈس مس (برخواست) کرنے کا نوٹس ہی دوں گا۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا..... ایک دم بیٹھ گیا۔ اس کی دونوں آنکھیں چھپلا آئیں۔ ہاتھ باندھ کر بولا.....

”بنگالی ہو کر بنگالی کومت مارے بابو! میں بال بچے دار مر جاؤں گا۔“

”یہ دیکھنے کا بار مجھ پر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میں آپ کو جانتا نہیں آپ کے صاحب کے خلاف بھی میں جانتا نہیں سکتا۔“

اس نے ایک نظر میرے چہرے پر ڈالی کہ شاید سمجھ لیا کہ میں دل لگی نہیں کر رہا ہوں اور بھی کچھ دیر وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس کے بعد ہی دفعۃً وہ زور سے رو پڑا۔ کلرک، دربان، چیڑ اسی جو جہاں تھے اس غیر متوقع واقعہ سے دنگ ہو گئے۔ میں بھی گویا شرمندہ سا ہو گیا۔ اس کو روکنے کے ارادے سے میں نے کہا..... ”ابھیا آپ کے لیے ہی برما آئی ہے۔ ایک بد چلن عورت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے میں اصرار نہیں کرتا لیکن آپ کی سب باتیں سن کر بھی اگر وہ محاف کر سکے..... اور آپ اس سے لکھو کر چٹھی لائیں تو آپ کی نوکری بحال رکھنے میں پوری پوری کوشش کروں گا ورنہ دوبارہ مل کر مجھے شرمندہ نہ کرنا..... میں غلط بات نہیں کہتا۔“

میں جانتا تھا کہ یہ بد فطرت لوگ نہایت بزدل اور ڈر پوک ہوتے ہیں اس نے آنکھیں پونچھ کر کہا..... ”وہ کہاں ہے؟“

”کل اسی وقت آئیں گے تو اس کا پتہ بتا دوں گا۔“

وہ اور کچھ نہ کہہ کر بھی سلام کر کے چلا گیا۔

اسی طرح کی بالکل ہی خالص خوشامدانہ باتیں اور درمیان میں گاہے گاہے رومال سے آنکھیں بھی پونچھنے لگا۔ اتنی زیادہ باتیں سننے کا حوصلہ اور کسی کو نہیں ہو سکتا اس لیے یہ سزائیں آپ کو دینا نہیں چاہتا۔ میں اس کی طول طویل داستان کا مختصر آہی ذکر کروں گا۔ اس نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنی بیوی پر جو الزام لگایا تھا وہ بالکل ہی جھوٹ ہے۔ اس نے شرم کے پھیر میں پڑ کر ہی ایسا کیا تھا ورنہ ایسی سستی لکشی کیا کہیں مل سکتی ہے اور دل ہی دل میں میں وہ ابھیا کو ہمیشہ جان سے بھی عزیز سمجھتا رہا ہے۔ اور یہاں جو اسے ایک اور موقع مل گیا اس کی اسے بالکل ہی خواہش نہ تھی محض برمیوں کے ہاتھ سے جان بچانے کے لیے ہی اس نے ایسا کیا ہے (ممکن ہے کہ اس میں کچھ صداقت بھی ہو) لیکن آج رات جب وہ اپنے گھر کی لکشی کو لے جا رہا ہے تو اس برمی بچی کو دفع کرتے کچھ دیر نہ لگے گی؟ باقی رہے لڑکے بچے..... اوہ ہوا! سالوں کی جیسی شکل و صورت ہے ویسا ہی مزاج بھی ہے وہ کسی کام کے نہیں۔ بڑھاپے میں نہ تو کھانے پہننے کو ہی دیں گے اور نہ مرنے پر ایک چلو پانی کی ان سے امید ہو سکتی ہے۔ جاتے ہی ان سب کو جھاڑو مار کر رخصت کر دوں گا وغیرہ وغیرہ۔“

میں نے پوچھا..... ”ابھیا کو آج ہی رات لے جائیں گے آپ؟“ اس نے حیرت زدہ ہو کر جواب دیا..... ”خوب، جب تک آنکھوں نہیں دیکھا تھا تو خیر کسی طرح رہا گیا مگر آنکھوں دیکھ کر کیا اسے آنکھ سے اوجھل کر سکتا ہوں؟ تنہا اتنی؟ مصیبت اٹھا کر، اتنی دور صرف میرے لیے تو آئی ہے۔ ایک مرتبہ اس بات پر غور تو کیجئے۔“

میں نے پوچھا..... ”کیا دونوں کو ایک ساتھ ہی گھر میں رکھو گے؟“

”جی نہیں، اس وقت تو پردم کے پوسٹ ماسٹر کے ہاں ہی رکھوں گا۔ ان کی بیوی کے ساتھ مزے سے رہے گی لیکن دو ایک دن میں ہی..... زیادہ نہیں۔ اس کے لیے مکان کا انتظام کروں گا اور پھر گھر کی لکشی کو گھر لے جاؤں گا۔“

ابھیا کا شوہر چلا گیا۔ میں نے روزانہ کام کاج میں دل لگانے کی غرض سے سامنے کی فائل کو کھینچ لیا۔

اسکے نیچے پڑی ہوئی ابھیا کی تحریر پر ایک دفعہ پھر میری نظر گئی۔ اس کے بعد کتنی ہی بار ان دو سطروں کو میں نے پڑھا اور نامعلوم اور کتنی بار پڑھتا لیکن اسی دوران میں ہی چیز اسی نے کہا..... ”بابو جی آپ کے مکان پر کون کون سے کاغذات پہنچانے ہوں گے؟“ چونکہ کر میں نے سر اٹھایا تو دیکھا کہ اس وقت مقابل کی گھڑی میں ساڑھے چار بج چکے تھے اور کلرک لوگ اپنا اپنا کام ختم کر کے گھر چلے گئے ہیں۔

شام کے وقت ابھیا میرے منہ سے تمام ماجرا سرنگون ہو کر سنتی رہی اس نے آنچل سے اپنی آنکھیں پونچھ والیں..... زبان سے کچھ نہ کہا..... میرے غصے کا بھی اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بہت دیر بعد میں نے ہی پوچھا..... ”آپ اسے معاف کر سکیں گی؟“

ابھیا نے صرف گردن ہلا کر اپنی منظوری دے دی۔

”اگر وہ تم کو اپنے ساتھ لے جانا چاہے تو تم چلی جاؤ گی؟“

اس نے اسی طرح سر ہلا کر جواب دیا۔ ”ہاں“

”برما کی عورتوں کا مزاج کیسا ہوتا ہے یہ تو تم پہلے ہی دن دیکھ لیا ہے پھر بھی کیا تم وہاں جانے کی جرأت کر سکتی ہو؟“

اس دفعہ ابھیا نے اپنا سر اوپر اٹھایا میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جمنی جاری ہے اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن کہہ نہ سکی اس کے بعد بار بار آنچل سے اپنی آنکھوں کو پونچھتی ہوئی بھرائے گلے سے بولی..... ”نہ جاؤں تو میرے لیے چارہ ہی کیا ہے؟ بتائیے؟“

اس کی بات سن کر میں یہ سوچ نہ سکا کہ خوش ہوں یا آنکھوں سے آنسو بہاؤں لیکن مجھ سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔

اس دن اور کوئی بات نہ ہوئی۔ قیام گاہ پر لوٹے ہی راستہ بھر یہی ایک بات میں بار بار اپنے آپ سے دریافت کرنے لگا لیکن اس سوال کا کسی طرف سے بھی کوئی جواب نہ مل سکا۔ دل کے اندر کا وہ نامعلوم کس طرف جس طرح فضول ہی غصے سے جل اٹھا اسی طرح دوسری طرف ایک بے بس عورت کے اس سے بھی زیادہ علاج مرض سے مضطرب اور پریشان ہوا تھا۔ دوسرے دن ابھیا کا پتہ دریافت کرنے کے لیے وہ انسان سامنے آ کھڑا ہوا تو نفرت کے مارے میں اس کی طرف دیکھ بھی نہ سکا۔ میرا دلی جذبہ سمجھ کر آج وہ زیادہ باتیں کہنے بغیر صرف پتہ دریافت کر کے عاجزی کے ساتھ چلا گیا لیکن اگلے دن جب وہ ملنے آیا تو اس کی آنکھوں اور چہرے کا رنگ ڈھنگ ہی اور تھا۔ پر نام کر کے اس نے ابھیا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس سطر میری میز پر رکھ دی اور کہا..... ”آپ نے میری جو بھلائی کی ہے اس زبان سے کیا عرض کروں۔ جب تک زندہ رہوں گا آپ کا غلام بن کر رہوں گا۔“

ابھیا کی تحریر پر نظر جمائے ہوئے ہی میں نے کہا..... ”جائیے آپ اپنا کام کیجئے۔ بڑے صاحب نے اس بار معاف کر دیا ہے۔“

اس نے ہنس کر کہا..... ”بڑے صاحب کی مجھے فکر نہیں آپ معاف کر دیں تو میں جی جاؤں۔ آپ کے قدموں میں میں نے بہت سی خطائیں کی ہیں۔“ اتنا کہہ کر اس نے پھر مکنا شروع کر دیا۔

طاق نسیاں پر رکھ دینا چاہیے؟ اور بالفرض محال اگر ایسا ہے تو اسے وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ سب جھگڑے یہاں ہی نہٹ جاتے تو اچھا ہوتا۔

اب تک میں روٹی سے ملنے نہیں گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بلاوجہ ہی جھوٹ موٹ تکلیف اٹھا رہا ہے اس لیے بھی شاید اس کی طرف جانے کی میری خواہش نہ ہوتی تھی۔ آج چھٹی ہونے سے پیشتر ہی گاڑی بلوانے کے لیے آدمی بھیج کر میں اٹھنے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسی وقت ابھیا کا خط ملا کھول کر دیکھا تو تمام خط شروع سے لے کر آخر تک روٹی کے متعلق ہی بھرا پڑا تھا۔ میں اس کا ہمیشہ خیال رکھوں۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے دوں۔۔۔۔۔ وہ کتنا کمزور کتنا بے بس اور لاچار ہے یہی ایک بات ہر سطر اور ہر لفظ میں ایسے دلی اضطراب کے ساتھ پھوٹی پڑتی تھی کہ بھولا بھالا انسان بھی اس التجا کے مقصد کو سمجھنے میں غلطی نہ کرتا۔ اپنے سکھ دکھ کا اس خط میں کوئی ذکر تک نہ تھا۔ آخر میں اس نے لکھا تھا کہ کئی خاص وجوہات سے وہ ابھی تک اسی جگہ ہے جہاں پہلے پہل آٹھری تھی۔

محض شوہر ہی کس جتنی عورت کا واحد پوتا ہو سکتا ہے یا نہیں اس کے متعلق اپنی رائے شائع کر کے اس کی نشر و اشاعت کرنے کے لیے میں تیار نہیں لیکن مکمل سنی پن کی ایک لاثانی مثال اور فلک پیا فضیلت جو میری ان دانجی نے ظلم و ستم کا شکار ہو کر اور ہمیشہ دکھ اور مصیبتیں قبول کر کے میرے دل کی گہرائیوں میں نقش کر رکھی تھی اور جس نے حقیر عورت کا مرتبہ بلند وارفیع بنادیا تھا۔ میرا وہ فردوسی تخیل ابھیا کے خط کا وار برداشت نہ کر سکا۔

جانتا ہوں کہ ہر عورت ان دانجی نہیں ہے۔ اس بعید از قیاس پر بے رحمی کو سینہ تان کر خندہ پیشانی سے دعوت دینے کے قابل بھی ہر عورت کا سینہ نہیں ہو سکتا اور جس شے کا وجود نہیں ہے اس کے لیے ہر روز افسوس اور حیرت کا اظہار کرنا کسی مصنف کا فرض ہے بھی یا نہیں اس کا میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا تاہم میرا دل کسی درد سے معمور ہوا تھا۔ غصے میں بھرا ہوا میں گاڑی پر جا پہنچا اور اس نکلے اور غیر عورت پر فریفتہ روٹی کو جو کڑی کڑی باتیں اچھی طرح سنانے کا تہیہ کر چکا تھا انہیں دل ہی دل میں دوہراتے ہوئے اس کے گھر کی طرف روزانہ ہوا۔ شام ہو رہی تھی یعنی دن کی روشنی ختم ہو کر شام کی تاریکی آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔

ابھی بھادوں پورے جو بن پر نہ تھا اور نہ اس وقت بادلوں میں جو بن تھا۔

لیکن سنان گہریار کی بھی اگر کوئی شکل و صورت ہو سکتی ہے تو اس دن اس تاریکی اور روشنی کے اتصال میں وہ مجھے نظر آئی اس کے علاوہ اور بھی کچھ ہوا کرتی ہے یہ تو میں آج بھی نہیں جانتا۔ گھر کے در و دیوار بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ صرف رسوئی گھر کی ایک کھڑکی سے کچھ دھواں نکل رہا تھا۔ دائیں

☆☆☆

اب مجھے ابھیا کے شوہر کا ایک خط ملا۔ بدستور سابق تمام خط جذبہ شکر گزاری سے بھر کر اس بات کا بالتفصیل مودبانہ ذکر کیا تھا کہ اس وقت وہ نہایت مصیبت میں ہے اور مجھ سے مشورہ طلب کیا تھا کہ میں کیا کروں؟ مختصر بات یہ تھی کہ اس نے اپنی طاقت سے زیادہ خرچ کر کے بھی ایک بڑا مکان کرایے پر لے لیا تھا اور اس میں ایک طرف اپنے بری بیوی بچوں کی رہائش کا انتظام کر کے دوسری طرف ابھیا کو لا کر رکھنے کی کوشش میں تھا لیکن ابھیا کسی طرح بھی رضامند نہ ہوتی تھی۔ بیوی کی اس نامعقول خد سے اس کو ایک روحانی صدمہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ یہ محض کلجک کا ہی نتیجہ ہے، ست جگ میں ایسا ممکن ہی نہ تھا۔ بڑے بڑے رشتی منی تک۔۔۔۔۔ بے شمار مثالیں دے کر اور ان کا بار بار ذکر کر کے اس نے لکھا تھا کہ ہائے کہاں ہیں وہ آریہ دیویاں؟ وہ بیتا سا دڑی کہاں گئیں؟ جو آریہ عورتیں شوہر کے نقوش پا کو دل میں نقش کر کے ہنسی مسکراتی چتا کے شعلوں میں جل جاتا کرتی تھیں۔ اور شوہر کے ہمراہ ابدی سورگ کی حقدار ہوتی تھیں۔ وہ اب کہاں ہیں؟ جو ہندو عورت مسرور اور شادماں چہرے اپنے جذباتی شوہر کو دیتا کو کندھے پر اٹھا کر ویشا کے گھر تک پہنچا آئی تھی کہاں ہے اس جیسی شوہر پرست عورت؟ کہاں ہے وہ شوہر پرستی۔ آہ، بھارت درس! کیا تیری گرماٹ کی ایک دم ہی انتہا ہو گئی۔ وہ گزرے ہوئے افسانے کیا ہم ایک بار پھر بھی اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکیں گے اور کیا ہم لوگ۔۔۔۔۔“ وغیرہ وغیرہ تقریباً دو صفحے اس نے ایسی گریہ وزاری سے بھر دیئے تھے لیکن ابھیا اپنے شوہر کو اتنا روحانی صدمہ پہنچا کر ہی خوش نہ ہوئی اور بھی سیٹھے۔ اس نے لکھا تھا کہ صرف اس پر اکتفا نہیں کہ اس کی بیوی غیر کے گھر میں رہتی ہے بلکہ آج اسے اپنے دلی دوست پوسٹ ماسٹر سے معلوم ہوا ہے کہ روٹی نام کے کسی انسان نے اس کی بیوی کو خط لکھا ہے اور کچھ روپے بھی بھیجے ہیں اور اس سے مجھ بد بخت کی عزت کو کتنا صدمہ پہنچا یہ لکھ کر بتانے کا مضمون نہیں۔

خط پڑھتے پڑھتے ہی اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکا۔ ساتھ ہی ساتھ روٹی کے برتاؤ پر بھی مجھے کم غصہ نہ آیا۔ اب اسے روپے بھیجے اور خط لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھیں؟ جس عورت نے ہنسی کے گھر کو حاصل کرنے کے لیے اپنی سخت اور اذیتیں برداشت کیں اس کے دل کو دیدہ دانستہ یا نادانستہ طور پر اچاٹ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اور ابھیا نے بھی اس قسم کا سلوک کیوں شروع کر دیا ہے آخر وہ کیا چاہتی ہے؟ اس کے شوہر نے جس عورت کو بیوی کی شکل میں قبول کیا ہے لڑکے بچے پیدا کئے ہیں ان سب کو ترک کر کے محض اسی کو لے کر گھر گریستی کس طرح چلائے؟ کیوں، بری عورتیں کیا عورتیں نہیں ہیں؟ انہیں کیا سکھ دکھ، عزت بے عزتی کا احساس نہیں ہے؟ ظلم اور انصاف کا قانون کیا ان کے لیے

آپ کا کیا خیال ہے شری کانت!“

میں اور کیا کہتا۔ آگ بجھ جانے پر صرف پانی کے زور سے تو انجن چلایا نہیں جاسکتا یہ تو تسلیم شدہ امر ہے۔

بالا میں ہم وہ اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانے پر رضامند نہ ہوا۔ تصویر کی تو کوئی حد بست قائم نہیں کی جاسکتی اس لیے اس بات کو چھیڑنا بے کار ہے۔

مگر کسی ناممکن امید سے اس کے دل میں سکون و قرار نہ تھا اور میں اس کی کچھ باتوں سے سمجھ گیا تھا تاہم وہ اس عذاب کدہ کو چھوڑنا نہیں چاہتا یہ میں سوچ نہ سکا۔ لیکن اس کے پر ماتما سے یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ جس بد نصیب کے گھر کا راستہ بند ہو گیا ہے اسے اس سنسان گھر کی دیرانی ثابت قدم نہ رکھ سکے تو اس کو مٹھی میں لینے سے روکنا دنیا میں کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔

اپنے مکان پر واپس لوٹتے کچھ رات ہو گئی۔ گھر میں گھس کر دیکھا کہ ایک کونے میں بستر بچھا کر کوئی سر سے پاؤں تک کپڑا اوڑھے سو رہا ہے خادمہ سے دریافت کرنے پر جواب ملا ”شریف آدمی ہے۔“

”اسی لیے میرے کمرہ میں!“

کھانا وغیرہ کھانے کے بعد ان حضرات سے بات چیت ہوئی۔ ان کا گھر چٹا گانگ ضلع میں ہے۔ تقریباً چار سال کے بعد ان کے لاپتہ چھوٹے بھائی کا پتہ ملا ہے اور اسے واپس گھر لے جانے کے لیے وہ آئے ہیں۔ وہ بولے..... ”صاحب کہانیوں میں سنا تھا کہ زمانہ قدیم میں کام روپ کی عورتیں غیر ملکی لوگوں کو بھیڑ بنا کر باندھ رکھتی تھیں۔ نامعلوم اس وقت وہ کیا کرتی ہوں گی لیکن اس زمانہ میں بھی برما کی عورتیں اس سلسلہ میں ان سے رتی بھر بھی کم نہیں ہیں۔ میرے جسم کا رویاں رویاں اس کا احساس کر رہا ہے۔“

اور بھی بہت سی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کی نجات کے لیے میری امداد طلب کی۔ میں نے وعدہ دے دیا کہ ان کے اس نیک ارادے کو کامیاب بنانے میں سرگرمی سے منہمک ہو جاؤں گا اور یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ کیوں؟ دوسرے دن صبح بسیار کوشش اور تلاش کے بعد ان کے چھوٹے بھائی کے بری سرال جا پہنچا۔ بڑے بھائی آڑ میں راستے کے کنارے چھل قدمی کرنے لگے۔

چھوٹے بھائی گھر پر نہ تھے۔ سائیکل لے کر صبح سیر کے لیے باہر گئے تھے۔ ان کی بیوی اپنی بہن اور ایک دو خادماؤں کے ساتھ وہاں رہتی تھی۔ ان لوگوں کا ذریعہ معاش برما چٹ بنانا تھا۔ اس

طرف کچھ آگے بڑھ کر جھانکنے سے معلوم ہوا کہ چولہا جل کر تفریباً بجھ رہا ہے اور قریب ہی زمین پر روشنی باہور دانتی سے ایک بیٹنگن کے دو ٹکڑے کر کے گم سم بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرے پاؤں کی آہٹ ان کے کانوں تک نہ پہنچی کیونکہ قوت مسح کا آقا اس وقت خواہ کسی اور جگہ ہو لیکن بیٹنگن پر منحور نہیں تھا۔ اس بات کو میں بلا خوف تردید کہہ کر سکتا ہوں لیکن جب میں چپ چاپ لوٹ کر ان دو کمروں کو درمیان آ کھڑا ہوا تو مجھے صاف صاف معلوم ہوا کہ ایک بے پایاں اضطراب سے پرگر یہ تمام گھر کو معمور کر کے اطراف و جوانب پر اپنا تسلط جمائے ہوئے ہے اور تمام سوسائٹی تمام نیکی بدی تمام گناہ و ثواب سے بھی بعید..... بہت بعید ترشے ہے وہ۔

باہر آ کر میں برآمدے میں ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر بعد شاید دیا جلانے کے لیے روشنی باہو باہر آئے اور خوفزدہ ہو کر انہوں نے پوچھا..... ”کون ہے؟“

میں نے آواز دے کر کہا..... ”میں ہوں شری کانت!“

”شری کانت باہو؟ اوہ.....“ کہہ کر وہ تیز حال سے نزدیک آئے، اندر جا کر انہوں نے چراغ جلایا اور پھر مجھے اندر لے جا کر بٹھایا۔ اس کے بعد کسی کے منہ سے بھی کوئی بات نہ نکلی..... دونوں ہی خاموش بیٹھے رہے۔ اس خاموشی کو پہلے پہل میں نے ہی توڑا کیا..... ”اب یہاں کس لیے رہتے ہو؟ چلو میرے ساتھ۔“

روشنی نے پوچھا ”کیوں؟“

میں نے کہا..... ”یہاں آپ کو تکلیف ہوتی ہے اس لیے؟“

روشنی کچھ توقف کے ساتھ بولا..... ”تکلیف اب مجھے کیا ہے؟“

بجائے لیکن ایسی حالت ہے تو کوئی تنقید وغیرہ نہیں ہو سکتی۔ میں کس طرح اسے ذلیل کروں گا وغیرہ وغیرہ یہی باتیں سوچتا ہوا گھر سے چلا تھا لیکن وہ سب خیالات یہاں بہہ گئے۔ پالیٹکس اتنا زیادہ نہیں پڑھا تھا کہ اس پیاری توہین کر سکوں۔ کہاں گیا میرا غصہ اور کہاں گیا میرا حسد اور تمام نیک جذبات کس کونے میں منہ چھپائے رہے کچھ بھی یاد نہ رہا۔

روشنی نے کہا کہ اس نے وہ پرائیویٹ ٹیوشن چھوڑ دی ہے کیونکہ اس سے صحبت بگڑتی تھی۔ اس کا دفتر بھی اس کے حسب حال نہیں ہے۔ بڑی محبت کرنی پڑتی ہے اس کے علاوہ اسے اب کوئی تکلیف نہیں ہے۔

میں خاموش ہو رہا کیونکہ اسی روشنی کے منہ سے اس کے بالکل برعکس بات سنی تھی۔ کچھ دیر چپ رہ کر پھر کہنے لگا..... ”آفس سے جھکے ماندے لوٹ کر یہ کھانا کھانا بالکل ایک عذاب معلوم ہوتا ہے۔“

اسی دن ان کی برمی بیوی سے میری کھل کر بات چیت ہوئی۔ وہ نہایت سادہ دل، خوش مزاج اور نیک خاتون تھی۔ اس نے یہ شادی محبت کی بنا پر اپنی مرضی سے کی تھی اور کمال یہ تھا کہ اپنی ازواجی زندگی میں اس نے انہیں ایک دن کے لئے بھی تکلیف نہیں دی۔ چار پانچ دن بعد بڑے بیہانے مسکراتے ہوئے کان میں کہا کہ پرسوں صبح جہاز سے ہم لوگ گھر جا رہے ہیں۔ سن کر مجھے ڈر سا لگا پوچھا۔ ”آپ کے بھائی پھر یہاں واپس آئیں گے؟“

بڑے بیہانے۔ ”اب رام رام کر کے کسی طرح ایک دفعہ جہاز پر تو سوار ہو جائیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”اس کی بیوی کو بتا دیا ہے؟“

بڑے بیہانے۔ ”باپ رے، پھر ہم کیا بچ سکیں گے۔ سالی جو جہاں ہوں گیں بھروسے کے چھتے کی طرح آ کر گھیر لیں گی۔“ یہ کہہ کر اور پھر دونوں آنکھیں مشکا کر ہنستے ہوئے بولے۔ ”فرج لوصاحب!“۔ ”آپ سمجھتے ہیں یا نہیں؟“

مجھے کافی صدمہ پہنچا ہوا۔ ”اگر ایسا ہوا تو اس عورت کو بہت زیادہ تکلیف ہوگی۔“

میری بات سن کر بڑے بیہانے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئے بمشکل تمام ہنسنا بند کر کے بولے۔ ”واہ، آپ نے بھی خوب کہا۔ ان بری عورتوں کو تکلیف؟ ان سالیوں کی قوم کے لوگ تو کھا کر کلا تک نہیں کرتے نہ ان کے ہاں جو شے میٹھے کا کچھ خیال ہے اور نہ ذات پات کا۔ سالی سب پیسی (ایک قسم کی سڑی ہوئی مچھلیاں) کھاتی ہیں صاحب پیسی جس کی بدبو سے بھوتیاں تک بھاگ جائیں۔ ان سالیوں کو تکلیف۔ ایک چلا جائے گا تو دوسرے کو پکڑ لیں گی۔ سچ قوم کی ہیں سالی۔“

”ٹھہریئے صاحب ٹھہریئے، آپ کے بھائی کو اس نے ان چار سالوں تک راجاؤں کی طرح کھلایا پایا ہے اور کچھ نہ سہی اس کے لیے تو ان کا کچھ احسان مند ہونا چاہئے۔“

بڑے بھائی کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ ”آپ نے تو مجھے لا جواب کر دیا۔ مرد بچے ہیں۔ غیر ملک میں آ کر عمر کے تقاضا سے اگر کچھ شوق کر ہی ڈالا تو کیا ہوا؟ اور پھر کون ہے جو ایسا نہیں کرتا۔ سبھی کرتے پھرتے ہیں۔ مجھ سے تو کچھ بھی چھپا نہیں بد قسمتی سے اس کا راز ظاہر ہو گیا ہے بس اسی لیے کیا اس کو ہمیشہ کے لیے پھرتے رہنا ہوگا۔ شریف بن کر گھر گریستی چلا کر از سر نو پانچ بچوں میں شامل ہوتا ہے صاحب! یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے کئی عمر میں باہر جا کر مرغی تک کھا لیتے ہیں مگر عمر کی پختگی کے ساتھ سب کچھ جاتا رہتا ہے۔ ایسا کریں تو پھر کام ہی کس طرح چلے؟ اب آپ ہی غور فرمائیے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سچ ہے یا جھوٹ؟“

درحقیقت اس قسم کا خیال کرنے والی قوت تمیز بھگوان نے مجھے عطا نہیں کی۔ اس لیے میں

وقت سب اسی کام میں مصروف تھے مجھے بنگالی دیکھ کر اور غالباً اپنے شوہر کا دوست سمجھ کر انہوں نے میرا گرجوٹی کے ساتھ مقدم کیا۔ برما کی عورتیں نہایت سختی اور جفاکش ہوتی ہیں لیکن مرد نہایت نکلے اور کابل ہوتے ہیں۔ وہاں گھر کے چھوٹے موٹے کام کاج سے لے کر کاروبار تک کا سب انتظام عموماً عورتوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے لکھنا پڑھنا سیکھنے بغیر ان کا کام نہیں چلتا لیکن مردوں کی بات علیحدہ ہے۔ پڑھنا لکھنا سیکھ گئے تو بہتر و نہ شرمندگی کے مارے مرنا نہیں ہوتا نکلا اور کابل مرد بیوی کی کمائی کھا کر باہر اسی کے مال پر بابو بنا پھرتا ہے اور اس سے لوگوں کوئی تو تعجب نہیں ہوتا اور عورتیں بھی چھی چھی، ڈر ڈر، من من پن پن کر کے اس کا ناک میں دم کر دیتا مناسب نہیں سمجھتیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزون ہے کہ ان کی سوسائٹی میں یہ بات قدرتی اور اخلاق کا جزو بن چکی ہے۔

دس پندرہ منٹ میں ہی بابو صاحب لوٹ آئے جسم پر مکمل انگریزی لباس، ہاتھ میں دو تین انگشتریاں، گھڑی چین وغیرہ کام کاج کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا پھر بھی دیکھا کہ حالت خوب اچھی ہے۔ ان کی برمی بیوی اپنے ہاتھ کا کام چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے ہاتھ سے ٹوپی اور چھڑی لے کر رکھ دی۔ چھوٹی بہن نے جرٹ دیا سلائی وغیرہ لاد دیئے۔ ایک خادمہ نے چائے کا سامان اور دوسری نے پان کا ڈبہ لا حاضر کیا۔ واہ کیا خوب؟ اس انسان کو تو سب نے مل کر بالکل راجاجی کی طرح رکھ چھوڑا ہے۔ نام میں بھول گیا ہوں۔ شاید چار ڈوڑا ڈالیا ہی کچھ ہوگا۔ جانے دو اتنی پریشانی کس لیے؟ نہ ہوگا تو ہم لوگ صرف بابو کہہ کر پکار لیں گے۔

بابو نے سوال کیا آپ کون ہیں؟ میں نے کہا ”میں آپ کے بھائی کا دوست ہوں۔ انہوں نے اس بات کا یقین نہ کیا۔ بولے ”آپ تو کلکتہ ہیں، میرے بھائی تو کبھی وہاں گئے بھی نہیں۔ پھر دوستی کس طرح ہوئی؟“

کس طرح دوستی ہوئی، کہاں ہوئی؟ کب ہوئی، اس وقت وہ کہاں ہیں وغیرہ مختصر آبیان کر کے ان کے آنے کا مقصد بھی میں نے بتا دیا اور یہ بھی عرض کر دیا کہ وہ اپنے بھائی کے دیدار کے لیے بے قرار ہیں۔

دوسرے دن صبح ہی ہمارے ہوٹل میں بابو جی نے قدم رنجہ فرمایا اور دونوں بھائیوں کی طویل گفتگو کے بعد وہ رخصت ہوئے۔ پھر تو دونوں بھائیوں میں ایسا میل جول ہو گیا کہ صبح شام غرض یہ کہ جب بھی موقع ملتا بابو صاحب بھیا بھیا پکار کر آ حاضر ہونے لگے اور پھس پھس سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کھانے پینے کی تو کوئی حد ہی نہ رہی۔ ایک دن شام کو وہ اپنے بھیا کو اوپر مجھے بھی چائے بسکٹ کی دعوت دے گئے۔

کر چلتا بنا۔ وہ ایک رومال سے اپنی دونوں آنکھوں کو ڈھانپنے ہوئے تھے اور دوسرا ہاتھ اپنی بری بیوی کے گلے میں جامل کر روتے ہوئے لہجہ میں کچھ کہہ رہا تھا۔ بیوی آنچل میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ گرد پیش بہت سے بنگالی جمع تھے۔ ان میں سے کچھ تو منہ پھیر کر ہنس رہے تھے اور کچھ منہ میں کپڑاٹھوس کر ہنسی کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں کچھ فاصلہ پر تھا۔ اس لئے پہلے تو کچھ سمجھ نہ سکا لیکن قریب آتے ہی سب باتیں صاف صاف معلوم ہونے لگیں۔ وہ گریہ آلود لہجہ میں بری اور دیہاتی بنگالی ملا کر کہہ رہا تھا۔ ”جس کو بنگالی میں کچھ ترمیم کے ساتھ کہا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا۔ ”ایک مہینے بعد رنگ پور سے تبا کو خرید کر کس طرح آ جاؤں گا یہ میں جانتا ہوں۔ میری ولا رام تجھے کیلا دکھا کر چلا رہے۔ کیلا دکھا کر چلا۔“ اور یہ سب باتیں صرف ہمارے جیسے کچھ اجنبی بنگالی تماشاخیوں جو ہنسنے کی غرض سے ہی کہہ رہا تھا لیکن اس کی بیوی بے چاری بنگالی نہیں سمجھتی تھی۔ وہ تو رو رہی تھی چھاتی چھاڑ رہی تھی اور بمشکل ہاتھ اٹھا کر اور اس کی آنکھیں پونچھ کر تشفی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ آدمی زور زور سے بسور بسور کر رہا تھا کہنے لگا۔ ”بڑی مشکل ہے پانچ سو روپیہ تبا کو خریدنے کے لیے دیئے ہیں۔ اب کچھ بھی تیرے پاس نہیں رہا۔ میرا پیٹ تو بھرا نہیں۔ اسی طرح اگر تیرا مکان بھی فروخت کر کے بھلے گھر کے لڑکے کی طرح گھر جاسکتا تو بھی سمجھتا کہ ہاں ایک داؤدارا۔ ہائے یہ سب کچھ نہیں ہوا رہے، کچھ بھی نہیں ہوا۔“

آس پاس کے لوگ ہنسی کو روک رکھنے کی وجہ سے پھول پھول اٹھنے لگے لیکن جس کے متعلق یہ سب مذاق ہو رہا تھا اس کی آنکھیں اور کان دکھ کے آنسوؤں سے جل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس غم میں کہیں وہ مرنے نہ جائے۔

ملاحوں نے پکار کر اوپر سے کہا۔ ”بابو سیرھی اٹھائی جا رہی ہے۔“

بابو گلا چھوڑ کر سیرھی تک گیا اور پھر لوٹ آیا۔ بیوی کے ہاتھ میں پرانے زمانہ کی قیمتی نگینہ والی آنگوشی تھی۔ اسی پر ہاتھ رکھ کر روتا ہوا بولا۔ ”اری دے دوری، یہ انگوشی ہی لے جاؤں اس کی قیمت کم از کم دوڑھائی سو روپے تو ضرور ہوگی۔ ان کو ہی کیوں چھوڑوں؟“

بیوی نے اسے جھٹ پٹ اتار کر اپنے محبوب کی انگلی میں پہنا دیا جو ملا دی اچھا، کہہ کر روتا ہوا بابو سیرھی پر چڑھ گیا۔ جہاز جیٹی چھوڑ کر رفتہ رفتہ دور سر کتا گیا۔ اور وہ عورت منہ پر آنچل ڈال کر اور گھٹنے ٹیک کر وہیں بیٹھ گئی۔ بہت سے لوگ دانت نکال ہنستے ہنستے چلے گئے۔ کسی نے کہا۔ ”واہ رے لڑکے، کسی نے کہا ”واہ رے بہادر چھوکرے، بہت سے لوگ یہ کہتے ہوئے چلے گئے۔“ کیا تماشا کیا۔ ہنستے ہنستے پیٹ درد کرنے لگا، غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ صرف ایک میں ہی ایسا چشم دید گواہ تھا، جو اس کے

خاموش رہا اور دفتر کا وقت ہو رہا تھا لہذا انہما کھا کر چل دیا۔

لیکن دفتر سے لوٹتے ہی وہ پھر یکا یک بول اٹھے۔ ”میں نے غور کر کے دیکھ لیا ہے آپ کی رائے ہی درست ہے صاحب! اس ذات کا کوئی بھروسہ نہیں نامعلوم جاتے وقت آخر کار کیا فساد کھڑا کر دے۔ کہہ کر جانا ہی ٹھیک ہے۔ یہ سالی جو نہ گزریں تھوڑا ہے۔ نہ لالچ ہے، نہ شرم اور نہ کچھ دھرم کرم کا خیال۔ ان کو اگر جانور بھی کہا جائے تو کچھ بے جا نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں یہی ٹھیک ہے۔“

لیکن نامعلوم کیوں مجھے اس کی بات پر یقین نہ آیا۔ دل ہی دل میں ایسا محسوس ہوا کہ اس میں درپردہ کوئی سازش ہے۔ دراصل سازش تھی لیکن وہ اتنا ذلیل اور اتنا کم ظرف ہو گا بغیر دیکھے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

چنا گانگ کے لیے جہاز اتوار کو جانا تھا۔ صبح کے وقت اور کرتا بھی کیا؟ ان لوگوں کو سی آف (وداع) کرنے کے لیے جہاز کے ساحل پر جا پہنچا۔ اس وقت جہاز جیٹی سے لگا ہوا تھا۔ جانے والے اور نہ جانے والے دونوں قسم کے لوگوں کی دوڑ دھوپ اور شور و غل میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ادھر ادھر دیکھتے ہی اس بری خاتون پر نظر پڑ گئی۔ اپنی چھوٹی بہن کو ساتھ لئے وہ ایک کنارے کھڑی تھی۔ تمام رات بھر روتے رہنے کی وجہ سے اس کی دونوں آنکھیں گلنار ہو رہی تھیں۔ چھوٹے بابو بہت زیادہ مصروف تھے۔ وہ اپنی دو پیہوں کی گاڑی (سائیکل) ٹریک، بستر اور بھی نامعلوم کیا کیا لیے قلیوں کے ہمراہ دوڑ دھوپ کر رہے تھے ایک لمحہ بھر کی بھی فرصت نہ تھی۔

رفتہ رفتہ تمام سامان جہاز پر لا دیا گیا۔ مسافر بھی دھکم پیل کر کے سوار ہو گئے جنہیں کہیں جانا نہ تھا وہ نیچے اترا آئے۔ سامنے کی طرف لنگر اٹھنے لگا۔ اسی وقت چھوٹے بابو اپنے سامان کو حفاظت سے رکھ کر اور جگہ ٹھیک کر کے اپنی بری بیوی کے پاس وداع لینے کے دھوکہ سے دنیا کی بے حیائی کا تماشا دکھانے کے لیے جہاز پر سے نیچے اترا۔ وہ سیکنڈ کلاس کے مسافر تھے اس لیے انہیں یہ حق حاصل تھا۔

☆☆☆

میں نے کئی مرتبہ سوچا ہے کہ اس کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ انسان اپنے خمیر کو زبردستی کیوں ذلیل کرتا ہے۔ باقاعدہ منتر پڑھ کر شادی نہ ہوئی تو کیا ہوا مگر وہ بیوی تو ہے وہ بیٹی، بیوی اور ماں کی نسل سے تو ہے۔ اسی کے بھروسہ پر تو وہ اتنے طویل عرصہ تک شوہر کے تمام حقوق کا فائدہ حاصل کرتا رہا ہے۔ اس بے چاری کا کیا قصور ہے جس نے اپنے دل کی تمام تر لکشی، اپنی محبت کا تمام تر آب حیات اور اپنا تن من اس پر نثار کر دیا تھا۔ پھر کس ترغیب سے وہ ان بے شمار لوگوں کی آنکھوں میں طعن و تشنیع کا شکار بنا

در غم سے متاثر ہو کر چپ چاپ کھڑا رہا۔

چھوٹی بہن آنکھیں صاف کرتی ہوئی اپنی بہن کا ہاتھ کھینچ رہی تھی۔ میرے قریب جاتے ہی وہ آہستہ سے بولی..... ”بابو جی آئے ہیں بہن، اٹھو۔“

سر اٹھا کر اس نے میری طرف دیکھا اور اسی وقت اس کے گریہ کا بندھ ٹوٹ کر پھٹ پڑا۔ میرے پاس تشفی دینے کے لیے اور کیا تھا؟ تاہم اس دن میں اس کا ہاتھ نہ چھوڑ سکا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کی گاڑی میں جا بیٹھا۔ راستہ بھر وہ رورو کر یہی بات کہتی رہی..... ”بابو جی میرا گھر سونا ہو گیا۔ میں اس گھر میں پاؤں کس طرح رکھوں گی۔ ایک مہینے کے لیے تمباکو خریدنے گئے ہیں..... یہ ایک مہینہ میں کس طرح کاٹوں گی۔ پردیس میں نامعلوم انہیں کتنی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ میں نے انہیں وہاں کیوں جانے دیا۔ رنگون میں بازار کے تمباکو سے ہمارا کام تو مزے سے چل رہا تھا۔ محض زیادہ منافع کی امید سے خواہ مخواہ انہیں اتنی دور بھیجا غم کے مارے میری چھاتی پھٹی جا رہی ہے نہ بابو جی اگلی میل سے میں ان کے پاس چلی جاؤں گی۔“ اسی طرح وہ نامعلوم کیا کیا کہتی رہی۔

میں ایک بات کا بھی جواب نہ دے سکا اپنا منہ کھڑکی سے باہر نکال کر اپنی آنکھوں کے آنسوؤں کو چھپاتا رہا۔

وہ کہنے لگی..... ”بابو جی تمہاری قوم کے افراد جتنا پریم پیار کر سکتے ہیں۔ اتنا ہماری قوم کے لوگ نہیں کر سکتے۔ تم لوگوں میں رحم اور ہمدردی کا جو جذبہ ہے وہ دوسرے کسی ملک کے لوگوں میں نہیں ہے۔“

کچھ دیر رک کر اور تین بار آنکھیں پونچھ کر وہ کہنے لگی..... ”بابو کی محبت میں گرفتار ہو کر جب میں ان کے ساتھ رہنے لگی تو کتنے ہی لوگوں نے ڈر دکھا کر مجھے روکا تھا لیکن میں نے کسی کی بھی بات نہ سنی۔ اس وقت نامعلوم کتنی عورتیں میری خوش قسمتی پر رشک کھاتی ہیں۔“

چوک کے نزدیک پہنچ کر میری خواہش ہوئی کہ گاڑی سے اتر کر اپنے ڈیرے پر چلا جاؤں مگر وہ بے تانہ، دونوں ہاتھوں سے گاڑی کا دروازہ کھول کر بولی..... ”نہ بابو جی، یہ نہ ہوگا۔ تم ہمارے ساتھ چلو اور چائے کا پیالہ پی کر واپس آ جاؤ چلیے۔“

میں انکار نہ کر سکا۔ گاڑی چلنے لگی۔ اس نے یکا یک پوچھا..... ”اچھا بابو جی، رنگ پور کتنی دور ہے؟ آپ کبھی وہاں گئے ہیں؟ کسی جگہ ہے؟ پیار ہونے پر وہاں ڈاکٹر تو مل سکتے ہیں نا؟“

باہر کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے جواب دیا..... ”ہاں ملتے کیوں نہیں۔“

ایک آہ بھر کے وہ بولی۔ ”بھیا“ (پرماتما) انہیں اچھا رکھیں۔ ان کے بھائی بھی ساتھ

ہیں۔ وہ نہایت نیک دل ہیں۔ چھوٹے بھائی کو تو وہ جان سے بھی زیادہ عزیز رکھیں گے تم لوگ تو گویا جسم محبت ہو مجھے کوئی تشویش نہیں کیوں ہے نا بابو جی!“

میں باہر کی طرف دیکھتا ہوا صرف یہی سوچنے لگا کہ اس گناہ عظیم میں میرا کتنا حصہ ہے؟ خواہ میری کاہلی کی وجہ سے ہو یا آنکھوں کی شرم مجبور کرتی ہو اور خواہ میری عقل ماری گئی تھی کہ میں نے اپنا منہ بند رکھ کر اتنا بڑا ظلم ہوتے دیکھا اور ایک لفظ نہ کہا..... اس کی پاداش سے کیا میری نجات ہو سکے گی؟ اگر ایسا ہی ہے تو سراونچا کر کے میں سیدھا کیوں نہیں بیٹھ سکتا؟ اس کی آنکھوں کی طرف تاکنے کی جرأت کیوں نہیں کر سکتا؟

☆☆☆

چائے بسکٹ کھا کر اور ان کی ازدواجی زندگی کے لاکھوں واقعات سن کر جب میں مکان سے باہر ہوا تو دن کچھ زیادہ نہیں تھا۔ گھر لوٹ جانے کی خواہش نہ ہوئی۔ دن کے آخری حصہ میں سب لوگ اپنا اپنا کام ختم کر کے ڈیرے میں لوٹ آئے تھے اور دادا اٹھا کر کے ہوٹل میں اس وقت ہنسی مذاق اور دل لگی کا دور جاری تھا لیکن یہ سب شور و غل مجھے زہر کی طرح معلوم ہونے لگا..... اکیلا راستے راستے گھومتا ہوا یہ سوچنے لگا کہ اس معمر کامل کس طرح ہوتا؟ بری لوگوں میں شادی کے متعلق کوئی مقررہ اصول نہیں ہے۔ شادی کا باقاعدہ طریقہ بھی رائج ہے اور شوہر بیوی کی طرح جو مرد اور عورت تین دن تک باہم اکٹھے رہ کر ایک برتن میں کھانا کھا لیتے ہیں ان کی بھی شادی ہو گئی سمجھی جاتی ہے۔ نہ تو سوسائٹی ہی اسے منظور کرتی ہے اور نہ وہ عورت ہی اس کی وجہ سے ہلکی نظروں سے دیکھی جاتی ہے لیکن بابو، کے لیے ہندو قانون میں یہ بھی کچھ بھی نہیں تھا۔ اس عورت کو وہ اپنے وطن میں لے جا کر نہیں رکھ سکتا۔ ہندو سماج اس کی مخالفت کرے گا اور بچ سے بچ انسان بھی انہیں حقارت کی نظر سے دیکھے گا عمر بھر تک یہ کس طرح برداشت کیا جا سکتا ہے۔ تو پھر علاج ہی کیا؟ یہ تو زندگی بھر جلا وطن رہے یا بڑے بھیانے چھوٹے بھائی کا جو انتظام کیا ہے، ہی درست ہے اور ان سب حالات کی موجودگی میں بھی دھرم نام کے کسی لفظ کا کوئی مطلب ہو سکتا ہے۔ تو اتنا بڑا ظلم کس طرح بجا کہا جا سکتا ہے۔ مجھ میں اتنی عقل نہیں کہ اس کے متعلق کوئی رائے قائم کروں البتہ حسب موقعہ پھر کبھی سوچ کر دیکھوں گا۔ لیکن اس ندامت کے مارے میں جل کر خاک ہونے لگا کہ یہ دھوکہ باز اور فریبی انسان آج اس بے کس عورت کی محبت پر آزار کا بوجھ لا داور پکڑ دے کر بھاگ گیا۔ راستے کے کنارے کنارے جو چلنا شروع کیا تو چلتا ہی گیا۔ بہت پیشتر ایک دن ابھیا کا خط پڑھنے کے لیے جس چائے کی دکان میں گیا تھا اسی دکان کے مالک نے پہچان کر آواز دی..... ”بابو صاحب آئیے۔“

بولی۔ ”اور بھی بہت نشانات ہیں جنہیں آپ کو دکھانہیں سکتی۔“

جن مناظر کو دیکھ کر انسان جائز اور ناجائز کی تمیز کھو بیٹھتا ہے یہ بھی ان میں سے ایک تھا ابھیا نے میرے سخت اور خاموش چہرے کی طرف دیکھ کر دم بھر میں ہی سب کچھ سمجھ لیا اور قدرے ہنس کر کہا ”لیکن میرے واپس لوٹ آنے کا صرف یہی ایک باعث نہیں ہے شری کانت بابو۔ یہ تو میرے سنی دھرم کا ایک چھوٹا سا انعام ہے وہ میرے شوہر ہیں اور میں ان کی بیابہتا بیوی۔۔۔۔۔۔ یہ اسی کا عوضانہ ہے۔“

لحہ بھر خاموش رہ کر اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”میں بیوی تھی۔ ان کی رضامندی کے بغیر ہی اتنا دور جا کر ان کے سکون میں غل ہوئی۔ عورتوں کی اتنی بری حماقت مرد برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ اسی جرم کی سزا ہے۔ کئی طرح سے فریب دے کر وہ مجھے اپنے گھر لے گئے مجھ سے کیفیت طلب کی کیوں میں روٹی کے ساتھ یہاں تک آئی؟ میں نے جواب دیا کہ پتی کا گھر کیسا ہوتا ہے یہ تو میں نے آج تک جانا نہیں۔ میرے باپ نہیں ہیں ماں بھی مر گئی۔ گھر پر کوئی ایسا نہیں تھا جو مجھے کھانے کو دیتا۔ متوازن کئی خطوط لکھے لیکن تم سے کوئی جواب نہ ملا۔“ انہوں نے ایک بیت اٹھا کر کہا۔ ”آج اس کا جواب دیتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر ابھیا نے اپنے اس زخم خوردہ دائیں ہاتھ کو ایک مرتبہ سہلایا۔

اس نہایت ہی ظالم اور جاہل انسان کے خلاف میرے دل میں از سر نو ہلچل مچ گئی لیکن جس اندھا دھند عقیدہ کے زیر اثر ابھیا مجھے دیکھتے ہی بھاگ کر چھپ گئی تھی۔ وہی جذبہ مجھ میں بھی تو موجود تھا۔ میں بھی تو اس کی حدود سے باہر نہ تھا اس لیے میں یہ بھی نہ کہہ سکا کہ تم نے اچھا کیا، اور میری زبان یہ کہنے کے لیے بھی تیار نہ ہوئی کہ تم نے برا کیا، کسی دوسرے کو کسی اہم مصیبت میں مبتلا دیکھ کر جب اپنی ذاتی عقل و تمیز اور قدیم عقائد کے درمیان آزاد نہ رہے اور مستعار علم میں جنگ چھڑتی ہے تو دوسروں کو نصیحت کرنے سے بڑھ کر برا بھاری

آزاد شاید ہی کوئی ہوتا ہو۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”تمہارا وہاں سے یوں چلا آنا غلطی ہے یہ تو میں کہہ نہیں سکتا لیکن۔۔۔۔۔۔“

ابھیا بولی۔ ”اسی لیکن، کے متعلق ہی تو میں آپ کا فیصلہ چاہتی ہوں شری کانت بابو! وہ اپنی بری بیوی کیساتھ کچھ چین سے رہیں مجھے کوئی شکایت نہیں مگر میں آپ سے یہ بات پوچھنا چاہتی ہوں کہ شوہر جب محض ڈنڈے کے زور سے بیوی کے تمام حقوق زبردستی چھین لیتا ہے اور اسے اندھیری رات میں در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے تنہا گھر سے باہر نکال دیتا ہے تو اس کے بعد شادی کے دید منستروں کے زور سے اس پر بیوی کے فرائض کی ذمہ داری قائم رہتی ہے یا نہیں؟“

لیکن میں تو چپ سادہ رہا۔ اس نے میرے چہرے پر نظریں جم کر کہا۔ ”یہ تو بالکل

دفعۂ خواب سے چوٹے ہوئے کسی انسان کی طرح دیکھا، یہ وہی دکان ہے اور وہ روٹی بھیا کا گھر ہے بغیر کچھ کہے اس کی دعوت کو قبول کر کے میں اندر چلا گیا اور ایک پیالہ چائے پی کر باہر نکلا۔ روٹی کے دروازے پر دھکادے کر دیکھا کہ اندر سے بند ہے۔ باہر کی زنجیر کو پکڑ کر دو چار مرتبہ ہلاتے ہی دروازے کھل گیا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ سامنے ابھیا کھڑی ہے۔

”ارے تم؟“

ابھیا کی آنکھیں اور چہرہ سرخ ہوا تھا۔ کوئی جواب دیے بغیر ہی چشم زدن میں وہ اپنے کمرے میں چلی گئی، اور دروازہ اندر سے بند کر لیا لیکن شرم کی جو شکل شام کی اس دھندلی روشنی میں اس کے چہرے پر ہو رہی تھی تو پھر دریافت کرنے کے لیے کچھ باقی نہ رہا۔ بدحواس ہو کر کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد چپ چاپ لوٹ کر جا رہا تھا کہ معامیرے دونوں کانوں میں رونے کی دو مختلف آوازیں ایک ساتھ گونج اٹھیں۔ ایک اس گناہگار کی اور دوسری اس بری حسینہ کی۔ میں نے جانا ہی چاہا تھا لیکن پھر لوٹ کر صحن میں کھڑا ہو گیا۔ دل ہی دل میں کہا۔ ”نہیں مجھے اس طرح جانا نہیں چاہئے۔ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں کہنا چاہئے۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ اچھا نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ یہ سب کئی دفعہ سننے کا عادی ہو چکا ہوں۔ کئی دفعہ دوسروں نے سنایا بھی ہے لیکن بس اب اور نہیں۔ کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ کیوں اچھا ہے اور کہاں کس طرح برا ہے۔ یہ سب اگر ممکن ہو تو اس کی زبانی سنوں گا اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو محض کتاب کے الفاظ نظر پر جما کر فیصلہ کرنے کا حق نہ مجھے ہے نہ آپ کو اور نہ ہی شاید پر ماتما کو بھی۔“

☆☆☆

یہ ایک ابھیا دروازہ کھول کر سامنے آ کھڑی ہوئی بولی۔ ”صدیوں کے اندھے اعتقادات کے دھکے سے پہلے پہل اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی اس لیے بھاگ کھڑی ہوئی تھی شری کانت بابو! میری اس حرکت کو میری شرمندگی پر محمول نہ کرنا۔“

اس کی دیدہ دلیری کو دیکھ کر میں دم بخور رہ گیا وہ بولی۔ ”آپ کو اپنی قیام گاہ پر لوٹنے میں کچھ تاخیر ہو جائے گی کیونکہ روٹی بابو آتے ہی ہوں گے۔ آج ہم دونوں ہی آپ کے ملزم ہیں۔ آپ کے خیال میں اگر ہم لوگ قصور وار ثابت ہوں تو جو سزا آپ تجویز کریں گے ہم اس کو منظور کر لیں گے۔“ روٹی کو، بابو، کہہ کر خطاب کرتے ہوئے میں بے پہلی ہی مرتبہ سنا۔ میں نے پوچھا۔ ”آپ واپس کب آئیں؟“

ابھیا بولی۔ ”پرسوں! وہاں کیا ہوا یہ جاننے کے لیے آپ یقیناً تیار ہو رہے ہوں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا دایاں ہاتھ نچکا کر کے دکھایا۔ بیت کی خربوں کے نشان چمڑے پر چا بجا ابھر رہے تھے

عام فہم بات ہے کہ جہاں حق نہ رہا وہاں فرض کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے بھی تو میرے ساتھ ان ہی دید منستروں کو دہرایا تھا لیکن اس کا اثر ایک فضول بکواس سے زیادہ نہ رہا کیونکہ ان کے مزاج اور ان کی ذاتی خواہشات پر کوئی پابندی عائد نہ ہوئی۔ منستروں کی وہ بے معنی آواز منہ سے نکلتے ہی باطل میں مل گئی۔ لیکن کیا تم قیود، تمام پابندیاں اور تمام تر ذمہ داریاں میں عورت ہوں اسی لئے مجھ پر ہی رہ گئیں۔ شری کانت بابو، آپ تو لیکن کا لفظ کہہ کر رک گئے یعنی میرا وہاں سے چلا آنا غلطی نہیں ہوئی مگر اس لیکن..... کا مطلب محض یہی ہے کہ جس کے شوہر نے اتنا برا ظلم کیا ہے اس کی بیوی کے لئے قابلِ نسوانی کی یہی معراج ہے کہ وہ اس کا کفارہ کرتی ہوئی زندگی بھر زندہ تو رہے لیکن مردوں سے بدتر؟ ایک دن مجھ سے شادی کے جو منتر بلوائے گئے تھے..... ان کا بلوایا جانا ہی کیا میری زندگی کی واحد حقیقت ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ سب نقش خیال۔ اتنا برا بھاری ظلم، اتنی بڑی نا انصافی اور اتنا وحشیانہ سلوک..... اور میرے حق میں کچھ..... کچھ بھی نہیں ہے۔ سماج، دنیا، سکھ اور چین کسی پر بھی میرا کوئی حق نہیں رہا۔ اگر کوئی بے رحم، دھوکہ باز اور فریبی بد چلن شوہر بلا وجہ اور بلا قصور اپنی بیوی کو نکال دے تو کیا اسی لیے اس کی تمام نسوانی زندگی کا فضول، لنگڑی اور نا کارہ بن جانا ضروری ہے؟ کیا اسی لیے بھگوان نے عورت کی تخلیق کی تھی۔ سب قوموں میں سب مذاہب میں اس قسم کی نا انصافی کی تلافی ہے۔ بد قسمتی سے میں ایک ہندو کے گھر میں پیدا ہوئی ہوں کیا اسی لیے میرے لئے تمام راہیں مسدود ہو گئی ہیں شری کانت بابو!“

میں نے کہا..... ”میرے جواب سے کیا بنتا بگڑتا ہے۔ آنے سے چیختر آپ نے میری رائے کا انتظار تو نہیں کیا تھا؟“

ابھیابی..... ”لیکن اس کے لیے تو وقت نہ تھا۔“

میں نے جواب دیا..... ”ممکن ہوگا، آپ مجھے دیکھ کر بھاگ گئیں تو میں بھی چلا جا رہا تھا لیکن پھر لوٹ آیا، کیوں؟ کیا آپ جانتی ہیں۔“

”نہیں۔“

”لوٹ کر آنے کی وجہ یہ تھی کہ آج میرا دل بے تاب ہو رہا تھا۔ آپ سے بھی زیادہ بے رحمانہ ظلم میں نے ایک عورت پر ہوتے ہوئے آج صبح دیکھا ہے۔“

یہ کہہ کر ساحل سمندر کی اس بری عورت کی تمام داستان میں نے تفصیل سے سنا دی اور پوچھا..... ”کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ وہ عورت اب کیا کرے؟“

ابھیالرز، اٹھی اور بعد ازاں گردن ہلا کر بولی..... ”نہیں، میں بتا نہیں سکتی۔“

میں نے کہا..... ”آج آپ کو اور بھی دو عورتوں کی داستان سنانا ہوں۔ ایک تو میری ان دا

جیجی اور دوسری پیاری بابائی کی..... آلام و مصائب کے لحاظ سے ان میں سے کسی کی جگہ بھی آپ سے نیچی نہیں۔“

ابھیاناموش رہی۔ شروع سے آخر تک ان دا جیجی کی تمام سرگزشت سنا کر میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ ابھیاناموش کے بت کی طرح بیٹھی ہے اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ کچھ دیر اسی عالم میں بیٹھی رہ کر اس نے زمیں سے سر لگا کر نمسکار کیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر آنجل سے آنکھوں کو صاف کرتی ہوئے بولی..... ”اس کے بعد؟“

میں نے کہا اس کے بعد کا حال معلوم نہیں۔ اب پیاری بابائی کا واقعہ سنو جب اس کا نام راج لکشی تھا اسی وقت سے وہ کسی کو چاہتی تھی وہ چاہتا کس قسم کا تھا۔ یہ آپ جانتی ہیں؟ روڈنی بابو آپ کو جس طرح چاہتے ہیں بالکل اسی طرح معاف کرنا اپنی آنکھوں دیکھا ہے اس لیے یہ تشبیہ دے رہا ہوں۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ کے بعد دونوں کی ملاقات ہوئی اس وقت وہ پہلی راج لکشی تھی پیاری بابائی، بن چکی تھی لیکن یہ بات اسی دن ثابت ہو گئی کہ راج لکشی مری نہیں بلکہ پیاری کے قالب میں ہی زندہ جاوید ہو گئی ہے۔

ابھیابے چین ہو کر بولی..... ”اس کے بعد؟“

بعد کے واقعات یکے بعد دیگرے وضاحت کے ساتھ سنا کر کہا..... ”اس کے بعد ایک دن ایسا آیا جب پیاری نے اپنے عزیز از جان محبوب کو چپ چاپ دور ہٹا دیا۔

ابھیانے پوچھا..... ”آپ جانتے ہیں اس کے بعد کیا ہوا؟“

”جانتا ہوں لیکن بتانہ سکوں گا۔“

ابھیانے ایک آہ بھر کر کہا..... ”آپ کیا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اکیلی ہی نہیں ہوں..... بلکہ ازل سے ہی عورتوں کو اس بد نصیبی کا شکار ہونا پڑا ہے اور اس کو برداشت کرتے رہنے میں ہی ان کی زندگی کی کامیابی ہے۔“

میں نے کہا..... ”میں یہ کچھ بھی کہنا نہیں چاہتا آپ کو صرف اتنا ہی بتا دینا چاہتا ہوں کہ عورتیں مرد نہیں ہیں۔ دونوں کے افعال کو ایک ہی ترازو سے تو لا نہیں جاسکتا اور اگر تو لا بھی جائے تو کوئی خاص فائدہ نہیں۔“

”کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کیوں نہیں؟“

”نہیں یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ اس کے علاوہ میرا دل آج اس قدر پریشان ہو رہا ہے کہ ان سب الجھنوں پر کسی قسم کی رائے زنی کرنا ممکن ہی نہیں۔ آپ کے سوال پر کسی اور دن غور کروں گا۔ تاہم آج

مزاج اور ان کے دل کی رفتار صرف ایک ہی جانب چل کر انہیں کامیاب نہیں بنا سکتی۔ لہذا سوسائٹی میں ان کا مناسب انتظام ہونا ضروری ہے۔ میری زندگی پر ہی آپ ایک مرتبہ شروع سے آخر تک نظر ڈالئے۔ میرے ساتھ جن کی شادی ہوئی تھی ان کی قربت میں آئے بغیر بھی کوئی چارہ نہ تھا اور آنے پر بھی کوئی چارہ نہ ہوا۔ اس وقت ان کی بیوی، بال بچے ان کی محبت کوئی بھی شے میری اپنی نہیں ہے۔ ایسی حالت میں بھی انہیں کے پاس ان کی ایک داشتہ ویشا کی طرح پڑے رہنے سے کیا میری زندگی پل پھولوں سے بھر کر کامیاب ہو سکتی ہے شری کانت بابو! اور اس ناکامی کا داغ لے کر تمام زندگی بھر بھٹکتے پھرنا ہی کیا میری حیات نسوانی کی سب سے بڑی ریاضت ہے۔ روکٹی بابو کو تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ ان کی محبت تو آپ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ ایسے انسان کی زندگی کو لکڑا بنا کر میں جی کا خطاب خریدنا نہیں چاہتی شری کانت بابو!

ہاتھ اٹھا کر ابھیانے آنکھوں کے کونے پونچھ ڈالے اور پھر بھرائے گلے سے کہا۔ ”اور نہ ایک رات کی بیاہ کی رسم کو جو شوہر اور بیوی دونوں کے نزدیک ہی خواب کی طرح باطل ہو چکی ہے، زبردستی تمام عمر بھر حقیقت سمجھ کر کھڑے رکھنے کے لیے اتنی بڑی محبت کا گلا گھونٹنے کے لیے تیار ہوں۔ جس بھگوان نے محبت کی یہ نعمت عطا کی ہے کیا وہ اس سے خوش ہوں گے؟ میرے متعلق آپ جو بھی مناسب سمجھیں رائے قائم کر لیں لیکن اگر زندہ رہی شری کانت بابو! تو میں دعویٰ سے کہہ سکتی ہوں کہ ہماری معصوم محبت کی اولاد دنیا میں انسانیت کے لحاظ سے کسی طرح بھی کم نہ ہوگی اور میرے بطن سے پیدا ہونے والا اپنے آپ کو بد قسمت نہ سمجھے گا۔ اس کو دینے کے لیے شاید اس کے ماں باپ کے پاس کچھ نہ ہوگا لیکن اس کی ماں اس کو یہ اطمینان ضرور دلا جائے گی کہ اس کی تخلیق سچائی پر مبنی ہے اور سچائی سے بڑھ کر کوئی سہارا اس کے لیے نہیں ہے اور اس سے گرنے کے لیے مشکل ہوگا ورنہ وہ بالکل ہی حقیر ہو جاتے گی۔“

ابھیانے خاموش ہو گئی لیکن لامحدود فضا میری آنکھوں کے سامنے کاچنے لگی۔ دم بھر کے لیے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس عورت کی باتیں مجھ کو ہر دم و دلوں کو گھیرے گھڑی ہیں۔ ہاں ایسا ہی معلوم ہوا سچائی جب کسی انسان کے دل سے نکل کر جگہ جگہ نظر آتی ہے تو معلوم ہوتا کہ اس میں زندگی ہے گویا اس کا گوشت اور پوست کا جسم بھی ہے اور اس جسم کے اندر جان بھی۔ پھر نہیں، کہہ کر نا منظور کرنا آسان نہیں وہ چوٹ کر کہے گی۔ ”خاموش رہو فضول بحث کر کے دنیا کی مکاریوں میں اور اضافہ نہ کرو۔“

دفعۃً ابھیانے ایک سیدھا سوال کیا۔ بولی۔ ”آپ خود بھی کیا ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھیں گے شری کانت بابو! اور اب کیا ہمارے گھر نہ آئیں گے؟“

صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ میں نے اپنی حیات میں نسوانی اخلاقی کا جو معیار دیکھا ہے ان سب نے آلام و مصائب سے گزر کر ہی میرے دل میں بلند مرتبہ حاصل کیا ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میری ان ذاتی اپنی مصیبت کا تمام بار خاموشی سے برداشت کرنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکتیں۔ بالفرض محال یہ بار ناقابل برداشت بھی ہوتا تو کسی حالت میں بھی وہ اپنی راہ سے منحرف ہو کر آپ کی راہ پر قدم نہ بڑھائیں۔ ان کے متعلق اس قسم کر تصور سے شاید میرا سینہ پھٹ جائے گا۔“

کچھ دیر خاموش رہ کر کہا۔ ”اور وہ راج لکشمی، اس کے ایشار کی تکلیف کتنی عظیم ہے میں پچھتم خود دیکھ آیا ہوں۔ اس کی روحانی کوفت سے میرا تمام دل معمور ہے۔“

ابھیانے چونک کر کہا۔ ”تو کیا آپ ہی ان کے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنی مرضی سے مجھے اتنی دور پڑا رہنے نہ دیتی بلکہ اس خیال سے کہ کہیں میں کھونہ جاؤں جی جان سے کھینچ کر اپنے قریب ہی رکھنا چاہتی۔“

ابھیابولی۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ راج لکشمی جانتی ہے کہ اسے آپ کے کھوئے جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”صرف خطرہ ہی نہیں، راج لکشمی اچھی طرح جانتی ہے کہ میں کھویا جاتا ہوں نہیں سکتا۔ میرا کھویا جانا ناممکنات سے ہے۔ حاصل ہونے اور کھوئے جانے کی حد سے بالاتر جو ایک تعلق ہے مجھے پورا پورا یقین ہے کہ اسے وہی تعلق حاصل ہو چکا ہے اور اسی لیے اس وقت اسے میری بھی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھو خود میں نے بھی اس زندگی میں کچھ کم دکھ نہیں اٹھائے اور بلا آخر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جس شے کو دکھ کہا جاتا ہے وہ نا تو ظاہری ہے اور نہ محرومی۔ جو دکھ بلا خوف ہوتا ہے انسان اس کو سکھ کی طرح سے ہی محسوس کرتا ہے۔“

ابھیانے کافی دیر تک مستقل خاموش رہ کر آہستہ سے بولی۔ میں آپ کی بات بخوبی سمجھتی ہوں۔ شری کانت بابو! ان ذاتی اپنی مصیبتوں نے ہی اپنی حیات میں دکھ کو حقیقی شکل میں حاصل کیا ہے۔ لیکن میری تو حالت ہی مختلف ہے شوہر سے مجھے ملا ہے صرف بے عزتی کا داغ۔ محض بے عزتی اور بدنامی کا ٹیکہ لے کر ہی میں واپس لوٹ آئی ہوں۔ اسی سرمایہ حیات کو لے کر ہی کیا آپ زندہ رہنے کے لیے مجھے مجبور کر رہے ہیں؟“

سوال نہایت ہی مشکل تھا۔ مجھے لا جواب دیکھ کر ابھیانے پھر بولی۔ ”ان کے ساتھ میری زندگی کی کہیں بھی مطابقت نہیں شری کانت بابو! دنیا میں تمام عورت مرد ایک سانچے میں ڈھلے نہیں ہوتے۔ ان کے عہدہ برآ ہونے کا راستہ بھی زندگی میں صرف ایک نہیں ہوتا۔ ان کی ترتیب، ان کا

جواب دینے کے لیے مجھے کچھ پس و پیش کرنا پڑا۔ بعد ازاں بولا..... بھگوان کے نزدیک تو شاید آپ بے گناہ ہوں وہ آپ کی بھلائی ہی کریں گے لیکن انسان تو انسان کا دل نہیں دیکھ سکتا اس کے لیے تو ہر ایک کے دل کا احساس کر کے اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ اگر وہ ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ اصول قائم کرنے لگے تو سوسائٹی کا تمام نظام درہم برہم ہو جائے گا۔“

ابھیازپ کر بولی..... ”جس مذہب میں، جس سوسائٹی میں ہم لوگوں کو اٹھانے کی فراخ دلی موجود ہے کیا آپ ہمیں اس سوسائٹی میں پناہ لینے کے لیے مجبور کر رہے ہیں؟“

میں یہ سوچ ہی نہ سکا کہ اس کا کیا جواب دوں؟

ابھیابولی..... ”اپنے آدمی ہو کر بھی ایک آدمی کو آپ مصیبت کے موقعہ پر پناہ نہیں دے سکتے..... کیا اس پناہ کے لیے ہمیں غیروں کے سامنے دست سوال دراز کرنا ہوگا؟ کیا اس سے آپ کی شان میں کوئی اضافہ ہوگا؟“

جواب میں ایک طویل آہ کے علاوہ میرے منہ سے اور کچھ نہ نکلا۔

ابھی خود بھی کچھ دیر خاموش رہ کر بولی..... ”جانے دیجئے، آپ لوگوں نے جگہ ندی نہ ہی مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ دنیا میں آج بھی ایک بڑی قوم ہے جو کھلے بندوں آزادی سے جگہ دے سکتی ہے۔“

اس کی بات سے گھائل ہو کر بولا..... ”کیا ہر حالت میں پناہ دینا ہی اچھا کام ہے۔ کیا اس بات کا بطور اصول تسلیم کر لینا ضروری ہے؟“

ابھیابولی ”اس کا ثبوت تو ہاتھوں ہاتھ مل رہا ہے شری کانت بابو! روئے زمیں پر کوئی بھی ظلم زیادہ دنوں تک پھل پھول نہیں سکتا۔ اس بات میں اگر ذرا اسی بھی سچائی موجود ہے تو یہ کہنا پڑے گا کہ اسی لئے وہ اس ظلم و ستم کو پناہ دے کر آئے دن ترقی کر رہے ہیں اور ہم لوگ صرف انصاف اور دھرم کے دعویدار بن کر دن بدن نیچے گر گئے ہیں کمزور ہو رہے ہیں۔ ہم لوگ تو یہاں تھوڑے ہی دنوں سے مقیم ہیں لیکن دیکھتی ہوں کہ یہ علاقہ مسلمانوں سے بھر اڑا ہے سستی ہوں کہ ایک بھی گاؤں ایسا نہیں جہاں کم از کم ایک گھر مسلمانوں کا ہو اور وہاں ایک آدھ مسجد تعمیر نہ ہو گئی ہو۔ ہم لوگ شاید اپنے جیتے جی نہ دیکھ سکیں لیکن وہ دن ضرور جلد آئے گا جب بنگال کی طرح ہر ماں مسلمانوں کی اکثریت ہو جائے گی۔ آج صبح ہی جہاز کے ساحل پر ایک ظلم دیکھ کر آپ کا دل خراب ہو گیا ہے آپ ہی فرمائیے ایسی حالت میں کس مسلمان بڑے بھائی کو دھرم اور سماج کے خوف سے ایسی سازش، ایسی کمینگی کا سہارا لے کر سکھ اور چین کی ایسی گریستی کو خاک میں ملا کر بھاگ جانے کی ضرورت لاحق ہوئی؟ بلکہ اس کے بالکل برعکس وہ سب کو

اپنے مذہب میں کھینچ کر اسے دغا دیتا اور بڑے بھائی کے قابل عزت و توقیر حاصل کر کے گھر لوٹ جانا..... ان دونوں میں سے کون سا مذہب سچا ہے شری کانت بابو!۔“

میں نے عقیدت بھرے جذبہ سے دریافت کیا..... ”اچھا آپ تو گاؤں کی لڑکی ہیں آپ نے یہ سب باتیں کس طرح جانیں؟ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اتنی زیادہ فراخ دلی مردوں میں موجود نہیں۔ آپ جس کی ماں ہوں گی وہ کبھی بد قسمت نہیں ہو سکتا۔ یہ میرے تصور سے بھی بالاتر ہے۔“

ابھیاداس چہرہ پر تبسم کا ایک ہلکا سا خطا کر بولی..... ”تو پھر شری کانت بابو، مجھے سوسائٹی سے باہر نکال دینے سے ہی کیا ہندو قوم زیادہ افضل اور پاکیزہ ہو جائے گی۔ کیا ہندو سوسائٹی کو میرے اخراج سے کسی طرح کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔“

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اور پھر قدرے ہنس کر کہا..... ”لیکن میں کسی طرح سماج سے باہر نہ جاؤں گی۔ تمام بدنامی، تمام کلنگ، تمام بد قسمتی اپنے سر پر لے کر ہمیشہ آپ لوگوں کو ہی ہو کر رہوں گی۔ اپنی ایک اولاد کو بھی اگر کسی دن انسان کی طرح انسان بنا کر پیش کر سکی تو میری یہ تمام مسیتیں برحق ہو جائیں گی اس ایک امید کے سہارے زندہ رہوں گی۔ مجھے تجربہ کر کے یہ دیکھا ہوگا کہ سچ کچھ کا انسان ہی حقیقت میں بڑا ہے یا اس کے جنم کا حساب ہی دنیا میں بڑا ہے۔“

منوہر چکرورتی نام کے ایک قابل انسان سے میری راہ دور سم ہو گئی تھی۔ دادا اٹھا کر کے ہوٹل میں ایک ہری سنکیرتن دل تھا۔ پن کمانے کی غرض سے وہ گاہے گاہے وہاں آتے تھے لیکن کہاں رہتے تھے کیا کرتے تھے؟ یہ کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ صرف اتنا ہی سنا تھا کہ ان کے پاس بہت سارے پیسے ہیں اور ہر پہلو سے مکمل حسابی کتاب انسان ہیں۔

نا معلوم کیوں؟ مجھ سے بے حد خوش ہو کر وہ ایک دن تنہائی میں کہنے لگے..... ”دیکھو شری کانت بابو! تمہاری عمر چھوٹی ہے۔ زندگی میں اگر ترقی حاصل کرنا چاہتے ہو تو میں تمہیں ایک ایسا گریبا سکتا ہوں جس کی قیمت لاکھ روپیہ ہے میں نے خود جن سے یہ گر سیکھا تھا انہوں نے دنیا میں خود ترقی کی تھی۔ سنو گے تو شاید انگشت بدندان رہ جاؤں گے لیکن بات سچ ہے۔ وہ صرف پچاس روپیہ ماہوار پاتے تھے لیکن مرتے وقت گھر بار، باغ باغیچہ، تالاب، زمین، جائیداد وغیرہ کے علاوہ دو ہزار روپے نقد چھوڑ گئے کہتے یہ کیا کوئی آسان بات ہے؟ اپنے ماں باپ کی دعا سے میں خود بھی تو.....“

گمراہ اپنی بات کو پیسوں دبا کر بولے..... ”سنتا ہوں، تنخواہ تو خوب بھاری بھر کم پاتے ہو، قسمت بھی یاد رہے۔ ہر ماں میں سینکڑوں آنے والوں کی تقدیر اس طرح کھلتے نہیں سنی..... پھر اتنی فضول خرچی کیوں کرتے ہو؟ درپردہ تحقیقات کرنے سے سینہ پھٹ جاتا ہے۔ دیکھتے ہی ہو کہ میں لوگوں کی کسی

بات میں نہیں پڑتا لیکن میری طرح زیادہ نہیں صرف دو سال تک چل کر دیکھ لو میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اپنے گھر لوٹ کر اگر تمہاری خواہش ہوگی تو شادی کر سکو گے؟“

اس خوش یقینی کے لیے اندر ہی اندر میں فریفتہ ہوا تھا ہوں اس راز کو نا معلوم انہوں نے کس طرح آشکار کر لیا لیکن یہ تو وہ خود ہی ظاہر کر چکے تھے کہ وہ کسی بھی معاملہ کی پوری پوری ماہیت جانے بغیر اس میں دخل دینے کے عادی نہیں۔ کچھ بھی ہو۔ ترقی کا جو اسم اعظم ان کے پاس تھا اسے حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہو گیا۔ وہ بولے۔ ”دیکھوں دان پن کرنے کی بات رہنے دو۔ چوٹی کا پسینہ ایز ہی تک بہا کر روزی کمائی پڑتی ہے کمر تک مٹی کھودنے پر پیسہ نصیب ہوتا ہے اپنے خون کو جلا کر پیدا کی ہوئی کوڑی غیر کو خیرات کرنے والا آج کی دنیا میں اور بھی کوئی پاگل ہے؟ اپنے بیوی بچوں اور خاندان والوں کے لیے پس انداز کیا جائے اور دوسروں کو کچھ بھی نہ دیا جائے۔ یہ میں نہیں کہتا لیکن اول خوشیاں بعد درویشیاں کی مثل سنی ہوگی جس کے اپنے گھر میں پیسے کی تنگی ہو اس کو کبھی شہ نہ دینا۔ زیادہ نہیں صرف دو چار دن کی آمد و رفت کے بعد ہی وہ اپنے دکھ کی رام کہانی سنا کر دو چار روپوں کا مطالبہ کر بیٹھے گا۔ یکے نقصان مایہ و دیگر شانت ہمایہ۔ جو روپے دیئے ہو تو الگ اور غیروں کے گھر کا جھگڑا اپنے گھر پہنچ لائے وہ علیحدہ روپوں کا لالچ تو کوئی چھوڑ نہیں سکتا۔ تقاضہ کرنا ہی پڑتا ہے اور پھر دوڑ دھوپ جھگڑا بکھیرا بھلا ہمیں اس کی ضرورت ہی کیا پڑی ہے؟“

میں نے گردن ہلا کر کہا۔ ”جی ہاں آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔“

وہ کچھ جرات پا کر بولے۔ ”تم اچھے گھر کے لڑکے ہو، اس لیے بات کو فوراً ہی سمجھ گئے مگر ان پنج قوم کے لوہا پیٹنے والے سالوں کو ذرا سمجھاؤ تو جانوں حرامزادے سات جنم میں بھی نہیں سمجھیں گے۔ سالوں کے پاس اپنا ایک پیسہ نہیں پھر بھی اوروں کے گھر سے قرض لا کر دوسروں کو دے آئیں گے یہ چھوٹے لوگ ایسے ہی احمق ہوتے ہیں۔“

ہمیں کیا؟ اور اگر حقیقتاً تکلیف ہے تو دو تو لے سونا لا کر رکھ جاؤں۔ دیتا ہوں دس روپے ابھی ادھار۔ کیوں بھیا ہے نا ٹھیک؟“

میں نے کہا۔ ”جی ہاں، ٹھیک تو ہے۔“

وہ بولے۔ ”ایک دفعہ نہیں سو دفعہ ٹھیک ہے اور دیکھو جھگڑے بکھیرنے کی جگہ مت جانا۔ کسی کا خون ہو جائے تو بھی نہیں۔ ہمیں اس سے کیا غرض؟ اگر کسی کو بچاؤ گے تو دو چار چوٹیں اپنے جسم پر بھی آپڑیں گی۔ اس کے علاوہ کسی ایک فریق کا گواہ بننا پڑے گا۔ پھر مفت میں عدالتوں کی خاک چھانو۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ جب لڑائی جھگڑا ختم ہو جائے اور تمہاری خواہش ہو تو وہاں تک گھوم پھر آؤ اور ممکن ہو تو

دو چار بھلی بری باتیں مشورہ کے طور پر دے آؤ۔ پانچ آدمیوں میں تمہارا نام ہو جائے گا۔ ہے نہ ٹھیک بات؟“

کچھ دیر چپ رہ کر پھر انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ”اور پھر ان لوگوں کی بیماری کے موقعہ پر ان کے گھر تو درکنار، ان کے محلے میں بھی قدم نہ رکھو۔ فوراً کہہ بیٹھتے ہیں کہ بھائی میں مر رہا ہوں اس مصیبت میں دو روپے دے کر امدا دیجئے، لیکن بھائی صاحب انسان کی زندگی موت کا تو کوئی بھروسہ نہیں اس لیے ان کو روپیہ دینا پانی میں بہا دینے کے مترادف ہے بلکہ پانی میں پھینک دینا کہیں زیادہ اچھا ہے اور کچھ نہ ہو تو یہی کہہ بیٹھتے ہیں ذرا رات جگا کرنے آ بیٹھا بہت خوب، کون جائے ان کی بیماری رات جاگئے لیکن کہیں اس دور پر دلش میں مجھے ہی کچھ ہو جائے۔ نہ کریں شتمنا ماتا! کان پکڑتا ہوں!“ یہ کہہ کر انہوں نے زبان کو دانتوں تلے دبایا اور اپنے کان اپنے ہی ہاتھوں اینٹھ کر نمسکار کر کے کہا۔ ”ہم لوگ سب ہی تو ان کے قدموں پر پڑے ہیں۔ لیکن بتاؤ بھلا ایسی مصیبت میں میری خبر کون لے گا؟“

اس مرتبہ میں ان کے ہاں میں ہاں نہ ملا سکا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ دل ہی دل میں شاید کچھ تشویش میں پڑ کر بولے۔ ”صاحب لوگوں کو دیکھئے۔ وہ ایسی جگہ کبھی نہیں جائے کبھی نہیں۔ صرف ایک کارڈ لکھ دیتے ہیں بس ہوگی بیماری پری۔ اسی لیے تو انہوں نے اپنی ترقی کی ہے۔ اس کے بعد تندرست ہونے پر ویسے ہی میل ملاقات۔ بالکل اسی طرح۔ اسی لئے بھیا کسی کے جھگڑے جھنجھٹ میں کبھی نہ آنا چاہیے۔“

دفتر کا وقت ہوتے دیکھ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس قابل انسان کے نیک مشورہ سے میری کوئی روحانی ترقی ہو سکتی تھی۔ اس بات کو باور نہیں کرتا بلکہ اس کی باتوں سے میرے دل میں کوئی خاص الجھل بھی پیدا نہ ہو سکی۔ کیونکہ اس قسم کے تجربہ کار انسان دیہات میں بکثرت ملتے ہیں لیکن خواہ وہ رسوائے زمانہ بھی ہوں مگر مشورے دینے میں وہ کبھی جمل سے کام نہیں لیتے۔ ان کے اس مشورے پر اگر میں عمل کر لیتا تو کتنی بڑی غلطی ہوتی اس کا ثبوت بھی مجھے دو ہفتے گزرنے سے پہلے ان ہی کے ذریعہ مل گیا۔

تب میں ابھی کے گھر کی طرف نہیں گیا تھا یہ بھی درست ہے کہ میں ان کی حالت کے ساتھ ان کی باتوں کا مقابلہ کر کے شروع سے آخر تک اس واقعہ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ سکتا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے خیالات کی آزادی اور ان کے افعال کی بے خوفی اور ان کی باہمی غیر معمولی اور حسین محبت سب مل کر میری توجہ ہمیشہ کشش کرتے تھے تاہم زندگی بھر کے عقائد کی طرح بھی اس طرف قدم بڑھنے نہ دیتے تھے۔ دل میں بار بار یہی آتا تھا کہ میری ان دانجی ایسا فعل کبھی نہ کرتیں۔ وہ کہیں بھی نوکری کر کے بدنامی تکلیف اور دکھ کے درمیان سے گزر کر اپنی باقی زندگی گزار دیتی لیکن روئے زمین کے تمام عیش

و آرام کے عوض بھی جن کے ساتھ ان کی باقاعدہ شادی نہیں ہوئی ازدواجی زندگی بسر کرنے پر رضامند نہ ہوتی۔ میں جانتا ہوں انہوں نے بھگوان کے چرنوں میں اپنے آپ کو نہایت یکسوئی سے نثار کر دیا تھا۔ اپنی اس ریاضت سے انہوں نے پاکیزگی کا جو تصور اور فرض کا جو احساس حاصل کیا تھا وہ ابھیا کی عقل رسا کے نزدیک کیا محض بچوں کا ایک کھیل تھا؟

دفعتہً ابھیا کی ایک بات یاد آگئی اس وقت بات کی یہ تک پہنچنے کا مجھے موقع ہی نہ ملا تھا اس نے کہا تھا..... ”شری کانت بابو! مصیبتوں کو برداشت کرنے میں بھی ایک تہاہ کن لاچ ہے۔ انسان نے اپنی صدیوں کے سرفروزی میں یہ دیکھا ہے کہ کوئی بھی خاص مقصد بغیر دکھ اٹھائے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بے شمار جنموں کا تجربہ اس وہم کو ہی حقیقت تسلیم کر چکا ہے کہ زندگی کے میزان میں ایک طرف دیکھ کا جتنا زیادہ بوجھ لاداجا جاتا دوسری طرف اتنا ہی زیادہ سکھ کا بوجھ اوپر اٹھاتا ہے اسی لیے تو انسان دنیا میں جب اپنی عام اور قدرتی خواہشات پر قابو پا کر اور یہ سمجھ کر بھوکا گھومتا پھرتا ہے کہ ”میں تپیا کرتا ہوں۔“ تو اس بات کے متعلق کہ اس کے کھانے کے لیے کسی دوسری جگہ چار گنا خوراک جمع ہو رہی ہے نہ تو اس کے دل میں ہی کچھ شک پیدا ہوتا ہے نہ کسی دوسری کے ہی اس لیے جب کوئی سنیا سی کڑکتی ہوئی سردی میں گلے تک پانی میں ڈوب کر اور سخت گرمی کی خطرناک دھوپ میں دھونی رمائے زمیں پر سر اور اوپر کی طرف پاؤں کیے رہتا ہے تو اس کی مشکل پسندی کی تختی کو دیکھ کر تمنا شاویں کا جہوم صرف اس تکلیف کو ہی محسوس نہیں کرتا بلکہ اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ مستقبل میں اس کو حاصل ہونے والے بھاری آرام اور ناممکن سہولیات کا حساب لگا کر ان کا حریص دل حسد سے بھر اٹھتا ہے اور پھر کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ الٹا رہنے والا یہ انسان ہی مبارک ہے۔ قالب انسانی کے شایاں شان صرف یہی کام ہے ہم لوگ تو کچھ بھی نہیں کر رہے..... اپنی زندگی رائیگاں گنوار ہے ہیں وغیرہ وغیرہ اس طرح وہ اپنے آپ پر ہزار نفر تیں کرتے ہوئے اداس دل سے گھر لوٹ جاتے ہیں شری کانت بابو! لکھ کے حصول کے لیے دکھ کو اختیار کرنا ہی چاہئے۔ یہ بجا ہے لیکن اس لیے یہ بذات خود حقیقت نہیں ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو بہت سادہ دکھ اٹھالینے پر سکھ از خود آ کر کندھوں پر سوار ہو جائے گا۔ اس دنیا میں بھی اس کی کوئی حقیقت نہیں اور عقی میں بھی نہیں۔“

میں نے کہنا شروع کیا..... ”لیکن بیوہ کا ضبط نفس.....“

ابھیا مجھے درمیان میں ہی روک کر بولی..... بیوہ کا چال چلن کہیئے..... اس کے ساتھ برہم (حق) کا کوئی تعلق نہیں۔ بیوہ کا چال چلن ہی برہم (برحق) کے حصول کا ذریعہ ہے میں اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ درحقیقت وہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ دوشیزہ، شادی شدہ یا بیوہ ہر ایک اپنے اپنے راستہ

سے برہم (حق) کو حاصل کر سکتی ہے۔ بیوہ کا چال چلن ہی اس کے لیے ریزرو نہیں رکھا گیا ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا..... ”بہت خوب ایسا ہی سہی..... اس کا چال چلن ہی سہی ضبط نفس نہ سہی نام سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

ابھیا نے بگڑ کر کہا..... ”نام ہی تو سب کچھ ہے شری کانت بابو! نام کو چھوڑ کر دنیا میں اور ہے ہی کیا؟ غلط ناموں کی وجہ سے انسان کی عقل کی رسائی اور قوت تیز کا بہاؤ نہایت غلط راستوں میں ہے ہو کر گزر سکتا ہے کیا آپ اس بات کو نہیں جانتے؟ نام کی اس غلط فہمی کے باعث تو ہر زمان و مکان بیوہ کے چال چلن کو سب سے افضل قرار دیتے آ رہے ہیں۔ فضول ایثار کی بیکار فضیلت ہے شری کانت بابو، بالکل ہی فضول بالکل ہی غلط۔ انسان کی دونوں دنیا میں برباد کر دینے کے لیے اس سے بڑھ کر اور جادو گری کوئی نہیں ہے۔“

اس وقت اور زیادہ بحث نہ کر سکا اور خاموش ہو گیا۔ درحقیقت اس کو بحث میں ہر ادینا ایک طرح سے ناممکن ہی تھا۔ پہلے پہل جب جہاز پر اس سے تعارف ہوا تو ڈاکٹر صاحب اس کو بظاہر دیکھ کر ہی ازراہ مذاق کہہ اٹھے تھے ”عورت تو خوب“ ”فارورڈ“ ہے لیکن اس وقت دونوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اسے فارورڈ، لفظ کا مطلب کہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ خاتون اپنے دل کی گہرائیوں تک کو کس طرح ایک لاثانی نور سے باہر کھینچ کر دنیا کے سامنے پیش کر سکتی ہے..... لوگوں کی مخالفت کی پرواہ ہی نہیں کرتی۔ اس وقت اس کے متعلق ہمارا یہ خیال تھا کہ ابھیا صرف اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے ہی مباحثہ نہیں کرتی بلکہ اپنے مقصد کو بھی پوری پوری طاقت سے فتح یاب کرنے کے لیے باقاعدہ جنگ کرتی ہے۔ اس کے قول و فعل میں مکمل یکسانیت تھی اس لیے کئی مرتبہ اس کے سامنے لا جواب ہو جایا کرتا تھا لیکن اپنے ڈیرے پر واپس آ کر خیال آتا کہ ارے یہ تو اس کا معقول جواب ہے خیر کوئی مضائقہ نہیں اس کے متعلق آج بھی میرا اضطراب کم نہیں ہوا۔ متعدد بار میں اپنے دل سے سوال کر چکا ہوں کہ ابھیا کے لیے اس کے علاوہ اور راستہ ہی کیا تھا ہر بار میرے دل میں اس کے متعلق مخالفت کا ایک جذبہ بھڑک اٹھتا۔ اپنے آپ کو سمجھانے کی لاکھ کوشش کرتا کہ اس پر ناراض اور غصہ ہونے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے لیکن کوئی نامعلوم طاقت میری سب کوششوں پر پانی پھیر دیتی۔

مجھے خیال آتا ہے کہ دل کی اس گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل حالت میں ہی میرے دن کٹ رہے تھے۔ اس لیے نہ تو میں اس کے پاس ہی جا سکتا تھا اور نہ اسے اپنے دل سے دور ہی کر سکتا تھا۔ ایسے ہی دنوں میں دفعۃً پبلگ نے شہر میں داخل ہو کر اپنا گھونگھٹ کھول دیا اور اپنا کالا منہ باہر نکالا۔ ہائے رام! اس کو سمندر پار ہی روکے رکھنے کے لیے ہزاروں جنت منتر اور ذمہ دار حکام کی کی ہر

اس دن سنبھرتا تھا۔ ایک معمولی کام کے لیے صبح ہی باہر چلا گیا تھا۔ شہر کے بچوں کا ایک گلی کے اندر سے بڑے راستہ پر جانے کے لیے جلدی جلدی قدم بڑھائے جا رہا تھا کہ دیکھا ایک نہایت ہی بوسیدہ مکان کے دو منزلے کے برآمدے میں منوہر چکر دیتی کھرے ہو کر بار بار ہے ہیں۔

میں نے ہاتھ ہلا کر کہا..... ”وقت نہیں ہے۔“

وہ منت سماجت کرنے لگے..... ”دو منٹ کے لیے ایک دفعہ اوپر تشریف لائیے شری کانت باپو! بڑی آفت میں ہوں۔“

آخر خواہش نہ ہوتے ہوئے بھی اوپر جانا پڑا..... میں یہی تو کئی مرتبہ سوچا کرتا ہوں کہ کیا انسان کی ہر حرکت پہلے سے ہی فیصلہ شدہ ہوتی ہے؟ ورنہ میرا کوئی ایسا کام نہ تھا اور نہ اس گلی کے اندر اس سے پہلے کبھی گزر رہی ہوا تھا تو آج صبح اس طرف کیوں چلا آیا؟

نزدیک جا کر کہا..... ”بہت دن سے تو آپ اس طرف آئے نہیں..... آپ کیا اسی مکان میں رہتے ہیں؟“

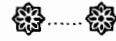
بولے..... ”نہیں صاحب! انہیں بارہ تیرہ دن ہوئے ایک مہینہ بھر سے ڈسٹری (دست لگنے کی بیماری) بھگت رہا ہوں اور پھر اس پر یہ ظلم کہ ہمارے محلہ میں پلگ ہو گئی۔ کیا کروں صاحب۔ اٹھ تک نہیں سکتا ہوں پھر بھی جس طرح ہو سکا جلدی جلدی بھاگ آیا۔“

میں نے کہا..... ”بہت اچھا کیا۔“

وہ بولے..... ”بہت اچھا کیا یہ کس طرح کہوں صاحب! کمبائنڈ ہنڈ“ بہت سی زبردست ہے بولتا ہے نہیں رہوں گا چلا جاؤں گا، ذرا سارے لے گا چھی طرح دھکا تو دیتے۔“

مجھے کچھ حیرت ہوئی لیکن اس سے پہلے اس کمبائنڈ کی تعریف کر دینا ضروری ہے کیونکہ جو لوگ یہ نہیں جانتے کہ ہندوستانی لوگ پیسے کے لیے دنیا میں ایسا کوئی بھی کام جو کر گزریں ان لوگوں کو سن کر یہ تعجب ہو گا کہ انگریزی کے اس لفظ کا مطلب ہے دو بے، چر بے تیواری وغیرہ ہندوستانی برہمن جو

ممکن احتیاط چشم زدن میں ہی خاک میں مل گئی۔ عوام میں ہر اس پھیل گیا شہر کی نوے فیصدی آبادی تو ملازمت پیشہ تھی یا تجارت پیشہ۔ اس لیے ان کو فوراً ہی بھاگ نکلنے کی سہولت نہ تھی بالکل وہی حالت ہوئی جیسی کسی بند کمرے میں آتش بازی چھو نہر چھوڑ دینے پر ہوتی ہے خوف کے مارے اس محلے کے لوگ بیوی بچوں کا ہاتھ پکڑے، چھوٹی موٹی گٹھڑیاں کندھے پر لادے اس محلے کو بھاگتے تھے اور اس محلے کے لوگ ٹھیک اسی طرح اس محلے کو بھاگتے آتے تھے۔ زبان سے ”چو ہے“ کا لفظ نکالیں کہ پھر خیریت نہیں وہ مردہ ہے یا زندہ، یہ سننے سے پہلے لوگ بھاگنا شروع کر دیتے معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کی جان درخت کے پھل کی طرح پک کر ڈٹھلوں میں جھول رہی ہے۔ پلگ کی ہوا لگتے ہی رات بھر میں ان سے کون کون کب ’ٹپ سے‘ نیچے ٹپک پڑے گا اس کا کچھ یقین ہی نہ تھا۔



”کمبائینڈ ہینڈ بولا.....“ کوئی چوہا غیر ہڑ گیا ہوگا؟“

میں چونک اٹھا..... ”چوہا کیسارے؟ اس گھر میں چوہے مرتے ہیں کیا؟“

اس نے ہاتھ کوالٹ کر لائے علمی کے ساتھ بتایا کہ روز صبح کم از کم پانچ چھ مرے ہوئے چوہے تو وہ اٹھا کر خود ہی باہر گلی میں پھینک دیا کرتا ہے۔

مٹی کے تیل کی ڈبیا جلا کر تلاش کی گئی مگر اس مردہ چوہے کا پتہ نہ چلا پھر بھی میرا جسم سن سن کرنے لگا اور جی کھول کر اس آدمی کو کسی طرح بھی یہ نیک رائے نہ دے سکا کہ بیمار مالک کو تنہا چھوڑ کر اسے بھاگ جانا مناسب نہیں۔

خواب گاہ میں لوٹ کر دیکھتا ہوں منوہر بابو کھٹاٹ پر بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے پاس بٹھا کر اس مکان کی خوبیوں کا تذکرہ سنانے لگے اتنے کم کرایہ میں شہر کے درمیان اتنا اچھا مکان اور کوئی نہیں۔ مالک مکان بھی نیک اور پڑوسی بھی بھائیوں کی طرح۔ نزدیک ہی کے مکان میں جو چار پانچ مدراسی کریشان میں چلاتے ہیں وہ جس قدر مہذب اور معزز ہیں اسی قدر حریص اور لالچی بھی ہیں۔ انہوں نے اپنا یہ ارادہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ کچھ صحت ہوتے ہیں اس سارے براہمن کو نکال باہر کریں گے۔ پھر یکا یک بولے..... ”اچھا صاحب آپ خواب کے قائل ہیں؟“

میں نے کہا..... ”نہیں“

وہ بولے..... ”میں بھی نہیں ہوں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ کل رات میں نے خواب دیکھا کہ میں سیڑھی پر سے گر پڑا ہوں اور جاگ کر دیکھا تو وہیں پاؤں کا کولہا سوچ آیا ہے۔ سچ جھوٹ کی آزمائش آپ میرا جسم ٹٹول کر لیں۔ تکلیف کی وجہ سے بخار تک ہو گیا ہے۔“

سننے ہی میرا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اس کے بعد کولہا بھی دیکھا اور جسم پر ہاتھ رکھ کر بخار بھی۔ منٹ بھر تک پاگوں کی طرح بیٹھنے رہنے کے بعد بالآخر بولا..... ”ڈاکٹر کو اب تک آپ نے کیوں نہیں بلا بھیجا۔ اب جلد کسی کو بھیجئے۔“

وہ بولے ”صاحب! یہ بلکہ، یہاں ڈاکٹروں کی فیس بھی تو کم نہیں ہے۔ اسے بلوایا نہیں کہ چار پانچ روپے فضول ہی چلے جائیں گے۔ اس کے علاوہ دوائی کے دام الگ۔ تقریباً دو روپے کی ڈیج اس طرح اور لگ جائے گی۔“

میں نے کہا..... ”لگنے دیجئے بلائے بھیجئے۔“

”کون جائے گا صاحب! تیواری سالا تو جانتا بھی نہیں ہے اور اگر یہ چلا بھی گیا تو کھانا کون

پکائے گا؟“

یہاں کسی کے پاس پھلے ہی اچھل پڑتے ہیں لیکن وہاں جا کر رسوئی بناتے ہیں۔ جوٹھے برتن ملتے ہیں تمباکو بھرتے ہیں اور بابو صاحب کے دفتر جاتے وقت ان کے بوٹ جھاڑ کر صاف کر دیتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ بابو کسی بھی ذات کے کیوں نہ ہوں لیکن یہ ضرور ہے کہ دو چار روپے ماہوار زیادہ دینے پر ہی یہ تردیدی، حیرت دیدی وغیرہ پاکیزہ لوگ براہمن اور شودر..... دونوں کا کام کمبائینڈ کے طور پر کرتے ہیں۔ کم عقل اڑیا اور بنگالی براہمن آج تک بھی یہ کام کرنے پر رضامند نہیں کئے جاسکے۔ کئے جاسکے تو صرف یہ ہی اس کی وجہ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ پیسہ ملتے ہی قدیم اور بوسیدہ اعتقادات کو ترک کر دینے میں ہندوستانی لوگوں، کو کچھ بھی دیر نہیں لگتی۔ (مرغی وغیرہ پکانے کے لیے چار آٹھ آنے مہینہ اور زیادہ دینے پڑتے ہیں کیونکہ دام ملنے پر ہر شے پاک ہو جاتی ہے)

لیکن منوہر بابو کے اس کمبائینڈ ہینڈ کو میں کس لیے دھمکی دوں اور وہ میری دھمکی تو سننے لگا ہی کیوں؟ یہ میں سمجھ نہ سکا اور یہ ہینڈ بھی منوہر بابو نے حال ہی میں رکھا تھا۔

اتنے دنوں تک وہ خود ہی اپنے کمبائینڈ ہینڈ تھے۔ صرف ڈای سینٹری، کی خاطر ہی کچھ دنوں کے لئے رکھ لیا تھا۔ منوہر بابو کہنے لگے..... ”صاحب آپ کیا کوئی معمولی آدمی ہیں شہر بھر کے لوگ آپ کی بات پر مرتے جیتے ہیں شاید آپ سمجھتے ہوں گے کہ میں اس بات کو نہیں جانتا۔ زیادہ نہیں ایک سطر پہ اگر آپ لاٹ صاحب کو لکھ دیں تو اس کو چودہ سال کی جیل ہو جائے۔ یہ کیا میں نے نہیں سنا؟“

”لگا دیجئے بچوں کو اچھی طرح ڈانٹ!“

بات سن کر میں حیران و ششدر رہ گیا۔ جن لاٹ صاحب کا نام تک میں نے نہیں سنا تھا ان کو زیادہ نہیں ایک ہی سطر لکھ دینے سے چودہ سال کی جیل کی امید، میری اس عجیب و غریب طاقت کی بات اتنے بڑے مدبرانہ انسان کے منہ سے سن کر میں یہ سوچ ہی نہ سکا کہ کیا کہوں اور کیا کروں؟ تاہم ان کے بار بار کے اصرار اور زبردستی کے مارے جب کوئی اور راستہ ہی نہ رہا تو اس ”کمبائینڈ ہینڈ“ کو ڈانٹ بتانے رسوئی گھر میں گھسا..... دیکھا وہ اندھے کوئیں کی طرح تاریک ہے۔

وہ اوٹ میں کھڑا ہوا اپنے مالک کی زبانی میری طاقت کا احوال سن چکا تھا اس لیے روئی صورت بنا کر بولا..... ”اس گھر میں دیوتا، ہیں۔ یہاں میں کسی طرح بھی نہیں رہ سکتا۔ طرح طرح کے سائے رات دن اس گھر میں گھوما کرتے ہیں۔ بابو اگر کسی اور مکان میں جا کر رہیں تو میں ان کی نوکری بخوبی کر سکتا ہوں۔ لیکن اس مکان میں تو.....“

بھلا ایسے اندھیرے مکان میں سائے کا کیا قصور۔ لیکن سایہ ہی نہیں وہاں ایک بہت بری سزا اندھ بھی جب سے میں آیا تھا آ رہی تھی..... پوچھا..... ”یہ بدبو کیسی ہے رے؟“

ادھر وہ مریض انسان رفتہ رفتہ جو حرکات کرنے لگا ان کے متعلق صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ تنہا بیٹھ کر ان سے لطف اندوز ہونا مشکل تھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے مگر نہ تو قریب کے کمرہ کھلنے کی آہٹ ہی ہوئی اور نہ کوئی آواز سنائی پڑی۔ میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد باہر آ جاتا تھا۔ تالا اسی طرح لٹک رہا تھا۔ یکا یک نظر پڑی کہ لکڑی کی دیوار کے سوراخ سے ایک تیز روشنی کمرے میں آرہی تھی۔ بے قرار ہو کر اسی سوراخ کی راہ دیکھا تو میرے جسم کا خون برف کی مانند ٹنڈ ہوا تھا۔ سامنے کی کھاٹ پر دو جوان آدمی پاس ہی پاس تکیے پر سر رکھے سو رہے ہیں اور ان کے سر ہانے بغل میں موم بتیوں کی ایک قطار جل جل کر تقریباً ختم ہو رہی ہے۔ مجھے تو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ روشن کیتھوٹک لوگ مردے کے سر ہانے روشنی جلا دیتے ہیں اس لیے ان مضبوط جسم جوانوں کی اس بے وقت نیند کی وجہ تھی وہ سب آں واحد میں ہی میری سمجھ میں آ گئی اور میں سمجھ گیا کہ اب ان کی نیند ہزار چلانے پر بھی نہ ٹوٹے گی۔ ادھر اس کمرے میں بھی ہمارے منورہ بابو تقریباً دو گھنٹے اور چھپتانے کے بعد سو گئے۔ چلو جان بچی۔

حیرت کی بات یہ کہ جنہوں نے اس دن مجھے اتنی نصیحت کی تھی کہ بغیر جان پہچان کے کسی بھی آدمی کی بیماری کی اطلاع پا کر اس محلے میں قدم بھی نہ رکھنا چاہئے۔ انہیں کے مردے اور گنیوں کے بکس کی رکھوالی کے لیے مجھے مقرر تو کر دیا لیکن بقایا رات میری جس طرح کئی اسے ضبط تحریر میں لانا بھی ناممکن ہے اور کہنے کی خواہش بھی نہیں ہوتی۔ تاہم قارئین اس بات پر شک نہ کریں گے کہ وہ رات موٹے الفاظ میں ’بھلی‘ طرح نہیں گئی۔

دوسرے دن ڈیڑھ ٹریفیکٹ، لینے پولیس بلانے، اتار دینے اگنیوں کا انتظام کرنے اور مردے کو رخصت کرنے میں تین بج گئے۔ خیز منو ہر تو ٹھیل گاڑی پر سوار ہو کر شاید سو رگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ رہا میں سو میں اپنی رہائش گاہ پر واپس لوٹ آیا۔ گزشتہ دن تو ایک دوشی ہی تھی آج بھی شام ہو گئی۔ ڈیرے پر واپس لوٹتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ دائیں کان کی جڑ میں سوجن آ گئی ہے اور دور ہو رہا ہے۔ کیا معلوم کہ تمام رات ہاتھ سے چھیڑ چھاڑ کر میں نے خود ہی درد پیدا کر لیا ہے یا بچ بچ ہی گنیوں کا حساب دینے مجھے سو رگ جانا پڑے گا۔ یکا یک کچھ بھی نہ سمجھ سکا لیکن یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ بعد ازاں جو ہونی الحال تو جب تک ہوش و حواس درست ہیں اپنا انتظام سب خود ہی کرنا ہو گا کیونکہ منو ہر کی طرح آئیں بیک لے کر اٹھانا اور رکھنا نہ تو ٹھیک معلوم ہوتا ہے اور نہ ہی اچھا۔ فیصلہ کرتے مجھے دیر نہ لگی۔ کیونکہ پل بھر میں ہی دیکھ لیا کہ اتنی بڑی بری مرض کا بار اگر میں کسی روشن ضمیر مہاتما پر ڈالنے جاؤں گا تو یقیناً بڑا عظیم گناہ ہو گا۔ کسی نیک انسان کو پریشان کا نا فرض بھی نہیں ہے۔ مذہب بھی اجازت نہیں دیتا اس لیے اس کی ضرورت نہیں بلکہ اس رنگون شہر کے ایک کونے میں ابھی نام کی جو ایک گنگار اور تپت عورت رہتی ہے ایک

”اچھا میں ہی جاتا ہوں“..... کہہ کر ڈاکٹر بلا نے باہر چل دیا۔
ڈاکٹر نے آ کر معائنہ کیا اور پھر مجھے اوٹ میں لے جا کر کہا..... ”یہ آپ کے کون ہوتے ہیں؟“
میں نے جواب دیا..... ”کوئی نہیں“ اور کس طرح صبح یہاں آ پھنسا یہ بھی تفصیل سے بتا دیا۔
ڈاکٹر نے پوچھا..... ”ان کا اور بھی کوئی نزدیکی یہاں ہے؟“
میں نے کہا..... ”مجھے معلوم نہیں۔ شاید کوئی ہو۔“

لحہ بھر خاموش رہ کر ڈاکٹر بولے..... ”میں ایک دوائی لکھ کر دیئے جاتا ہوں سر پر برف رکھنے کی بھی ضرورت ہے لیکن سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو پلگ ہسپتال میں پہنچا دیا جاتے۔ آپ خود بھی اس مکان میں نہ ٹھہریئے اور دیکھئے مجھے فیس دینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“
ڈاکٹر چلے گئے۔ بڑی جھجک کے ساتھ میں نے ہسپتال جانے کی تجویز پیش کی۔ سنتے ہی منو ہر رونے لگے..... ”وہاں تو مریضوں کو زہر دے کو مار دالتے ہیں اور وہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔“
اس طرح بہت کچھ بک گئے۔

دوائی لانے بھیجنے کے لیے تیاری کو کھاتا ہوں تو دیکھا کہ کمپاینڈ، اپنے لوٹا کبیل لے کر اس دوران میں نامعلوم کہاں کھسک گیا۔ معلوم ہوتا ہے اس نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میری بات چیت دروازے کی آڑ سے لی تھی۔ ہندوستانی خواہ اور کچھ نہ سمجھیں مگر پلگ کے لفظ کو خوب سمجھتے ہیں۔

مجبوراً مجھے ہی دوائی لینے کے لیے جانا پڑا۔ برف، آئیں بیک وغیرہ جو کچھ بھی ضروری تھا سب میں نے ہی خرید کر لا حاضر کر دیا۔ اس کے بعد رہ گیا میں اور وہ..... وہ اور میں ایک دفعہ میں ان کے سر پر آئیں بیک رکھتا تھا اور ایک بار وہ میرے سر پر رکھتے تھے۔ اسی طرح تقریباً دو بج گئے تو انہوں نے بے ہوش ہو کر کھاٹ بکڑی۔ گاہے گاہے ہوش میں آ کر بھی کچھ کہتے تھے۔ شام کے قریب دم بھر کے لیے ہوش میں آ کر میری طرف دیکھ کر بولے..... ”شری کانت بابو! اب میں نہ بچوں گا۔“

میں چپ ہو رہا۔ اس کے بعد بوقت بسیار کمر سے انہوں نے چابی کھولی اور اسے میرے ہاتھ دے کر کہا..... ”میرے ٹرنک میں تین سو گنیاں ہیں۔ میری بیوی کو بھیج دینا۔ پتہ میرے بکس میں لکھا رکھا ہے اور تلاش کرنے سے مل جائے گا۔“

مجھے اگر کوئی بھروسہ تھا تو صرف قریب کے ’سیس‘ کا۔ وہاں والوں کی آہٹ اور دھیمالچہ میں سن سکتا تھا۔ شام کے بعد ایک دفعہ کچھ غیر معمولی طور پر اٹھا دھری اور شور و غل سنائی دیا۔ کچھ دیر بعد ہی معلوم ہوا کہ وہ لوگ دروازے میں تالا لٹک رہا ہے۔ میں نے سمجھا کہ وہ لوگ ہوا خوری کے لیے باہر چلے گئے ہوں گے کچھ دیر میں لوٹ آئیں گے لیکن پھر بھی نامعلوم کیوں میرا دل اور بھی خراب ہو گیا۔

بات کو میں نامنظور نہیں کرتی کہ بال بچوں کی پرورش کی طاقت ہونے سے پہلے شادی ہونا مناسب نہیں بنکو میں ابھی وہ قابلیت پیدا نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود بھی میں اس کے لیے تمہاری رائے کس لیے چاہتی ہوں اور اس کا اندازہ جب تک تم مجھے خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لو گے کچھ نہیں کہہ سکتے جیسے بھی ہو سکے یہاں آ جاؤ۔ تمہیں میرے سر کی قسم۔“

خط کے آخری حصہ میں ابھیا کی بات تھی۔ ابھیا نے جب واپس لوٹ کر کہا تھا کہ جس کو میں چاہتی ہوں محبت کرتی ہوں اس کی گریہ سستی بسانے کے لیے میں ایک حیوان کو چھوڑ کر چلی آئی ہوں اور اسی مضمون کے متعلق اس نے رسم و رواج پر جو زور دار بحث کی تھی اس سے میں اس درجہ متاثر ہوا تھا کہ میں نے بہت سی باتیں پیاری کو لکھ ڈالی تھیں۔ آج ان باتوں کا جواب اس نے دیا تھا۔

”تمہاری زبان سے اگر وہ میرا نام سن چکی ہوں تو تمہیں تاکید ہے کہ ایک مرتبہ ان سے ملنا اور کہنا کہ راج لکشمی تمہیں لاکھوں پر نام کرتی ہے اور لکھا تھا کہ عمر میں وہ مجھ سے چھوٹی ہیں یا بڑی میں نہیں جانتی۔ جاننا ضروری بھی نہیں ہے وہ محض اپنی نورانیت کی وجہ سے ہی مجھ عام عورت کے لیے قابل احترام ہیں۔ آج مجھے اپنے گورو دیو کے شری کھ کے بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ میرے کاشی کے مکان میں دلکشا (بیت) کی مکمل تیاریاں ہو چکی تھیں۔ گورو دیو اپنی جگہ پر بیٹھ کر خاموشی سے کچھ سوچ رہے تھے۔ میں آڑ میں کھڑی بہت دیر تک ان کے مسرور چہرے کی طرف ہنسنے لگی۔ ان کے پاؤں کے پاس اوندھے منہ کر کے روئے ہوئے کہا بابا میں منتظر نہ لوں گی، وہ حیران ہو کر میرے سر پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ کر بولے۔ ”کیوں بیٹی، کیوں نہ لے گی؟“

میں نے کہا۔ ”سنبھگار ہوں۔“
انہوں نے درمیان میں ہی روک کر کہا۔ ”ایسا ہے تو پھر منتظر لینے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے بیٹی۔“

روتے روتے میں نے کہا۔ ”شرم و حیا کے مارے میں نے اپنا حقیقی تعارف نہیں کرایا ہے اگر ایسا کرتی تو آپ اس مکان کی چھوٹ کے اندر آنا بھی پسند نہ کرتے۔“
گورو دیو مسکرا کر بولے۔ ”نہیں تو بھی میں آتا اور دیکھا دیتا۔ پیاری کے مکان میں خواہ نہ تا لیکن اپنی راج لکشمی بیٹی کے مکان میں کیوں نہ آؤں گا بیٹی؟“
میں چونک کر خاموش ہو گئی کچھ دیر چپ رہ کر بولی۔ ”لیکن میری ماں کے گورو نے تو کہا تھا کہ مجھے دیکھا دینے سے پنت ہونا پڑے گا۔ کیا یہ بات سچ نہ تھی؟“

دن جس کو نفرت سے چھوڑ آیا ہوں اسی کے کندھے پر اپنی مرض کا گندہ بوجھ نفرت کے ساتھ ڈال دینا چاہئے۔ مرنا ہو تو وہیں مروں شاید اس سے کوئی ثواب مل جائے۔ یہی سوچ کر میں نے نوکر کو گاڑی لانے کا حکم دے دیا۔

☆☆☆

اس دن جب موت کا پروانہ ہاتھ میں لے کر میں ابھیا کے دروازے پر جا کھرا ہوا تو مجھے مرنے کی نسبت مرنے کی شام نے ہی زیادہ خوف دکھایا۔ ابھیا کا چہرہ فق سفید ہو گیا لیکن اس کے سفید ہونٹوں سے صرف یہی الفاظ پھوٹ کر باہر نکلے تمہاری ذمہ داری میں نہ اٹھاؤں گی تو اور کون اٹھائے گا؟ اس جگہ مجھے سے بڑھ کر تمہاری اور کسے غرض ہے؟“

آنکھوں میں پانی بھر آیا پھر بھی میں نے کہا۔ ”میں تو بس چل دیا۔ راہ تکلیف تو مجھے اٹھانی ہی ہوگی اس سے بچانے کی طاقت کسی میں بھی نہیں۔ مگر جاتے وقت تمہاری اس نئی گھریلو زندگی میں اتنی بڑی مصیبت ڈالنے کو اب کسی طرح بھی دل نہیں چاہتا۔ ابھیا ابھی گاڑی کھڑی ہے ہوش و حواس بھی درست ہیں اب بھی بخوبی پلگ ہسپتال میں جاسکتا ہوں تم ایک آن کے لیے جی کرا کر کہہ دو، اچھا جاؤ،“ ابھیا نے کوئی جواب دیے بغیر ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے پچھونے میں لے جا کر سلا دیا۔ اب اس نے اپنے آنسو پونچھے اور میری فراخ پیشانی پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم سے جاؤ، کہہ سکتی تو نئے سرے سے یہ گھر گریہ سستی قائم نہ کرتی۔ آج سے میری نئی گریہ سستی سچ گریہ سستی ہوئی۔“
بہت ممکن ہے کہ وہ پلگ نہیں تھی اس لیے موت ذرا سا مذاق کر کے چلی گئی دس دن میں میں اٹھ کھرا ہوا مگر ابھیا نے پھر مجھے ہوٹل کے ڈیرے میں لوٹنے نہ دیا۔

دفتر جاؤں یا اور کچھ دن رخصت لے کر آرام کروں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دن دفتر کا چپڑا اسی ایک خط دے گیا۔ کھول کر دیکھا تو پیاری کا خط تھا۔ برآمد آنے کے بعد ہی اس کا پہلا خط ملا جواب نہ آنے پر بھی میں اسے کبھی کبھی خط لکھ دیا کرتا تھا۔ آتے وقت یہی وعدہ اس نے مجھ سے لے لیا تھا۔ خط کے آغاز میں ہی طعنہ دے کر اس نے مجھے لکھا تھا کہ میرے مرنے کی اطلاع تو تم کو ضرور ملے گی اور زندہ رہتے میری ایسی کوئی اطلاع نہیں ہو سکتی۔ جس کو سنے بغیر تمہارا کام نہ چلے لیکن میرے لیے تو یہ ممکن نہیں میری جان تو ہمیشہ پردیس میں ہی پڑی بھٹکتی رہتی ہے اور اس بات میں اتنی زیادہ صداقت موجود ہے کہ تم بھی اس پر یقین کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی لئے خط نہ ملنے پر بھی گاہے گاہے تم کو خط لکھ کر یہ بتانا ہی پڑتا ہے کہ تم وہاں اچھی طرح ہو۔

”میں اس ماہ کے اندر ہی بنکو کی شادی کر دینا چاہتی ہوں۔ تم اپنی رائے لکھنا۔ تمہاری اس

گورو دیو نے بولے۔ ”سچ تھی اس لیے تو وہ ندے سے بٹی لیکن جس کو ذر نہیں ہے وہ کیوں ندے گا؟“

میں نے کہا۔ ”ذریکوں نہیں ہے؟“

وہ پھر ہنس کر بولے۔ ”ایک ہی مکان میں مرض کے جراثیم ایک انسان کو ہلاک کر ڈالتے ہیں وہ ہی جراثیم دوسرے انسان کو چھو تک نہیں سکتے۔ بتا سکتی ہو کیوں؟“

میں نے جواب دیا۔ ”شاید چھوتے تو ہیں لیکن جو لوگ طاقتور ہیں وہ بچ جاتے ہیں اور جو کمزور ہوتے ہیں وہ مر جاتے ہیں۔“

گورو دیو نے میرے سر پر پھر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”اس بات کو کسی دن بھی مت بھولنا بیٹی۔ وجرم ایک انسان کو مٹی میں ملا دیتا ہے اسی جرم میں سے دوسرا آدمی صاف پار ہو جاتا ہے۔ اس لیے تمام نادین سب کو ایک ہی زنجیر میں جکڑ نہیں سکتے۔“

ججک کے ساتھ میں نے آہستہ سے پوچھا۔ ”جو بے انصاف ہے جو غیر قانونی ہے وہ طاقتور اور کمزور دونوں کے لیے کیا یکساں نہیں ہے؟ اگر نہیں تو کیا یہ ظلم نہیں؟“

گورو دیو بولے۔ ”نہیں بیٹی بظاہر دیکھنے سے اس کا انجام یکساں نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو دنیا میں کمزور اور طاقتور کی تمیز مٹ جاتی۔ جو ہر پانچ سال کے بچے کے لیے قاتل ہے وہی زہراگر اکتیس سال کے مرد کو ہلاک نہ کر سکے تو الزام کسے دوگی بیٹی؟ اور اگر میری بات کو آج تم اچھی طرح نہ سمجھ سکو تو کم از کم اتنا ضرور یاد رکھنا کہ جن لوگوں کے اندر آگ جل رہی ہے اور جن میں محض راکھ ہی اکٹھی ہو کر پڑی ہوئی ہے ان کے افعال کا وزن ایک ہی بات سے نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کیا جائے تو غلطی ہوگی۔“

شری کانت بھیا! تمہارا خط پڑھ کر مجھے اپنے گورو دیو کی وہی اندر کی آگ والی بات یاد آگئی۔ ابھیا کو دیک سے دیکھا تو نہیں ہے پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر جو آگ جل رہی ہے اس کے طلب کا اندازہ تمہارے خط سے بخوبی ہو رہا ہے۔ ان کے افعال کا فیصلہ ذرا غور و خوض سے کرنا مجھے جیسی بام عورت کے ترازو پر ان کے گناہ و ثواب کا وزن کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھنا۔“

خط ابھیا کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ ”راج لکشی نے تمہیں ہزاروں پر نام لکھے ہیں۔ یہ لو“

ابھیا جو کچھ لکھا تھا اسے دو تین مرتبہ پڑھ کر اور کسی طرح خط کو میرے ہچھونے پر ڈال کر تیزی سے باہر چلی گئی۔ دنیا کی نگاہوں میں اس کی نسائیت آج مورد الزام اور ذلیل ہو رہی ہے لیکن اس پر ہزاروں کوس دور ایک اجنبی عورت نے عزت اور احترام کے پھولوں کی بارش کی ہے۔ اس بے پایاں مسرت کو ایک مرد کی نگاہوں سے بچا کر دو جھٹ پٹ آڑ میں لے گئی۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد ابھیا اچھی طرح منہ آنکھیں دھو کر لوٹ آئی اور بولی۔ ”شری کانت بھیا۔“

میں نے روک کر کہا۔ ”ارے یہ کیا! ابھیا کب سے ہو گیا؟“

”آج سے ہی“

”نہیں نہیں بھیا، نہیں۔ تم سب لوگ مل کر سب طرف سے میرا رستہ بند نہ کر دینا۔“

ابھیا نے ہنس کر کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ دل ہی دل میں کوئی مطلب گانٹھ رہے ہو کیوں؟“

”کیوں، کیا میں انسان نہیں ہوں؟“

ابھیا بولی۔ ”بے ڈھب انسان نظر آتے ہو۔ بے چارے روئی بابو نے بیماری کے دوران میں آسرا دیا۔ اب تندرست ہو کر معلوم ہوتا ہے یہی انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے لیکن مجھ سے غلطی ہوئی اس وقت بیماری کا ایک تار دے دیتی تو آج انہیں دیکھ لیتی۔“

میں نے گردن ہلا کر کہا۔ ”عجب نہیں کہ وہ آ جاتیں۔“

ابھیا دم بھر خاموش رہ کر بولی۔ ”تم ایک آدھ مہینے کی رخصت لے کر ایک بار چلے جاؤ شری کانت بھیا۔ مجھے معلوم ہوتا ہے تمہاری انہیں بڑی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔“

نا معلوم کس طرح خود میں بھی اس بات کو سمجھ رہا تھا کہ میری اسے بڑی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ”دوسرے ہی دن میں نے دفتر میں اطلاع دے کر ایک مہینے کی مزید رخصت لے لی اور آئندہ جہاز سے سفر کرنے کا ارادہ کر کے ٹکٹ خریدنے کے لیے آدمی بھیج دیا۔“

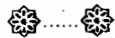
جاتے وقت ابھیا نے نمسکار کر کے کہا۔ ”شری کانت بھیا! ایک وعدہ کرو“

”کیا وعدہ کروں بہن؟“

”انسان دنیا کی تمام باتوں کے متعلق فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اگر کہیں رکاوٹ پیش آئے تو ایک خط لکھ کر میرا مشورہ لے لینا، منظور ہے بولو؟“

میں منظور و قبول کر کے جہاز پر جانے کے لیے گاڑی پر جا بیٹھا۔ ابھیا نے گاڑی کے دروازے کے نزدیک کھڑے ہو کر ایک بار پھر پر نام کیا بولی۔ ”روئی بابو کے ذریعہ میں نے کل ہی وہاں تار دلوادیا تھا لیکن دوران سفر میں اپنی صحت کا خیال رکھنا شری کانت بھیا، اس کے علاوہ میں تم سے اور کچھ نہیں چاہتی۔“

اچھا، کہہ کر میں نے منہ اٹھا کر دیکھا کہ ابھیا کی آنکھوں کی دونوں پتلیاں پانی میں تیر رہی ہیں۔



عالم الغیب بھگوان کے سوا کسی نے نہ جانا مگر ایک گہری آہ کو اس سے بھی چھپانہ سکا۔ اس لیے حیران ہو کر دم بھرتک میری طرف تاکتے رہ کر پھر ہنس کر پوچھا..... 'کیسی نظر آتی ہوں میں..... بیمار؟'

ایک ایک اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ بیمار؟ ہاں کچھ بیماری ہی معلوم ہوتی ہے لیکن نہیں یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ خیال آیا گویا وہ کتنے ہی ممالک پیدل چل کر طویل مسافت طے کر کے اسی وقت لوٹ کر آئی ہے۔ ایسی مریض کی ایسی تھکی سی۔ اپنا بوجھ اٹھانے کی بھی اس میں طاقت نہیں۔ اس وقت وہ ضرور بے فکر اور بے خوف ہو کر آنکھیں موند کر سونے کے لیے ذرا سی جگہ کی تلاش میں ہے مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولی..... "کیوں بولتے کیوں نہیں؟"

میں نے کہا..... "مت کہلو او"

راج لکشمی بچوں کی مانند زور سے سر ہلا کر بولی..... "نہیں کہنا ہی پڑے گا۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ میں دیکھنے میں بالکل ہی بد صورت ہو گئی ہوں کیا یہ سچ ہے؟"

میں نے سنجیدہ ہو کر کہا..... "ہاں سچ ہے"

راج لکشمی ہنس پڑی بولی..... "تم انسان کو اتنا حیران کر دیتے ہو کہ بس اچھا اس میں برا کیا ہے۔ اچھا ہی تو ہے۔ حسن کو لے کر اب میں کیا کروں گی؟ تمہارے ساتھ میرا خوبصورتی یا بد صورتی..... اچھی بری نظر آنے کا تو کوئی تعلق نہیں ہے پھر میں خواہ مخواہ اس بات کی تشویش میں کیوں مرتی پھروں؟"

میں نے جواب دیا..... "یہ تو ٹھیک ہے کہ اس تشویش میں مرتے پھرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اول تو لوگ یہ بات تم سے کہتے ہی نہیں اس کے علاوہ اگر وہ کہیں بھی تم کو یقین کرنے والی نہیں دل ہی دل میں سمجھتی ہو کہ....."

راج لکشمی غصے سے بولی ابھی..... "تم کیا غیب کا علم جانتے ہو جو سب کے دل کا حال تمہیں معلوم ہے۔ میں کبھی یہ بات نہیں سوچتی تم خود ہی سچ کہو۔ جب وہاں شکار کرنے گئے تھے تو تم نے جیسی دیکھا تھا اب بھی کیا میں ویسی ہی ہوں؟ تب سے تو کتنی ہی بد صورت ہو گئی ہوں۔"

میں نے کہا..... "نہیں بلکہ اس وقت سے تو اچھی نظر آ رہی ہو۔"

راج لکشمی نے فوراً ہی کھڑکی سے باہر منہ پھیر کر اپنا ہنستا ہوا چہرہ شاید میری فریفت نگاہوں کی طرف ہٹا لیا اور کوئی جواب نہ دے کر خاموشی اختیار کر لی۔ کچھ دیر بعد ہنسی مذاق کے سب آثار اپنے چہرے سے دور کر کے اس نے اپنے چہرہ پھر اس طرف پھیر لیا اور پوچھا..... "تمہیں کیا بخار آ گیا تھا اس ملک کی آب و ہوا کیا موافق نہیں آتی؟"

میں نے کہا..... "نہ آئے تو چارہ ہی کیا ہے؟ جس طرح بھی ہو موافق کر لینی پڑتی ہے۔"

فلکتے کے ساحل پر جہاز جا کر رکنا دیکھا جیٹی پر بنکو کھڑا ہے وہ سیڑھی کے ذریعہ جھٹ پٹ اوپر چڑھ آیا در زمین پر سرٹیک کر پر نام کر کے بولا..... "ماں راستے پر گاڑی میں راہ دیکھ رہی ہیں آپ نیچے جایئے میں سامان وغیرہ لے کر پیچھے آتا ہوں۔"

باہر آتی ہی اور بھی ایک آدمی جھک کر پاؤں چھو کر کھڑا ہو گیا میں نے کہا..... "ارے رتن! کہو اچھے تو ہو؟"

رتن کچھ ہنس کر بولا..... "آپ کی دعا سے، آئیے، یہ کہہ کر اس نے راستہ دکھاتے ہوئے گاڑی کے قریب لا کر دروازہ کھول دیا۔ راج لکشمی نے کہا "آئیے..... اور رتن تم لوگ ایک اور گاڑی کر کے پیچھے سے آ جانا، دو بج رہے ہیں۔ ابھی تک انہوں نے نہایا کھایا بھی نہیں۔ ہم لوگ ڈیرے پر چلتے ہیں۔ گاڑی بان سے گاڑی ہانکنے کو کہہ دے۔"

میں گاڑی پر بیٹھ گیا۔ رتن نے بھی اچھا، کہہ کر گاڑی کا دروازہ بند کر دیا اور گاڑی بان کو ہانکنے کے لیے اشارہ کر دیا۔ راج لکشمی نے جھک کر قدیموں کی خاک لی اور کہا..... "جہاز میں تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں"

"طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی کیا؟"

"طبیعت خراب تو ضرور ہو گئی تھی لیکن بہت نہیں۔ تم بھی تو تندرست نظر نہیں آتیں۔ گھر سے کب آئیں؟"

پرسوں، ابھی کے ذریعہ تمہارے آنے کی اطلاع پاتے ہی ہم لوگ گھر سے چل دیئے آنا تو تھا ہی اس لیے دو دن پہلے ہی چلے آئے۔ کچھ معلوم ہے یہاں تمہیں کتنا کام کرنا ہے؟"

راج لکشمی ہنس دی۔ اس ہنسی کو دیکھ کر آج خیال آیا کہ نامعلوم کتنے دنوں سے یہ ہنسی نہیں دیکھی تھی اور اس خیال کے ساتھ ساتھ ہی ایک تڑپا دینے والی آرزو کو بھی دل ہی دل میں دفن کر لیا اس کو

میں دل ہی دل میں یقینی طور سے جانتا تھا کہ راج لکشمی اس بات کا کیا جواب دے گی کیونکہ جس ملک کی آب و ہوا آج تک اپنی نہیں ہو سکی کسی مستقبل بعید میں بھی اس کو اپنے موافق بنا لینے کی امید کے بھروسے وہ میرے واپس لوٹ جانے پر رضامند نہ ہوگی بلکہ زبردست مخالفت کر کے رخنہ انداز ہو گی۔

یہی میرا خیال تھا لیکن ایسا نہ ہوا وہ دم بھر خاموش رہ کر ملائم لہجہ میں بولی۔ ”یہ تو سچ ہے اس کے علاوہ اور بھی تو بہت سے بنگالی رہتے ہیں۔ انہیں جب موافق ہے تو تمہارے ہی لیے کیوں ناموافق ہوگی؟ کیا کہتے ہو؟“

میری صحت کے متعلق اس کی اس لا پرواہی سے مجھے صدمہ ہوا۔ اس لیے صرف ایک اشارے بھر سے ”ہاں“ کہہ کر چپ ہو گیا۔ ایک بات میں بار بار سوچتا تھا کہ اپنی پلیگ کی کہانی کس طرح راج لکشمی کے گوش گزار کروں۔ دور دراز پردیس میں جس وقت میرے دن زندگی اور موت کے سنگم میں گزر رہے تھے اس وقت کی ہزاروں مصیبتوں کا تذکرہ سنتے سنتے اس میں کیسا طوفان آئے گا دونوں آنکھوں کو آنسوؤں سے تر کر کے پانی کی ایک دہار بہہ نکلے گی۔ کہہ نہیں سکتا کہ اس کو کتنے رنگوں سے بھر کر میں تصور کی آنکھوں سے آئے دن دیکھتا رہا ہوں۔ اس وقت اس تصور نے مجھے سب سے زیادہ شرمندہ کیا سوچا۔ ”چھی چھی۔ خوش قسمتی ہے کہ کوئی کسی کے دل کی بات نہیں جانتا ورنہ۔۔۔۔۔۔ جانے دو اس بات کو دل ہی دل میں کہا۔۔۔۔۔۔ اور خواہ جو بھی کروں اپنی اس مرنے جینے کی کہانی سے نہ کہوں گا۔

بہو ہزار کے ڈیرے پر آ پہنچا۔ راج لکشمی نے ہاتھ سے دکھا کر کہا۔ ”یہ زینہ ہے، تمہارا کمرہ تیسری منزل پر ہے۔ جا کر ذرا سو رہو میں جاتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ اپنے رسوئی گھر کی طرف چل دی کمرے میں گھستے ہی دیکھا کہ کمرہ میرے لیے ہی آراستہ کیا گیا ہے۔ پیاری پنپنے کے مکان سے میری کتابیں اور میرا حقہ تک لانا نہیں بھولی ہے۔ غروب آفتاب کی ایک بیش قیمت تصویر مجھے بہت پسند تھی۔ وہاں اس نے اپنے کمرے سے اترا کر میری خوابگاہ میں لٹکوا دیا تھا اس تصویر تک کو وہ کلکتے اپنے ساتھ لائی ہے اور عین اسی جگہ اس نے اسے دیوار پر لٹکا دیا ہے۔ میرے لکھنے پڑھنے کا ساز و سامان میرے کپڑے میری سرخ مخمل کی چپٹیاں ٹھیک اسی طرح محنت سے سجا کر رکھی ہوئی ہیں۔ وہاں ایک آرام کرسی میں ہمیشہ ہی استعمال میں لاتا تھا۔ اسے ساتھ لانا شاید ممکن نہیں ہوا اسی لیے اسی طرح کی ایک نئی کرسی کھڑکی کے نزدیک رکھی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ جا کر میں اسی پر آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ معلوم ہوا گویا بھانے کی ندی میں جوار کے پانی کی آواز منج کے نزدیک بھر سائی دے رہی ہے۔

نہا کھا کر تھکاؤ کی وجہ سے دن دوپہر کو ہی سو گیا۔ نیند ٹوٹنے ہی دیکھا مغرب کی طرف کھڑکی سے شام کی دھوپ میرے پاؤں کے قریب آ کر پڑ رہی ہے اور پیاری ایک ہاتھ کے بل میرے منہ پر جھکی ہوئی دوسرے ہاتھ سے آٹھل کے کنارے سے سر، کندھوں اور چھاتی کا پسینہ پونچھ رہی ہے۔۔۔۔۔۔ بولی۔ ”پسینے سے تکیے اور پچھو نے بھیگ گئے ہیں۔ پچھم کی طرف سے کھلا ہونے کی وجہ سے یہ کمرہ بڑا گرم ہے کل دوسری منزل پر اپنی بغل کے کمرے میں تمہارے لیے بستر کر دوں گی۔“ یہ کہہ کر میری چھاتی کے بالکل قریب بیٹھ کر پنکھا اٹھا کر ہوا کرنے لگی۔ رتن نے کمرے میں آ کر پوچھا۔ ”ماں، بابو کے لیے چائے لے آؤں۔“

”ہاں لے آ اور بٹکو اگر کمرے میں ہو تو اسے ذرا بھیج دینا“ میں نے پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد باہر سے چپٹیوں کی آواز سنائی پڑی۔ پیاری نے آواز دے کر کہا۔ کون، بٹکو؟ ذرا ادھر تو آ۔“

اس کے پاؤں کی آواز سے معلوم ہوا کہ اس نے نہایت ہی جھجکتے جھجکتے کمرے میں قدم رکھا ہے۔ پیاری اسی طرح پنکھا جھلتے جھلتے بولی۔ ”ذرا کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جا۔ کیا کیا انا ہے۔ اس کی ایک فہرست بنا کر دربان کے ساتھ ذرا بازار جا بیٹا۔ گھر میں کچھ نہیں ہے۔“

میں نے دیکھا یہ ایک بالکل نیا واقعہ ہے۔ پیاری کی بات الگ لیکن اس کو چھوڑ کر اس نے پیشتر کسی دن میرے پچھو نے کے اتنے قریب بیٹھ کر اس نے ہوا تک نہ کی تھی۔ لیکن یہ بھی نہ ہو تو میں ایک دن اسے ممکن تسلیم کر سکتا مگر یہ جو اسے ذرا سی بھی پریشانی نہیں ہوئی سب نوکر چار کروں کے۔۔۔۔۔۔ حتیٰ کہ بٹکو کی موجودگی میں بھی فخر کے ساتھ اپنے آپ کو ظاہر کر دیا۔ اس کے اس بے مثل حسن نے مجھے فریفتہ کر ڈالا۔ مجھے وہ دن یاد آ گیا جب پنپنے کے مکان سے مجھے صرف اس لیے رخصت لینی پڑی تھی کہ مبادا بٹکو ہی کچھ اور خیال نہ کرنے لگے۔ اس دن کے ساتھ آج کے سلوک کی کتنی تفاوت ہے۔

اشیا کی فہرست بنا کر بٹکو چلا گیا۔ رتن بھی تمباکو بھر کر نیچے چلا گیا۔ پیاری کچھ دیر میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی پھر یکا یک بولی۔ ”میں تم سے ایک بات دریافت کرتی ہوں۔ اچھا رتنی بابو اور ابھیادو نوں میں سے کس کی محبت زیادہ ہے بتا سکتے ہو؟“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”جو تم پر مکمل طور پر حاوی ہو چکی ہے اسی ابھیادو زیادہ محبت ہے۔“

راج لکشمی بھی ہنس پڑی بولی۔ ”یہ تم کو کس طرح معلوم ہوا کہ وہ مجھ پر حاوی ہو چکی ہے۔“ میں نے خواب دیا۔ ”خواہ معلوم ہوا ہو یا نہ ہو لیکن کیا یہ سچ نہیں بتاؤ؟“

راج لکشی لمحہ بھرتک چپ رہی پھر بولی..... ”خواہ کچھ بھی ہو لیکن زیادہ محبت تو روشنی بابو ہی کرتے ہیں دراصل وہ اتنی محبت کرتے تھے اسی لیے اتنی بڑی مصیبت انہوں نے اپنے سر پر اٹھالی ورنہ یہ ان کا کوئی ضروری فرض نہ تھا..... اس کے مقابلہ میں ابھی کوزیادہ ایثار کرنا نہیں پڑا۔“

اس کے سوالات کو سن کر میں چیخ مچ ہی حیران رہ گیا۔ میں نے جواب دیا..... ”بلکہ میں تو اس کے عین برعکس دیکھتا ہوں اور اس حساب سے جو ایثار زیادہ تکلیف دہ اور آرام سے پر ہے وہ ابھی کو ہی کرنا پڑا تم روز روشن کی طرح اس حقیقت کو کیوں بھول جاتی ہو کہ روشنی بابو خواہ جو بھی کریں سماج کی نگاہ میں آخروہ مرد ہیں۔“

راج لکشی نے سر ہلا کر کہا..... ”میں کچھ بھی نہیں بھولتی۔ انہیں دھتکار کر باسانی بیچ نکلنے کے لیے جس موقع کی طرف تم اشارہ کر رہے ہو وہ حد درجہ ذلیل اور نامعقول انسانوں کے لیے ہے روشنی بابو جیسے انسان کے لیے نہیں شوق پورا ہو گیا یا کچھ لطف باقی نہ رہا تو چھوڑ چھاڑ کر اور پھینک کر بھاگ سکتے ہیں اور گھر واپس جا کر انے گئے شریف انسانوں کی طرح اپنا سفر زندگی جاری رکھ سکتے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں کیا تم بھی ایسا کر سکتے ہو؟ پس جونہیں کر سکتا اس کے بوجھ کے وزن کا اندازہ تو کرو۔ اس کے لیے اپنی بدنام زندگی گھر کے کسی تاریک گوشے میں بسر کر لینے کی بھی سہولت نہیں رہتی اسے تو دنیا میں جدوجہد کرنے کے لیے میدان میں اترنا ہوگا۔ حقارت اور بدنامی کا بوجھ تنہا ہی برداشت کرنا پڑے گا۔ اپنی واحد محبت کی حقدار محبوبہ کو اپنی آئندہ اولاد کی ماں کو سماج کے طعن تشنیع سے بچا کر رکھنا ہوگا۔ تم اسے کیا معمولی تکلیف سمجھتے ہو؟ اور سب سے بڑھ کر مصیبت یہ ہے کہ جو بلا روک ٹوک اس بوجھ کو اتار کر پھینک سکتا ہے اسے کسی تباہ کن لالچ کے زیر اثر اپنے آپ کو رات دن بچا کر چلنے کے لئے رہنا پڑتا ہے۔ دکھ کر میزان میں اس ایثار کے ساتھ ہموز بنائے رکھنے کے لیے جس محبت کی ضرورت ہے اسے اگر مرد اپنے اندر سے ظاہر نہ کر سکتے تو کسی بھی عورت کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔“

اس بات کو اس پہلو سے اس طرح پہلے کبھی سوچ کر نہیں دیکھا تھا۔ روشنی کی وہ سادہ مزاج اور خاموشی پسند طبیعت اور اس کے بعد ابھی جب اپنے شوہر کے گھر چلی گئی تو اس کے چہرے پر حزن و ملال کو چپ چاپ برداشت کرنے کا جذبہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو وہی جوں کا توں میرے دل میں گھنچ گیا لیکن میں نے کہا..... ”خط میں تو تم نے صرف ابھیا کے لیے ہی خراج تحسین بھیجا تھا۔“

راج لکشی بولی..... ”ان کا جو حق ہے وہ آج بھی انہیں دیتی ہوں کیونکہ میرا یقین ہے کہ جو گناہ یا جرم بھی تھا اس کو انہوں نے اپنے اندر دنی نور سے جلا کر ایک دم پاکیزہ اور صاف کر دیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج وہ بالکل عام عورتوں کی طرح بیچ اور حقیر ہو جاتیں۔“

”حقیر کیوں؟“

راج لکشی نے کہا..... ”خوب، شوہر کے چھوڑ دینے کے گناہ کی بھی کوئی انتہا ہے اس گناہ کو جلا کر خاک کر ڈالنے کے لیے اگر آگ موجود نہ ہوتی تو آج وہ۔“

میں نے کہا..... ”آگ کی بات جانے دو..... لیکن اس کا شوہر کس طرح تباہ ہوا اس بات کو تو ایک دفعہ سوچ دیکھو۔“

راج لکشی بولی..... ”مرد ہمیشہ ہی سے قتلون مزاج رہے ہیں ہمیشہ سے ہی ظلم روا رکھتے آئے ہیں لیکن اس لیے تو عورتوں کے حق میں بھاگ کھڑے ہونے کی دلیل کام نہیں دے سکتی۔ عورتوں کو تو برداشت کرنا ہی ہو گا ورنہ دنیا نہیں چل سکتی۔“

بات سن کر میرے خیالات میں گڑبگڑ گئی۔ دل ہی دل میں کہا کہ یہ عورتوں کی غامی کا وہی قدیم اعتقاد ہے۔ قدرے غصہ آمیز لہجہ میں پوچھا..... ”تو پھر ابھی تک تم آگ آگ، کیا بک رہی تھیں؟“

راج لکشی نے ہنس کر کہا..... ”کیا بک رہی تھی سنو گے؟ آج ہی دو گھنٹے پیشتر پٹنہ کے پتہ پر لکھا ہوا آپ کا خط ملا تھا۔ آگ کیا ہے؟ جانتے ہو؟ اس دن پلگ“ کہہ کر جب تم ان کی نئی نئی گریسٹی کے دروازے پر جا کر کھڑے ہو گئے تو جس شے نے تمہیں بلا خوف و خطر بغیر کسی غور و خوض کے اندر بالیا اور اسی کو کہتی ہوں ان کی آگ اس وقت انہیں اپنے آرام کی فکر نہ تھی۔ جو نور انسان کو فرض سمجھا کر صراط مستقیم کی طرف دھکیلتا ہے پریشانی کے عالم میں پیچھے ہٹنے نہیں دیتا۔ اب تک میں اسی کو آگ آگ کہہ رہی تھی۔ آگ کا ایک نام سب کچھ ہضم کرنے والی بھی ہے۔ یہ کیا تم نہیں جانتے وہ سکھ اور دکھ دونوں کو کھینچ لیتی ہے۔ اسے کسی طرح کا بھی پس و پیش نہیں ہوتا۔ جانتے ہو انہوں نے ایک اور بات کیا لکھی ہے..... وہ روشنی بابو کو کامیاب بنانا چاہتی ہیں کیونکہ ان کا اعتقاد ہے کہ محض اپنی زندگی کو کامیاب بنانے سے ہی دوسرے کی زندگی کو کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔ اور ناکامی سے صرف اکیلی ایک ہی زندگی تباہ نہیں ہوتی بلکہ اپنے ساتھ اور بھی کئی زندگیوں کو تلخ بنایا جاتا ہے۔ بالکل سچ ہے؟“ اتنا کہہ کر وہ یکا یک ایک سردا ہ بھر کر خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد ہم دونوں ہی کافی دیر تک خاموش رہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب کہنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا اس لیے وہ میرے سر کے روکھے بالوں کو اپنی انگلیوں سے فضول ہی ادھر ادھر منتشر کرنے لگی۔ اس کا یہ برتاؤ بھی بالکل نیا تھا۔ دفعۃً بولی..... ”وہ خوب تعلیم یافتہ ہیں نا؟ ورنہ اتنی قابل نہ ہوتیں۔“

میں نے جواب دیا..... ”ہاں فی الحقیقت وہ ایک تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔“

لکشمی نے اچانک پوچھا..... ”اچھا تمہاری رائے پر اگر سب لوگ چلنا شروع کر دیں تو پھر غریبوں کی شادی نہ ہو سکے اور گھر گریستی بھی نہ بنے۔ پھر دنیا کا سلسلہ کس طرح چلے گا؟“

اس کی غیر معمولی سنجیدگی دیکھ کر میں ہنس پڑا بولا..... دنیا کے سلسلہ کو جاری رکھنے کے لیے تمہیں کسی قسم کی تشریح کرنے کی ذرا سی بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہماری طرح چلنے والے انسانوں کی تعداد دنیا میں کچھ زیادہ نہیں ہے۔ کم از کم اپنے اس ملک میں تو نہیں ہے یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے۔“

راج لکشمی نے کہا..... ”ان کی تعداد جس قدر کم ہوتا ہے اچھا ہے محض بڑے آدمی ہی انسان ہیں؟ اور غریب بے چارے دنیا میں کہیں سے بہہ کر چلے آئے ہیں۔ بال بچوں کو لے کر گھر گریستی چلانے کا ارمان تو سب کے دل میں ہوتا ہے۔“

میں نے کہا..... ”تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ ان کے دل میں ارمان ہوتا ہے اسی لئے ان کے شہر ٹلنی چاہئے۔“

راج لکشمی نے کہا..... ”کیوں نہیں مجھے یہ سمجھا دو۔“

کچھ دیر خاموش رہ کر میں نے کہا..... ”سبھی غریبوں کے متعلق میرا ایک سا نظریہ نہیں۔ میرا یہ نظریہ صرف غریب اور شریف آدمیوں کے متعلق ہے اور میرا یقین ہے کہ تم اس کی وجہ بھی جانتی ہو؟“

راج لکشمی پر اصرار لہجہ میں بول اٹھی..... ”تمہارا یہ نظریہ غلط ہے۔“

مجھ پر بھی ایک ضد سوار ہو گئی میں نے کہا..... ہزار غلط ہونے پر بھی کم از کم تمہاری زبان سے تو یہ بات زیب نہیں دیتی۔ بنکو کے باپ نے صرف بہتر روپے کے لالچ میں تم دونوں بہنوں کی شادی کی تھی۔ وہ دن ابھی اتنا پرانا نہیں ہوا کہ تم بھول جاؤ۔ خیر سمجھو کہ اس کا پیشہ ہی یہ تھا لیکن اگر وہ تم کو اپنے گھر لے جاتا۔ تمہارے دو چار بال بچے ہوتے تو ایک بار سوچ دیکھو کہ تمہاری کیا حالت ہوتی؟“

راج لکشمی کی آنکھوں میں جھگڑنے کا جذبہ گھٹا ہوا اٹھا بولی..... ”جگوان! ہمیں اس دنیا میں بھیجتے ہیں ان کی غور و پرداخت بھی کرتے ہیں تم تو پر ماتما کی ہستی سے منکر ہو اس لیے یقین نہیں کرتے۔“

میں نے بھی جواب دیا..... ”میں پر ماتما کی ہستی سے منکر ہوں یا جو کچھ بھی ہوں لیکن کیا پر ماتما کی ہستی کے قائل لوگو جگوان کی ضرورت صرف اس لیے ہے؟..... ان سب بچوں کو آدمی بنانے کے لیے؟“

راج لکشمی غصے سے بولی..... ”بے شک ہی وہ نہ بنائیں لیکن میں تمہاری طرح ڈرپوک نہیں ہوں۔ میں در بدر بھیک مانگ کر بھی انہیں انسان بناتی۔ اور ایک نامور قاصد بننے کی نسبت یہ میرے حق

راج لکشمی بولی..... ”لیکن ایک بات انہوں نے مجھ سے پوشیدہ رکھی ہے ماں بننے کے لالچ کو وہ اپنے خط میں بار بار دبا گئی ہیں۔“

میں نے کہا..... ”کیا انہیں یہ لالچ ہے؟ کہاں؟ میں نے تو نہیں سنا؟“

راج لکشمی بول اٹھی۔ ”جاؤ..... یہ لالچ بھلا کس عورت کو نہیں ہے؟ لیکن اسی لیے اس کا ذکر مردوں سے کرتے پھرنا چاہئے؟ تم بھی خوب ہو؟“

میں نے کہا..... ”تو پھر تمہیں بھی ہے، کیوں؟“

”جاؤ“ کہہ کر وہ یکبارگی شرم و حیا سے سرخ ہو گئی اور دوسرے ہی لمحہ اپنے سرخ چہرہ کو چھپانے کے لیے بستر پر جھک گئی۔ اسی وقت غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی آخری شعاعوں نے مغرب کی طرف کھلی ہوئی کھڑکی سے جھانکا اور آن واحد میں اس کے بادلوں کی مانند کالے سیاہ بادلوں پر منتشر ہو گئیں اور کانوں کے ہیرے دونوں لٹکنوں میں کئی رنگوں میں جھل جھل کرتے ہوئے کھیلنے لگے۔ لمحہ بھر بعد اپنے آپ کو سنبھال کر اور سیدھے بیٹھ کر اس نے کہا..... ”کیوں، کیا میرے لڑکے بچے نہیں ہیں جو مجھے اس بات کا لالچ ہوگا؟ لڑکیوں کی شادی تو میں کر چکی ہوں۔ لڑکے کو بیاہنے آئی ہوں۔ ایک دو دوہتے پوتے ہو جائیں گے ان کے ساتھ آرام چین سے رہوں گی مجھے کسی کی بات کی ہے؟“

میں خاموش ہو رہا۔ اس بات پر مزید بحث کرنے کی خواہش نہ ہوئی۔ رات کو راج لکشمی نے کہا..... ”بنکو کی شادی میں تو اب بھی بارہ دن کی دیر ہے چلو ایک بار کاشی ہو آئیں۔ تمہیں اپنے گورو کو دکھلاؤں؟“

میں نے ہنس کر کہا..... ”میں کیا کوئی نمائشی شے ہوں؟“

راج لکشمی نے کہا..... ”یہ سوچنے کا بار جو لوگ دیکھتے ہیں ان پر ہے تم پر نہیں۔“

میں نے کہا..... ”یوں ہی سہی لیکن اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا اور تمہارے گورو کو بھی کیا فائدہ ہوگا؟“

راج لکشمی نے سنجیدہ ہو کر کہا..... ”فائدہ تم لوگوں کا نہیں ہے، لیکن مجھے ہے نہ ہو تو محض میرے لئے ہی چلے چلو۔“

اس لیے میں رضامند ہو گیا۔

پھر بہت دیر تک کوئی اچھی ساعت نہ تھی اس لیے اس وقت گویا چاروں طرف سے شادیوں کا ایک طوفان اٹھ پڑا۔ ہر وقت بیڈ، کارنٹ اور بیگ پائپ کی بانسری انسان کو پاگل بنا رہی تھی۔ ہم لوگوں کے نشیون جاتے وقت بھی اس طرح کی کچھ پاگل سی جھڑی فضا میں لگ گئی۔ جوش کے کچھ کم ہونے پر راج

راج لکشمی نے کہا..... ”لیکن ان کے گھر ماں ہوگی، بھائی ہوں گے، لڑکے بچے ہوں گے۔“
میں نے اس میں اتنا اور اضافہ کیا..... دو ایک بیوہ بنیں ہوں گی یہاں شادی کر یا کر کم،
وضع داری اور شرافت ہوگی۔ کلکتے کی رہائش اور خوراک کا خرچ ہوگا۔ مسلسل بیماریوں کا خرچ ہوگا۔ بنگالی
کلرک کی زندگی کا مکمل انحصار صرف ان ہی بیس روپوں پر ہوتا ہے۔“
راج لکشمی کی تو سانس ہی اٹکنے لگی وہ بے قرار ہو کر بول اٹھی..... ”تم نہیں جانتے لیکن یہ
ضروری ہے کہ ان لوگوں کے گھر زمین جائیداد بھی ہوگی۔“

اس کی شکل و صورت دیکھ کر اسے اور زیادہ مایوس کرتے ہوئے مجھے ایک کوفت سی ہوئی تاہم
مجھے کہنا ہی پڑا۔ میں ان لوگوں کے گھر یا رکھنا بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں اور میں بلا خوف و خطر
کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے نوے فیصدی لوگوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ نو کر پی چلی جائے تو یا تو
انہیں بھیک مانگنے پر مجبور ہونا پڑے گا یا پھر سب گھر والوں کے ساتھ فاقہ کرنا ہوگا۔ ان لوگوں کے لڑکے
لڑکیوں کی کہانی سنو گی؟“
راج لکشمی اچانک دونوں ہاتھ اٹھا کر چلا اٹھی..... ”نہیں نہیں، سنوں گی۔ میں سننا نہیں

چاہتی۔“

یہ بات میں اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ اس نے بمشکل تمام اپنے آنسوؤں
کو ضبط کر رکھا ہے۔ اس لیے میں نے اور زیادہ نہ کہہ کر پھر راستے کی طرف منہ موڑ لیا۔ بہت دیر تک اس
کی کچھ آہٹ نہ ملی۔ اتنی دیر تک شاید اپنے آپ سے جرح کر کے اور آخر کار اپنی بے تابی سے مغلوب ہو
کر اس نے میرے کوٹ کا کنارہ پکڑ کر کھینچا اور پلٹ کر دیکھتے ہی دروازہ لہجہ میں کہا..... ”اچھا تو کہو ان
کے لڑکے لڑکیوں کی کہانی، لیکن تمہارے پاؤں پڑتی ہوں جھوٹ موٹ مبالغہ آمیزی سے کام نہ لینا۔ دو
ہائی ہے تمہاری۔“

اس کی منت سماجت کا رویہ دیکھ کر مجھے ہنسی تو آئی لیکن میں ہنسا نہیں۔ بلکہ کچھ زیادہ خنجیدگی
سے کہا..... ”مبالغہ آمیزی سے کام لینا تو دور رہا میں تمہارے دریافت کرنے پر بھی اس قصے کو کبھی نہ
دہراتا اگر تم نے ابھی کچھ لمحے پیشتر اپنے متعلق بھیک مانگ کر بچوں کو انسان بنانے کا دعویٰ نہ کیا ہوتا۔
بھگوان جنہیں اس دنیا میں بھیجتے ہیں ان کا معقول انتظام بھی کرتے ہیں۔ یہ بات درست ہے اسے
نامنظور کروں تو شاید پر ماتما کی ہستی سے منکر کہہ کر پھر بھلا برا کہو گی لیکن اولاد کی ذمہ داری اور جوابدہی
باپ پر کتنی ہے ان دونوں کے متعلق تم خود فیصلہ کر لو۔ میں جو کچھ جانتا ہوں صرف وہی کہوں گا کیوں ہے
ناٹھیک؟“

میں بہت اچھا ہوتا۔“

میں نے پھر کوئی اعتراض نہ کیا۔ بحث بالکل ہی ذاتیات پر آ کر تنگی کی شکل اختیار کی چکی تھی۔
اس لیے میں کھڑکی کے باہر راستے کی طرف دیکھتا ہوا بیٹھا رہا۔ رفتہ رفتہ ہماری گاڑی سرکاری اور غیر
سرکاری دفاتر چھوڑ کر دور نکل گئی۔

سنچر کا دن تھا۔ دو بجے کے بعد بیشتر دفاتروں کے کلرک چھٹی پا کر ڈھائی کی ٹرین پکڑنے کے
لیے تیزی سے چلے آ رہے تھے۔ عموماً ہر ایک کے ساتھ کچھ نہ کچھ کھانے کا سامان تھا۔ کسی کے ہاتھ میں
ایک دو بڑی مچھلیاں، کسی کے رومال میں بکرے کا گوشت کسی کے ہاتھ میں گاؤں میں نہ ملنے والی سبز
ترکاریاں اور پھل، سات دنوں بعد گھر پہنچ کر بے تاب بال بچوں کے چروں پر مسرت کی ذرا سی ہنسی
دیکھنے کے لیے تقریباً تقریباً سب اپنی توفیق کے مطابق کم و بیش مٹھائی چادر کے چلو میں باندھ کر بھاگے
جارہے تھے۔ ہر ایک کے چروں خوشی اور ٹرین پکڑنے کا اضطراب اس طرح ظاہر ہو رہا تھا کہ راج لکشمی
نے میرا ہاتھ کھینچ کر نہایت بے تابانہ لہجہ میں پوچھا..... ”ہاں جی، یہ سب لوگ اس طرح ٹینشن کی طرف
کیوں بھاگ جا رہے ہیں؟ آج کیا؟“

میں نے گھر کر کہا..... ”آج سنچر ہے اور یہ سب دفاتروں کے کلرک ہیں۔ اتوار کی چھٹی
میں گھر جا رہے ہیں۔“

راج لکشمی نے گردن ہلا کر کہا..... ”ہاں، یہی معلوم ہوتا ہے اور دیکھو ہر ایک کھانے کی کوئی نہ
کوئی شے لیے جا رہا ہے۔ دیہات میں تو یہ سب ملتا نہیں، اس لیے معلوم ہوتا ہے بال بچوں کے ہاتھ
میں دینے کے لیے خریدے لیے جاتے ہیں، کیوں نا؟“
میں نے کہا..... ”ہاں“

اس کا تخیل، تیزی سے دوڑنے لگا۔ اس لئے اس نے اسی لہجہ کہا..... ”ان کے لڑکے لڑکیوں
میں آج کتنی خوشی ہوگی۔ شور و غل مچائیں گے گلے میں لپیٹ کر باپ کی گود میں چڑھنے کی کوشش
کریں گے۔ ماں کو اطلاع دینے کے لیے رسوائی گھر دوڑے جائیں گے..... گھر گھر میں گویا آج ایک
جشن ہوگا۔ کیوں نا؟ کہتے کہتے اس کا چہرہ روشن ہوا تھا۔

میں نے تسلیم کرتے ہوئے کہا..... ”عین ممکن ہے۔“

راج لکشمی نے گاڑی کی کھڑکی میں اور بھی کچھ دیر ان کی طرف دیکھتے رہ کر یکا یک ایک
طویل آہ بھری اور کہا..... ”ہاں جی! ان کی تنخواہ کتنی ہوگی؟“

میں نے کہا..... ”کلرکوں کی تنخواہ اور کتنی ہوتی ہے۔ یہی بیس پچیس تیس روپے۔“

یہ دیکھ کر وہ چپ چاپ میری طرف عقیدت سے دیکھ رہی ہے میں نے کہا شروع کیا۔
”بچے کی پیدائش پر کچھ دن تک زندہ رکھنے کا بار میری رائے میں اس کی ماں پر ضرور ہوتا ہے۔ بھگوان پر
مجھے اہل اعتقاد ہے ان کی رحمت کا بھی قائل ہوں لیکن اس کے باوجود بھی ماں کی بجائے اس بار کو خود اپنے
اوپر لینے کا طریقہ ان کے پاس ہے یا نہیں۔“

راج لکشمی ناراض ہو کر ہنسی پڑی اور بولی۔ ”دیکھو چالاکی رہنے دو۔۔۔۔۔۔ یہ بات بھی میں
جانتی ہوں۔“

”جانتی ہو؟ پھر تو جانے دو۔ ایک مشکل تو آسان ہو گئی۔ لیکن تیس روپے ماہوار کے گھر کی
ماں کے دودھ کا چشہ اتنی جلدی خشک کیوں ہو جاتا ہے۔ یہ جاننے کی خواہش ہو تو کسی تیس روپے ماہوار
کے گھر کی زچہ کے کھانے کے وقت حاضر رہنا ضروری ہو گا مگر تم سے جب یہ ممکن نہیں تو اس معاملہ میں
میری ہی بات تسلیم کر لو۔“

راج لکشمی اداس چہرے سے میری طرف تاکتی رہی۔
میں نے کہا۔ ”دیہات میں گائے کے دودھ کی نہایت ہی قلت ہے۔ اس بات کو بھی تمہیں
تسلیم کرنا پڑے گا۔“

راج لکشمی نے فوراً ہی کہا۔ ”یہ تو میں خود بھی جانتی ہوں گھر میں گائے ہو تو خیر ورنہ آج کل
سر پٹک کر مر جانے پر بھی کسی گاؤں میں ایک بوند دودھ ملنا مشکل ہے۔ مولیٰ نہیں ہیں دودھ کہاں سے
آئے؟“

میں نے کہا۔ ”بہتر، چلو اور بھی ایک بات کا حل ہو گیا۔ تو پھر بچوں کی قسمت میں رہ گیا
خالص ہندوستانی کنوؤں اور تالاہوں کا پانی اور بدیشی ڈبوں میں خالص بارے (جو) کا چورا۔ بد نصیبوں
کی قسمت میں اکثر ان کی قدرتی غذا۔۔۔۔۔۔ کم و بیش ماں کا دودھ بھی مہیا ہو سکتا ہے لیکن وہ بھی ان تمام
گھروں میں بہت دن قائم رہنے کا دستور نہیں کیونکہ چار ایک مہینے کے اندر ہی اور ایک نیا اجنبی اپنی آمد کا
نوشہ دے کر اپنے بھائی کے دودھ کا حق یک قلم بند کر دیتا ہے یہ شاید تم۔“

راج لکشمی حیا کے مارے سرخ ہو کر بول اٹھی۔ ”ہاں ہاں، جانتی ہوں، جانتی ہوں بشرط
کر کے مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اس کے بعد کی بات کہو۔“

میں نے کہا۔ ”اس کے بعد سودیشی ملیں اور پیت کا وردہ بچے کا دھردلاتا ہے اس وقت
باپ کا فرض ہوتا ہے ولایتی کو مین اور بارے کا چورا مہیا کرنا اور ماں کے سر پر پڑتا ہے جیسا میں پہلے ہی
کہہ چکا ہوں دوبارہ زچہ خانہ میں داخل ہونے کے درمیانی وقت کی فرصت میں ان دونوں کو خالص

دھنسی پانی میں گھول کر پلانے کا کام۔ اس کے بعد مناسب وقت پر زچہ خانہ کا بھگڑا ختم ہونے پر نو خیز بچے
کو گود میں لے کر باہر آنا اور پہلے بچے کے لیے کچھ دن تک رونا۔“

راج لکشمی نیلی پڑ کر بولی۔ ”رونا کیوں؟“
میں نے کہا ”ارے یہ تو ماں کی فطرت ہے اور اس فطرت کا مظاہرہ ایک کلرک کے گھر میں بھی
اس وقت ہوتا ہے جب بھگوان ماں اور باپ دونوں کو ان کی ذمہ داریوں سے نجات دلا کر پہلے بچے کو
اپنے قدموں میں بلا لیتے ہیں۔“
”ہائے رے۔“

اتنی دیر تک باہر کی طرف دیکھتے ہوئے باتیں کر رہا تھا۔ ذہن نظر گھا کر دیکھا کہ اس کی بڑی
بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کا پانی تیر رہا ہے۔ مجھے صدمہ ہوا۔ سوچا اس بے چاری کو فضول ہی دکھ دینے
سے کیا حاصل؟ بیشتر امیروں کی مانند کائنات کے اس عظیم دکھ کی بات اگر اس کے لیے بھی نامعلوم بنی
رہتی تو کیا نقصان تھا؟ ”ہیبت ناک مفلسی اور غربت سے پامال بنگال کے نادار ملازمت پیشہ گھر گھرانے
محض اناج کی قلت سے ہی طیر یا ہیضہ وغیرہ کے بہانے آئے دن ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ بات دیگر
بہت سے امیر لوگوں کی طرح یہ بھی جانتی اس سے کون سا بڑا نقصان ہو جاتا۔“

عین اسی وقت راج لکشمی آنکھیں پونچھتے ہوئے دردناک لہجہ میں بول اٹھی۔ ”خواہ وہ
کلرک ہوں لیکن وہ تم سے کئی درجہ اچھے ہیں تم تو پتھر ہو تمہیں خود کوئی تکلیف نہیں ہے اس لیے ان لوگوں
کے دکھ درد کی کہانی اس طرح لطف لے لے کر بیان کر رہے ہوں۔ میرا تو دل پھٹا جاتا ہے۔“
یہ کہہ کر وہ آنچل سے بار بار آنکھیں پونچھنے لگی۔ میں نے کوئی مخالفت نہ کی کیونکہ اس سے
کچھ حاصل نہ ہوتا بلکہ نرمی کے ساتھ کہا۔ ”ان لوگوں کی مسرت کا حصہ بھی تو میری قسمت میں نہیں
ہے۔ گھر پہنچنے کے لیے ان کا اضطراب اور خوشی بھی تو میرے لیے ایک خواب کی طرح ہے۔“

راج لکشمی کا چہرہ ہنسی اور آنسو دونوں کے ساتھ یک وقت تھما اٹھا وہ بولی۔ ”میں بھی تو
یہی کہتی ہوں۔ آج جتا آرہے ہیں۔ اس لیے تمام بال بچے راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ انہیں تکلیف کس
بات کی ہے۔ ان لوگوں کی تنخواہ شاید کم ہو کیونکہ خاص بابو گیری بھی نہیں ہے لیکن پھر بھی کیا پچیس تین ہی
روپیہ، اتنا کم؟ کبھی نہیں کم از کم سو ڈیڑھ سو روپے تو ہوں گے میں یقین سے کہہ سکتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”ممکن ہے میں شاید ٹھیک ٹھیک نہیں جانتا۔“
جرات پا کر راج لکشمی کا اناج بڑھ گیا۔ نہایت ادنیٰ کلرک کے لیے بھی ذریعہ سو روپیہ ات
مناسب معلوم نہ ہوا بولی۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ صرف اسی ماہوار تنخواہ پر ہی ان کا تمام دار و دار ہے؟ اوپ

سے بھی کتنا ہی کمالیتے ہیں۔“

میں نے کہا ”اوپر سے؟ پیالہ؟“

اب اس نے کچھ نہ کہا..... وہ منہ بھاری کر کے راستے کی طرف بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد باہر کی طرف دیکھتے ہوئے ہی کہا..... ”تمہیں جتنا ہی دیکھتی ہوں میرا دل تمہاری طرف سے اتنا ہی دور ہٹتا جاتا ہے تم جانتے ہو کہ تمہیں چھوڑ کر میری اور کوئی کمزوری نہیں ہے۔ اس لئے تم مجھے اس قدر چھیدتے ہو!“ اتنے دنوں بعد، آج شاید پہلے ہی پہل میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنی طرف کھینچ لیے اور اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر گویا کچھ کہنا بھی چاہا۔ اتنے میں ہی گاڑی سٹیشن کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی ایک علیحدہ ڈبہ ریز رو کر الیا گیا تھا پھر بھی بنکوا احتیاطاً کچھ سامان لے کر دوپہر سے پہلے ہی آ گیا تھا۔ کوچ بکس پر رتن کو دیکھتے ہی وہ دوڑ آیا۔ میں ہاتھ چھوڑ کر سیدھا بیٹھ گیا۔ جو بات منہ پر آ گئی تھی وہ چپ چاپ اندر جا کر چھپ گئی۔

ڈھائی بجے کی لوکل ٹرین چھوٹنے ہی کو تھی۔ ہماری ٹرین اس کے بعد جاتی تھی۔ اس وقت ایک ادھیڑ عمر کا نادار اور شریف انسان ایک ہاتھ میں قسم قسم کی سبز ترکاریوں کی پوٹلی اور دوسرے ہاتھ میں ڈنڈی پر بیٹھا ہوا ایک مٹی کا پرندہ لئے صرف پلیٹ فارم پر نظریں جما کر اور سب طرف سے لا پرواہ ہو کر دوڑتا ہوا راج لکشمی پر آ کر۔ مٹی کا کھلونا نیچے کر کر چور چور ہو گیا۔ وہ ہائے ہائے کر کے شاید اسے اکٹھا کر رہا تھا کہ پاؤں لے جی نے لکار کر ایک چھلانگ میں اس کی گردن دھردبائی اور بنکو چھڑی اٹھا کر اندھے وغیرہ کہہ کر مارنے کو تیار ہو گیا۔ میں کچھ دور محسوس کر رہا تھا گھبرا کر وہاں آیا وہ بے چارہ خوف اور ندامت کے مارے بار بار کہنے لگا..... ”دیکھ نہیں سکا ماں مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی.....“

میں نے فوراً اس کو چھڑا دیا اور کہا..... ”جو ہونا تھا ہو گیا، آپ جلدی جائیے آپ کی گاڑی چھوٹ رہی ہے۔“

اس بے چارے نے پھر بھی اپنے کھلونے کے ٹکڑے ٹکڑے اکٹھا کرنے کے لیے کچھ دیر پس و پیش کیا اور آخر کار دروازے پر گاڑی چل دی تو لوٹ کر پھر اس نے ایک دفعہ معافی مانگی۔ اور وہ ان ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جمع کرنے میں لگ گیا۔ یہ دیکھ کر میں نے ذرا ہنس کر کہا..... ”اس سے اب کیا ہوگا؟“

اس نے کہا..... ”کچھ نہیں صاحب! لڑکی بیمار ہے، گذشتہ سوموار گھر سے آئے وقت اس نے کہہ دیا میرے لیے، ایک کھلونا خرید لانا، خریدنے گیا تو بچہ نے غرض سمجھ کر دام بتائے دو آنے، ایک پیسہ بھی کم نہیں۔ خیر وہی سہی۔ رام رام کر کے کسی طرح پورے آنے پیسے پھینک کر لے آیا لیکن دیکھیے شوخی

تقدیر کو ایسے موقع پر پھوٹ گیا۔ بیمار بچی کے ہاتھ میں بھی نہ دے سکا۔ بیٹا رو کر کہے گی، بابا! اے نہیں، کچھ بھی ہو ٹکڑے ہی لے جاؤں دکھا کر کہوں گا۔ بیٹی اس مہینے کی تنخواہ ملنے پر پہلے تیرا کھلونا خریدوں گا پھر کوئی اور کام کروں گا۔“

اتنا کہہ کر تمام ٹکڑے اکٹھے کر کے اور چادر کے پلے میں باندھ کر کہنے لگا۔ ”آپ کی بیوی کو شاید بہت چوٹ لگ گئی ہے میں نے دیکھا نہیں..... نقصان کا نقصان ہوا اور گاڑی بھی نملی۔ مل جاتی تو بیماری بچی کو آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ کر دیکھ لیتا۔“

کہتے کہتے وہ پلیٹ فارم کی طرف چل دیا۔ بنکو پاؤں لے جی کو لے کر کسی کام سے کہیں اور چلا گیا تھا میں نے ایک بیک پیچھے کی طرف گھوم کر دیکھا۔ راج لکشمی کی آنکھوں سے سادون کی جھڑی کی مانند آنسو بہہ رہے ہیں۔ بے قرار ہو کر قریب جا کر پوچھا..... ”زیادہ چوٹ آ گئی ہے کیا؟ کہاں لگی ہے؟“

راج لکشمی نے آنچل سے آنکھیں پونچھ کر کہا..... ”ہاں بہت چوٹ لگی ہے۔ لیکن لگی ہے ایک ایسی جگہ کہ تم جیسے پھر نہ اسے دیکھ سکتے ہیں اور نہ محسوس کر سکتے ہیں۔“

☆☆☆

شریمان بنکو کو مجبور ہو کر ہمارے لیے ایک علیحدہ ڈبہ کیوں مخصوص کرانا پڑا۔ اس سے جب اس بات کی پوچھتاچھ کر رہا تھا تو راج لکشمی کان لگا کر سن رہی تھی۔ اس وقت اس کے ذرا علیحدہ ہوتے ہی راج لکشمی نے بالکل ہی گلے پڑ کر مجھے سنا دیا کہ اپنے لیے فضول خرچ کرنا وہ جتنا ہی ناپسند کرتی ہے اس کی تقدیر سے اتنا ہی عذاب نازل ہوتا ہے۔ وہ بولی ”اگر لوگوں کی تسلی سینڈ کلاس پر فرسٹ کلاس میں جانے سے ہی ہوتی ہے تو ٹھیک ہے لیکن میرے لیے تو عورتوں کا ڈبہ تھا۔ ریلوے کمپنی کو اتنے زیادہ روپے بیکار ہی کیوں دیئے جائیں؟“

بنکو کی کیفیت کے ساتھ اس کی ماں کی اس فضول خرچی کی مخالفت کا میں کوئی خاص تعلق نہ دیکھ سکا لیکن ایسی باتیں عورتوں سے کہنے میں فضول جھگڑا ہوتا ہے اس لیے میں چپ چاپ صرف سنتا رہا کچھ بولا نہیں۔

پلیٹ فارم کے ایک بچہ پر وہی صاحب ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے دریافت کیا..... ”آپ کہاں جائیں گے؟“

وہ بولے..... ”برزدوان“

کچھ آگے جاتے ہی راج لکشمی نے مجھ سے آہستہ سے کہا..... ”پھر تو اپنے ہی ڈبے میں چل

سکتے ہیں نا؟ کرایہ تو دینا نہ ہوگا۔ انہیں بلا کیوں نہیں لیتے؟“

میں نے کہا..... ”نکٹ تو لازمی طور پر خرید لیا گیا ہے۔ کرائے کے پیسے نہیں بچیں گے۔“
راج لکشمی بولی..... ”بے شک خرید لیا ہو۔ بھڑکی تکلیف سے تو بچ جائیں گے۔“ میں نے
کہا..... ”انہیں عادت ہے۔ یہ بھڑکی تکلیف کی پرواہ نہیں کرتے۔“ راج لکشمی نے ضد کر کے کہا.....
”نہیں نہیں تم ان سے کہو۔ ہم تینوں بات چیت کرتے ہوئے جائیں گے۔ اتنا سفر مزے سے کٹ جائے
گا۔“

میں نے سمجھ لیا کہ اس وقت اسے اپنی غلط محسوس ہو رہی ہے۔ بنکو اور اپنے نوکر چار کروں کی
نظر میں میرے ساتھ اکیلی علیحدہ ڈبے میں سفر کرنے کی کک کو وہ کسی طرح کچھ ہلکا کر لینا چاہتی ہے۔
تاہم میں نے اس کو اور بھی زیادہ آنکھوں میں انگلی ڈال کر دکھانے کے ارادہ سے لا پرواہی کے ساتھ
کہا..... ”ضرورت کیا ہے ایک غیر ضروری آدمی کو ڈبے میں بلانے کی؟ تم میرے ساتھ جتنی چاہو اتنی
زیادہ باتیں کر لینا۔ وقت خوب مزے سے کٹ جائے گا۔“

راج لکشمی نے مجھ پر ایک نگاہ غلط انداز پھینک کر کہا ”یہ میں جانتی ہوں مجھے تنگ کرنے کا اتنا
بڑا موقعہ کیا تم چھوڑ سکتے ہو؟“

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو رہی لیکن ٹرین کے نشیمن پر آتے ہی میں نے جا کر کہا..... ”آپ
کیوں نہ ہمارے ہی ڈبے میں بیٹھ جائیں۔ ہم دو کو چھوڑ کر اس میں اور کوئی نہیں ہے۔ آپ بھڑکی تکلیف
سے بچ جائیں گے۔“

کہنے کی ضرورت نہیں کہ انہیں رضامند کرنے میں کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑی۔ اصرار کرنے کی
دیر تھی کہ وہ اپنی پوٹلی لے کر ہمارے ڈبے میں آ بیٹھے۔

ٹرین ابھی دو چار نشیمن ہی پار ہوئی تھی کہ راج لکشمی نے ان کے ساتھ خوب اچھی طرح بات
چیت کرنا شروع کر دیا اور کچھ اور نشیمنوں کو پار کرتے کرتے تو ان کے گھر کی خبریں، محلے کی خبریں حتیٰ کہ
قریب جوار کے گاؤں تک کی خبریں کرید کرید کر معلوم کر لیں۔

راج لکشمی کے گورو دیوا اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ کاشی میں رہتے تھے۔ ان کے لیے وہ
ملکت سے بے شمار چیزیں لئے جا رہی تھی۔ بردوان کے نزدیک آتے ہی ٹرین کھول کر اس نے اس میں
سے چن کر ایک سبز رنگ کی ریشمی ساڑھی باہر نکالی اور کہا..... ”سرا کو اس کے کھلونے کے بدلے میں یہ
ساڑھی دے دینا۔“

وہ صاحب پہلے تو حیران ہو گئے پھر شرم آمیز لہجہ میں جلدی جلدی بولے۔ ”نہیں نہیں بیٹی۔

سرا کو میں اب کی دفعہ کھلونا خرید دوں گا۔ آپ ساڑھی رہنے دی اس کے علاوہ یہ تو بہت بیش قیمت کپڑا
ہے بیٹی۔“

راج لکشمی نے کپڑے کو ان کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔ ”بیش قیمت کی بات نہیں اور قیمت
کچھ بھی ہو اس کو اس کے ہاتھ میں دے کر کہیں گے کہ تمہاری موسیٰ نے اچھے ہونے پر پہننے کے لیے دیا
ہے۔“

اس کی آنکھیں چھپلا آئیں۔ آدھ گھنٹے کی بات چیت میں ہی ایک اجنبی انسان کی بیمار لڑکی
کو ایک بیش قیمت شے کا تحفہ دینا انہوں نے شاید اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کہا عادت تھی کہ
وہ اچھی ہو جائے لیکن غریب کے گھر اتنے قیمتی کپڑے کو وہ کیا کرے گی بیٹی؟ آپ اسے اٹھا کر رکھ
لیجئے۔“ اتنا کہہ کر انہوں نے میری طرف بھی ایک دفعہ دیکھا۔ میں نے کہا..... ”جب اس کی موسیٰ پہننے
کے لیے دے رہی ہے تو آپ کو لے جانا ہی مناسب ہے۔“ پھر فس کر کہا..... ”سرا کا نصیب اچھا ہے۔
ہم لوگوں کی بھی کوئی موسیٰ وغیرہ ہوتی تو بڑی سہولت رہتی۔ اب کی بار صاحب آپ دیکھیں گے کہ آپ
کی لڑکی جھٹ پٹ اچھی ہو جائے گی۔“

اس وقت اس انسان کے تمام چہرے پر احسان مندی کے آثار ہو رہے تھے۔ اور مزید انکار کئے
بغیر اس نے کپڑے کو لے لیا۔ اب دونوں میں پھر بات چیت ہونے لگی۔ خانہ داری کی باتیں۔ سوسائٹی
کی باتیں، سکھ دکھ کی باتیں اور نامعلوم کیا کیا۔ میں صرف کھڑکی کے باہر تکتا ہوا خاموش ہو کر بیٹھا رہا اور
جو سوال اپنے آپ سے بہت بار پوچھ چکا تھا وہی اس چھوٹے سے واقعہ کے سلسلہ میں ایک بار پھر
میرے دل میں اٹھ کھڑا ہوا کہ اس سفر کی منزل کہاں ہے؟

ایک دس بارہ روپے کی قیمت کا کپڑا ان کو دینا راج لکشمی کے لیے مشکل بات نہیں تھی اس
کے نوکر چا کر شاید اس بات کا کبھی خیال بھی نہیں کرتے لیکن میری تشویش دوسری ہی قسم کی تھی میں جانتا
تھا کہ دان کے لحاظ سے یہ شے اس کے لیے کچھ نہیں لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اس کے دل کا بہاؤ جس
مقصد کو پیش نظر رکھ کر اپنے آپ کو ختم کر دینے کے لیے نہایت تیز رفتار سے دوڑ جا رہا ہے اس کا خاتمہ
کہاں ہوگا اور کس طرح؟

تمام عورتوں کے دل میں، عورت موجود رہتی ہے یا نہیں اس بات کو دعویٰ سے کہنا نہایت
مشکل بات ہے مگر نسائیت کا معراج ماں میں ہے۔ اور یہ بات شاید خوب زور شور سے نشر کی جاسکتی ہے
راج لکشمی کو میں نے پہچان لیا تھا۔ میں نے خاص طور پر دیکھا تھا کہ اس کے اندر کی پیاری بانی، اپنے
شاب کی پرفریب رنگینیوں اور دلآویز کیفیتوں کے ساتھ ہی محض مر رہی ہے۔ آج اس نام کا ذکر سن

بھی وہ گویا شرم و حیا کے مارے مٹی میں مل جاتی ہے۔ میرے لیے معہ تو یہی تھا۔

دنیا کی تمام وکمال لذت سے لطف اندوز ہونے کی وہ تڑپ اب راج کشمی میں نہ تھی۔ آج وہ مطمئن اور پرسکون ہے۔ اس کی خواہشات اسی کے درمیان اس طرح غوطہ زن ہو گئی ہیں کہ بظاہر دیکھنے پر یکا یک یہ شب ہوتا ہے کہ وہ ہیں بھی یا نہیں۔

اسی ایک شے نے اس معمولی واقعہ سے متاثر ہو کر مجھے ایک بار پھر یاد دلایا کہ آج اس کے شباب کی بے پناہ گہرائیوں کی سطح سے جو مادری جذبہ یک بیک بیدار ہوا تھا ہے حال ہی میں جاگے ہوئے کبھ کر کی مانند اس کی لانا ہٹا بھوک کے لیے خوراک کہاں سے ملے گی؟ اس کی اپنی اولاد ہونے پر جو بات آسان اور قدرتی ہو سکتی تھی اس کے عدم وجود میں یہ مسئلہ اور بھی زیادہ پیچیدہ ہوا تھا ہے۔

☆☆☆

اس دن پٹنے میں اس کے جس مادر جذبہ کو دیکھ کر میں شفیقہ اور فریفتہ ہوا تھا تھا آج اسی شکل و صورت کا تصور کر کے درد و اضطراب کے ساتھ میں یہی سوچنے لگا کہ اتنی بڑی آگ کو پھونک مار کر بجھایا نہیں جاسکتا۔ اس لئے آج غیر کے لڑکے کو بیٹا تصور کرنے کی کھیل کود میں راج کشمی کے دل کی پیاس کسی طرح بھی مٹ نہیں رہی ہے۔ آج محض اکیلا بنکویں اس کے لئے کافی نہیں ہے۔ آج دنیا میں جتنے بھی لڑکے ہیں ان سب کا سکھ دکھ بھی اس کے دل پر اثر انداز ہو رہا ہے۔

برددان میں وہ صاحب اثر گئے۔ راج کشمی خاموش بیٹھی رہی۔ میں نے کھڑکی کی طرف سے نظر ہٹا کر پوچھا۔ ”یہ روٹا کس کے لئے ہوا؟ سرلا کے لئے یا اس کی ماں کے لئے؟“

راج کشمی نے منہ اٹھا کر کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے تم اتنی دیر تک ہم لوگوں کی بات چیت سن رہے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”یوں ہی بلا ارادہ خود کوئی بات نہ کرنے کے باوجود بھی بہت سی باتیں آدمی کے کانوں آگھتی ہیں۔ دنیا میں کم لوگوں کے لئے یہ سزا تجویز کر رکھی ہے۔ اس سے بچنے کا کوئی چارہ نہیں لیکن آنکھوں کا پانی کس کے لئے بہا یہ تو آپ نے بتایا نہیں؟“

راج کشمی نے کہا۔ ”میری آنکھوں کا پانی کس کے لئے بہتا ہے یہ جاننے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں۔“

میں نے جواب دیا۔ ”فائدہ کی امید نہیں رکھتا صرف نقصان سے بچ کر ہی چلا جائے تو کافی ہے۔ سرلا اور اس کی ماں کے لئے جتنی بھی خواہش ہو آنسو بہاؤ مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اس کے باپ کے لئے آنسو بہانے کو میں پسند نہیں کرتا۔“

راج کشمی صرف ایک ”ہوں“ کہہ کر کھڑکی کے باہر جھانکنے لگی۔

سوچا تھا کہ یہ دل لگی رانیکاں نہیں جائے گی۔ ان کے روندھے ہوئے جھرنوں کا منہ کھول دے گی لیکن یہ نہ ہوا یہ کہ اب تک وہ اس طرف دیکھ رہی تھی دل لگی سن کر اس طرف منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ میں بہت دیر سے خاموش تھا۔ گفتگو کا سلسلہ شروع کرنے کے لئے میرے اندر ایک کشش جاری تھی اس لئے مزید خاموش نہ رہ سکا اور کہا۔ ”برددان سے کھانے پینے کو کچھ خرید لیا ہوتا۔“

راج کشمی نے کوئی جواب نہ دیا وہ بدستور چپ رہی۔

میں نے کہا۔ ”اور کے دکھ ہیں رو رو کر ندی بہادی اور گھر کے دکھ پر کان ہی نہیں دیتیں۔ ولایت سے واپس آئے ہوؤں کی یہ تعلیم کہاں سے سیکھی؟“

راج کشمی نے اس مرتبہ آہستہ سے کہا۔ ”دیکھتی ہوں کہ ولایت سے واپس لوٹے ہوؤں پر تمہاری خاص نظر التفات ہے؟“

”ہاں وہ لوگ احترام کے قابل جو ہیں؟“

”کیوں، انہوں نے تمہارا کیا کیا کیا ہے؟“

”ابھی تک تو کچھ نہیں بگاڑا لیکن بعد میں کچھ بگاڑ نہ دیں اس خوف سے پہلے ہی ان کی پرستش کر رہا ہوں۔“

راج کشمی نے لمحہ بھر خاموش رہ کر کہا۔ ”یہ تم لوگوں کی سراسر زیادتی ہے۔“

تم لوگوں نے انہیں اپنے گروہ سے اپنی ذات سے سماج سے سب طرف سے علیحدہ کر رکھا ہے۔ پھر بھی اگر وہ لوگ تمہارے لئے تھوڑا سا بھی کچھ کرتے ہیں تو اس کے لئے بھی تمہیں ان کا ممنون ہونا چاہئے۔“

میں نے کہا۔ ”ہم لوگ بہت زیادہ ممنون ہوتے اگر وہ اس مخالفت کی بنا پر مکمل طور پر بیسائی یا مسلمان ہو جاتے۔ ان لوگوں میں جو اپنے آپ کو برہمن کہتے ہیں وہ برہمنو سائی کو تباہ کرتے ہیں جو ہندو کہتے ہیں وہ ہندو سماج کو حیران کرتے ہیں اگر وہ پہلے یہ فیصلہ کر کے کہ وہ خود کون ہیں اور دوسرے کے لئے روٹے بیٹھے تو اس سے خود ان کا بھلا ہوتا اور جن کے لئے روٹے ہیں ان کی بھی شاید کچھ بھلائی ہو جاتی۔“

راج کشمی بولی۔ ”لیکن مجھے تو ایسا معلوم نہیں ہوتا۔“

میں نے جواب دیا۔ ”معلوم نہیں ہوتا تو کوئی خاص نقصان نہیں لیکن جس کے لئے اس وقت رکا ہوا ہوں وہ دوسری بات ہے۔ اس کا تو کچھ جواب ہی نہیں ملا؟“ اس مرتبہ راج کشمی نے ہنس کر کہا۔ ”اجی اس کے لئے رکنا ہی پڑے گا۔ پہلے تمہاری بھوک تو پک جائے اس کے بعد غور کیا جائے گا۔“

سے کھانا خراب ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں اپنے ہاتھ سے کھانا نہ دیتی۔“

”لیکن تم نے خود کیوں نہیں کھایا؟“

”عورتوں کو نہیں کھانا چاہئے۔“

”کیوں؟“

”کیوں اور کیا؟ عورتوں کو کھانے کی ممانعت ہے۔“

”لیکن مردوں کے لئے ممانعت نہیں ہے؟“

راج لکشمی نے میرا سر ہلا کر کہا..... ”نہیں، مردوں کے لئے یہ آئین قانون نہیں وہ جو چاہیں کھائیں جس طرح بھی آرام سے رہیں اور ہم لوگ اخلاق کی پابندیوں میں قید رہیں بس یہی بہت ہے۔ ہم تو سینکڑوں مصیبتیں برداشت کر سکتی ہیں لیکن تم لوگ بھی ایسا کر سکتے ہو؟ یہی دیکھو کہ سر شام ہی بھوک کی شدت سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا دیکھنے لگے تھے۔“

میں نے کہا..... ”ممکن ہے لیکن اگر ہم مصیبتیں برداشت نہیں کر سکتے تو یہ ہمارے لئے فخر کی بات نہیں۔“

راج لکشمی نے سر ہلا کر کہا..... ”نہیں ایسا نہیں۔ تم ہماری طرح غلام نسل سے نہیں ہو کہ مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کرتے پھرو۔ شرم کی بات تو ہمارے لئے ہے اگر ہم تکلیف برداشت نہ کر سکیں۔“

میں نے کہا..... ”انصاف کا یہ سبق تمہیں کس نے سکھایا؟ کاشی کے گورو جی نے؟“

راج لکشمی میرے منہ کے نہایت نزدیک جھک کر چپ رہی پھر مسکرا کر بولی۔ مجھے جو بھی تعلیم ملی ہے وہ سب تمہارے ہی نزدیک..... تم سے بڑھ کر میرا اور کوئی گورو نہیں۔“

میں نے کہا..... ”تو پھر تم نے گورو سے بالکل الٹ بات سیکھ رکھی ہے۔ میں نے کسی دن تمہیں کہا کہ تم غلام نسل کی ہو۔ بلکہ میں تو یہی بات ہمیشہ سے مانتا ہوں کہ تم غلام نہیں ہو تم کسی طرح بھی ہم لوگوں کی نسبت جو پھر بھی حقیر نہیں ہو۔“

راج لکشمی کی آنکھیں چھلچھلا آئیں بولی..... ”یہ میں جانتی ہوں اور جانتی ہوں، اس لئے تو یہ بات تم سے سیکھی ہوں۔ تمہاری طرح ہی اگر تمام مرد یہ بات سوچ سکتے تو پھر روئے زمین کی تمام عورتوں کی زبان سے یہی سن پڑتی۔ کون بڑا ہے اور کون چھوٹا یہ بحث بھی کبھی پیدا نہ ہوتی۔“

”یعنی اس حقیقت کو بلا روک ٹوک سب تسلیم کر لیتے؟“

راج لکشمی بولی..... ”ہاں“

تب میں نے ہنس کر کہا..... ”خوش قسمتی سے دنیا بھر کی عورتیں تمہارے ساتھ متفق نہیں ہیں۔“

میں نے کہا..... ”پھر غور کیا ہو گا جس کی سٹیشن پر جو کچھ بھی ملے گا وہی نگلنے کو دے دوں گی۔“

لیکن میں کہہ دیتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو سکے گا۔“

میرا جواب سن کر وہ کچھ دیر چپ چاپ دیکھتی رہی اور پھر کچھ ہنس کر بولی..... ”کیا میرا ایسا کر

سکتی ہوں؟ تمہیں یقین ہے؟“

میں نے کہا..... ”گویا اتنا سا بھی یقین تم پر نہیں ہے؟“

تو ٹھیک ہے، کہہ کر وہ پھر اپنی کھڑکی کے باہر جھانکتی ہوئی چپ چاپ بیٹھ گئی۔

اگلے ٹیشن پر راج لکشمی نے رتن کو بلا کر کھانے کے لئے جگہ کرادی اور اس کو حقد لانے کا حکم دے کر تھالی میں کھانے پینے کا تمام سامان سجا کر سامنے رکھ دیا دیکھا کہ اس سلسلہ میں کہیں ذرا سی بھی غلطی نہیں ہوئی ہے مجھے جو کچھ اچھا لگتا ہے وہ سب چن چن کر کھانے کے لایا گیا ہے۔

خنخ پر رتن نے بستر کر دیئے۔ اطمینان کے ساتھ کھانا ختم کر کے حقے کی منہ میں ڈال کر آرام سے آنکھیں موندنے کی تیاری کر رہا تھا کہ راج لکشمی بولی..... ”کھانے کی چیزیں اٹھالے جارتن اس میں سے جو اچھا لگے کھا لینا۔ ارے تیرے ذبے میں اگر اور بھی کوئی کھائے تو دے دینا۔“

لیکن رتن کو نہایت شرمسار اور پریشان دیکھ کر میں نے کچھ تعجب کے ساتھ پوچھا ”تم نے تو کچھ نہیں کھایا؟“

راج لکشمی بولی..... ”نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔ جانا رتن کھڑا کیوں ہے؟“

گاڑی چلے گی جو؟“

رتن شرم کے مارے گڑ گیا۔ ”مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی بابو، مسلمان قلی سے کھانا چھو گیا ہے۔“

کتنا ہی کہتا ہوں سٹیشن سے کچھ خرید لانے دو لیکن کسی طرح مانگی ہی نہیں۔“

اتنا کہہ کر اس نے میرے منہ پر اپنی بے صبر نگاہ ڈالی گویا میری رضامندی کا خواہشمند ہو۔

لیکن میرے کچھ کہنے سے پیشتر ہی راج لکشمی نے اسے دھماکا کر کہا..... ”تو جائے گا نہیں کھڑا

کھڑا بحث کرے گا۔“

رتن پھر کچھ نہ بولا اور کھانے کے برتن ہاتھ میں لے کر باہر چلا گیا۔ گاڑی چلتے ہی وہ میرے

سر ہانے آ بیٹھی اور سر کے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں چلاتے ہوئے بولی..... ”اچھا دیکھو.....“

درمیان میں ہی ٹوک کر بولا..... ”دیکھو گاہ پھر کبھی لیکن۔“

اس نے بھی مجھے اسی آن ٹوک کر کہا..... ”تمہیں لیکن، سے شروع کر کے لیکچر دینے کی

ضرورت نہیں میں سمجھ گئی ہوں۔ میں مسلمان سے نفرت نہیں کرتی اور یہ بھی نہیں جانتی کہ اس کے چھو لینے

اپنے ہی آرام کے لئے بھاگتا پھرتا ہے وہ گھر کی خبر جانے گا ہی کہاں ہے؟ تم جیسے لوگ ہی سماج کی بہت زیادہ برائی کرتے پھرتے ہیں جو سماج سے کوئی تعلق نہیں رکھتے بلکہ اس کی طرف سے ہمیشہ لاپرواہ رہتے ہیں۔ تم لوگ نہ تو اچھی طرح غیر سماج کو ہی جانتے ہو اور نہ اچھی طرح اپنے سماج ہی کو۔“

میں نے کہا..... ”اس کے بعد؟“

راج لکشمی بولی..... ”اس کے بعد باہر رہ کر ظاہرہ مجلسی نظام کو دیکھ کر تم لوگ سوچ میں سرے جاتے ہو کہ ہماری عورتیں مکان میں قید رہ کر دن رات کام کیا کرتی ہیں اس لئے ان کی مانند مصیبت زدہ، ان کی طرح مظلوم، ان جیسی حقیر شاید اور کسی ملک کی عورتیں نہیں ہیں لیکن کچھ دن محض ہماری فکر چھوڑ کر دیکھو۔ اپنے آپ کو کچھ اونچا اٹھانے کی کوشش کرو۔ اگر فی الواقعہ کہیں کچھ برائی ہوگی تو وہ اسی حالت میں نظر آئے گی۔ اس سے پیشتر نہیں۔“

”اس کے بعد؟“

راج لکشمی نے غصے سے کہا..... ”میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو لیکن میں مذاق کی بات نہیں کر رہی۔ گھر کی مالکن سب لوگوں سے خراب کھاتی پیتی ہے۔ کبھی کبھی تو نوکروں سے برا کھانا اسے ملتا ہے۔ اکثر نوکروں سے بھی زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے مگر اس تکلیف سے بے تاب ہو کر روتے مت پھرو۔ ہم لوگوں کو نوکرائی کی طرح ہی بنے رہنے دو غیر ممالک کی طرح رانی بنا ڈالنے کی کوشش مت کرو..... میں یہی بات تم سے کہتی ہوں۔“

میں نے کہا..... ”اگرچہ تم علم مباحثہ کو غرق کر دینے کی تجویز کر رہی ہو مگر پھر بھی یہ تسلیم کرتا ہوں کہ باقاعدہ بحث کرنے کی راہ مجھے بھی نہیں مل رہی۔“

اس نے کہا..... ”اس میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔“

میں نے جواب دیا..... ”ہو بھی تو وہ طاقت مجھ میں نہیں۔ بڑی نیند آرہی ہے۔ تمہاری بات ایک طرح سے سمجھ رہا ہوں۔“

راج لکشمی کچھ دیر خاموش رہ کر بولی..... ”ہمارے ملک میں خواہ کسی وجہ سے ہو چھوٹے بڑے اونچ نیچ سب لوگوں میں روپے کا لالچ بہت ہی بڑھ گیا ہے۔ کوئی بھی تھوڑے میں قناعت کرنا نہیں جانتا، چاہتا بھی نہیں۔ اور اس خرابی نے ہمیں کتنا نقصان پہنچایا ہے اس کا اندازہ مجھے ہو چکا ہے۔“

”بات سچ ہے لیکن تمہیں یہ اندازہ ہوا کس طرح؟“

راج لکشمی بولی..... ”روپے کی لالچ سے ہی تو میری یہ حالت ہوئی ہے لیکن زمانہ سلف میں شاید اتنا لالچ نہ تھا۔“

یہی خیریت ہے لیکن اپنی نسل کو اتنا حقیر سمجھتے ہوئے تمہیں ندامت محسوس نہیں ہوتی۔“

میرے اس طنز پر راج لکشمی نے کچھ خیال کیا یا نہیں اس میں شک ہے۔ وہ بہت ہی اطمینان سے بولی..... ”اس میں ندامت محسوس کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔“

میں نے کہا..... ”ہاں یہ ٹھیک ہے، ہم لوگ مالک ہیں اور تم نوکرائیاں، یہ اعتقاد اس ملک کی عورتوں کے دل میں یوں گھر کر چکا ہے کہ اس کا ہلکا پن بھی تمہاری نظر میں نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی گناہ کے بوجھ سے دنیا کے تمام ممالک کی عورتوں کی نسبت تم آج سچ عجیب چھوٹی ہو گئی ہو۔“

راج لکشمی کا ایک سخت ہو کر بیٹھ گئی اور دونوں آنکھوں کو روشن کر کے بولی ”تمہیں اس لئے نہیں۔ تمہارے ملک کی عورتیں اپنے آپ کو حقیر سمجھنے کی وجہ سے چھوٹی نہیں ہو گئی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تم ہی لوگوں نے انہیں چھوٹا سمجھ کر چھوٹا بنا دیا ہے۔ اور تم خود بھی چھوٹے ہو گئے ہو۔“

یہ بات اچانک مجھے کچھ نئی معلوم ہوئی اس میں جو ایک گہرا راز مضمر تھا وہ رفتہ رفتہ صاف ہونے لگا۔ فی الحقیقت اس میں بہت بڑی حقیقت پنہاں ہے جو آج تک میری نگاہوں سے اوجھل تھی۔

راج لکشمی بولی..... ”تم نے تو اس شریف انسان کے متعلق بھی مذاق کیا تھا لیکن اس کی بات سن کر میری آنکھیں کتنی کھل گئی ہیں یہ تم نہیں جانتے۔“

”نہیں جانتا“ یہ تسلیم کرتے ہی وہ کہنے لگی..... ”نہیں جانتے اس کی وجہ ہے کسی بھی شے کو جاننے کے لئے جب تک انسان کے دل کے اندر سے ایک قسم کی بے تابانی نہیں اٹھتی اس کی نگاہ دھندلی ہو رہتی ہے۔ ایک مدت سے تمہاری زبان سن کر سوچا کرتی تھی کہ سچ عجیب ہی اگر ہمارے ملک کے لوگوں کی مصیبتوں کی انتہا نہیں۔ سچ عجیب ہی اگر ہمارا سماج اتنا اندھا ہے تو اس میں انسان زندہ ہی کس طرح ہے اور اسے تسلیم کر کے چلتا ہی کیوں ہے؟“

میں چپ چاپ سن رہا ہوں یہ دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ کہنے لگی..... ”اور تم بھی کیوں سمجھو گے؟ کبھی ان لوگوں کے درمیان نہیں رہے کبھی ان لوگوں کے سکھ دکھ سے دو چار ہونے کا موقعہ نہیں ملا اس لئے باہر ہی باہر کی سوسائٹی کیساتھ ان کا مقابلہ کر کے سمجھتے ہو کہ ان لوگوں کی مصیبتوں کی شاید کوئی انتہا نہیں۔ دولت مند زمیندار پلاؤ کھایا کرتا ہے وہ اپنی کسی غریب آسامی کو بھات کھاتے دیکھ کر سوچتا ہے کہ اس کی مصیبت کی انتہا نہیں جس طرح وہ بھولتا ہے اسی طرح تم بھی بھولتے ہو۔“

میں نے کہا کہ تمہاری بحث اگرچہ بے قاعدہ اور بے سلسلہ چل رہی ہے تاہم میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے اس بات کو کس طرح جانا کہ مجھے ملک کے متعلق اس سے زیادہ علم نہیں ہے؟“

راج لکشمی نے کہا..... ”ہو ہی کیسے سکتا ہے؟ دنیا میں تم سے بڑھ کر خود غرض ملنا مشکل ہے۔ جو صرف

میں نے کہا۔ ”اس کے متعلق مجھے پوری پوری واقفیت نہیں۔“

وہ کہنے لگی۔ ”اتنا لالچ کبھی نہ تھا۔ اس وقت ماں روپے کے لالچ سے اپنی بیٹی کو اس راہ پر کبھی نہ دھکیلتی اس وقت مذہب کا ڈر تھا۔ آج تو مجھے روپوں کی کمی نہیں ہے لیکن میری طرح ستم رسیدہ بھی اور کوئی نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ راہ کا بھکاری بھی مجھ سے زیادہ سکھی ہے۔“

اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا۔ ”کیا سچ ہی تمہیں اتنی تکلیف ہے۔“

راج لکشمی ایک ساعت چپ رہ کر اور ایک بار آنچل سے آنکھیں اور منہ پونچھ کر بولی۔

میری بات میرے بھگوان ہی جانتے ہیں۔“

اس کے بعد دونوں ہی گم سم ہو رہے۔ گاڑی کی رفتار کم ہو کر وہ ایک چھوٹے سے شیشن پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے پھر چلنا شروع کیا میں نے کہا۔ ”کیا کرنے سے تمہاری باقی ماندہ زندگی آرام سے گزر سکتی ہے بتا سکتی ہو؟“

راج لکشمی نے جواب دیا۔ ”میں نے اپنا راستہ طے کر رکھا ہے میری تمام دولت اگر کسی طرح چلی جائے کچھ نہ رہے بالکل بے بس ہو جاؤں تو۔“

اب ہم پھر بالکل گم سم ہو رہے اس کی بات اتنی صاف تھی کہ ہر ایک سمجھ سکتا تھا۔ مجھے بھی سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ کچھ دیر چپ رہ کر پوچھا۔ ”یہ خیال تمہارے دل میں کب سے آیا؟“

راج لکشمی نے جواب دیا۔ ”جس دن ابھیا کی بات سنی اسی دن سے۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن ان لوگوں کا سفر زندگی تو درمیان میں ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ مستقبل میں کتنی تکالیف درپیش آ سکتی ہیں یہ تو تم جانتی نہیں۔“

وہ سر ہلا کر بولی۔ ”نہیں، جانتی نہیں یہ سچ ہے لیکن وہ کتنی ہی مصیبتیں برداشت کریں میری طرح دکھی کبھی نہ ہوں گے۔ یہ میں دعویٰ سے کہہ سکتی ہوں۔“

اور بھی کچھ دیر خاموش رہ کر میں نے پوچھا۔ ”لکشمی تمہارے لئے میں اپنا سب کچھ قربان کر سکتا ہوں لیکن اپنی عزت کو قربان کس طرح کروں؟“

راج لکشمی بولی۔ ”میں تو تم سے کچھ قربان کرنے کو نہیں کہتی۔ عزت ہی تو انسان کا اصلی جوہر ہے۔ اسے اگر قربان نہیں کر سکتے تو قربانی اور ایثار کا نام ہی زبان پر کیوں لاتے ہو؟ میں نے آپ سے کبھی کسی قسم کی قربانی کا مطالبہ نہیں کیا لیکن کیا کر سکتا ہوں۔ عزت چلے جانے کے بعد انسان کی زندگی

ایک مستقل عذاب بن جاتی ہے۔ صرف اسی ایک عزت کے علاوہ میں سب کچھ قربان کر سکتا ہوں۔“

راج لکشمی نے دفعہ ہاتھ کھینچ لیا اور کہا۔ ”میرے لئے تمہیں کچھ بھی قربان کرنا نہ پڑے گا

مگر تم کیا یہ سمجھتے ہو کہ محض تم لوگوں کی ہی عزت ہوتی ہے۔ ہماری کوئی عزت نہیں ہے ہم لوگوں کے لئے اسے قربان کر دینا کیا اتنا آسان ہے؟ تاہم تم لوگوں کے لئے ہی سینکڑوں ہزاروں عورتوں نے مٹی کے ایک ڈھیلے کی طرح اس کو پھینک دیا ہے۔

شاید تم اس کو نہیں جانتے لیکن میں جانتی ہوں۔“

میرے کچھ بولنے کی کوشش کرتے ہی اس نے روک کر کہا۔ ”رہنے دو اب اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کو ایک مدت سے میں نے جو سمجھ رکھا تھا وہ غلط تھا۔ تم سو جاؤ اب اس سلسلہ میں میں کچھ بھی نہ کہوں گی تم بھی نہ کہنا۔“ اتنا کہہ کر وہ اٹھی اور اپنی بیچ پر جا بیٹھی۔

دوسرے دن عین وقت پر کاشی آ پہنچا اور میں پیاری کے مکان پر ہی ٹھہراؤ پر کے دو کردوں کے علاوہ تمام کا تمام مکان مختلف عمر کی بیوہ عورتوں سے بھرا تھا۔

پیاری بولی۔ ”یہ سب میری کراہیہ دار ہیں۔“ اتنا کہہ کر وہ منہ پھیر کر کچھ ہنس دی۔

میں نے کہا۔ ”ہنسی کیوں؟ شاید کراہیہ ادا نہیں ہوتا۔“

پیاری بولی۔ ”نہیں بلکہ کچھ نہ کچھ اور دینا پڑتا ہے۔“

”اس کا مطلب؟“

پیاری اس دفعہ ہنس پڑی اور بولی۔ ”اس کا مطلب ہے عاقبت کی امید پر مجھ کو ہی انہیں کھانا کپڑا دے کر زندہ رکھنا زندہ رہیں گی تبھی تو دیں گی۔ اتنی معمولی بات بھی کیا سمجھ نہیں سکتے؟“

میں نے بھی ہنس کر جواب دیا۔ ”سمجھتا تو نہیں لیکن اس طرح مستقبل کی امید پر کتنے لوگوں کو تمہیں چپ چاپ کھانا کپڑا بہم پہنچانا پڑتا ہوگا؟ میں صرف یہی سوچ رہا ہوں۔“

”ان کے علاوہ وہ دو ایک میری رشتہ دار بھی ہیں۔“

”وہ بھی ہیں کیا؟ لیکن تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ رشتہ دار ہیں؟“

پیاری قدرے خوش ہنسی ہنس کر بولی۔ ”ان کے ساتھ آ کر اس کاشی میں ہی تو میری موت ہوئی تھی شاید تمہیں یہ یاد نہیں رہا پھر اس وقت جنہوں نے میری نجات کی تھی ان لوگوں کا احسان

زندگی بھر کیا بھول سکتی ہوں؟“

میں چپ ہو رہا۔ پیاری کہنے لگی۔ ”ان لوگوں کا دل بڑا رحیم ہوتا ہے اسی لئے پاس رہ کر ان پر ذرا کڑی نظر رکھتی ہوں تاکہ انہیں اور زیادہ احسان کرنے کا موقع نہ ملے۔“

اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہی یکایک میرے منہ سے نکل گیا۔ ”تمہارے دل کے اندر کیا ہے؟ کئی بار اسے چیر کر دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے راج لکشمی؟“

میں نے کہا..... ”تم نے میری زندگی ضرور بچائی ہے لیکن میں نہایت ہی حقیر انسان ہوں۔ راج لکشمی تمہارے ساتھ میرا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔“

راج لکشمی مضطرب لہجہ میں بولی..... ”زندگی بچائی ہے تو اپنی ہی غرض سے بچائی ہے۔ تمہاری غرض سے نہیں۔ اس کے لئے تمہیں ذرا سا بھی ممنون ہونے کی ضرورت نہیں لیکن میں تمہیں حقیر طبیعت کا انسان خیال نہیں کر سکتی۔ ایسا ہوتا تو آفت کثرتی۔ گلے میں پھانسی لگا کر جھگڑا ختم کر دیتی۔“ اتنا کہہ کر وہ میرے جواب کی راہ دیکھنے بغیر ہی کمرے سے باہر چلی گئی۔

دوسرے دن صبح راج لکشمی چائے دے کر چپ چاپ چلی جا رہی تھی کہ میں نے بلا کر کہا..... ”گفتگو بند ہے کیا؟“

وہ پینٹ کر کھڑی ہو گئی بولی..... ”نہیں تو، کچھ کہو گے؟“

میں نے کہا..... ”چلو ایک بار پریاگ گھوم آئیں؟“

”ٹھیک تو ہے جائے۔“

”تم بھی چلو۔“

”تمہارا اصرار ہے؟“

”نہیں چاہتیں؟“

”ضرورت ہوگی تو خود مانگ لوں گی۔“ اس وقت نہیں اتنا کہہ کر وہ اپنے کام سے چلی گئی۔ میرے منہ سے صرف ایک طویل آہ نکلی..... لیکن میں کچھ کہہ نہ سکا۔ دوپہر کے کھانے کے وقت میں نے ہنس کر کہا..... ”اچھا لکشمی مجھ سے بول چال بند کر کے کیا تم سے رہا جائے گا جو اس ناممکن کو ممکن کرنے کی کوشش کر رہی ہو؟“

راج لکشمی نے مطمئن اور سنجیدہ لہجہ میں کہا..... ”سامنا ہونے پر کسی سے نہیں رہا جاتا۔ مجھ سے بھی نہیں رہا جائے گا اس کے علاوہ میری یہ خواہش بھی نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا خواہش ہے؟“

راج لکشمی بولی..... ”میں کل سے ہی سوچ رہی ہوں اس کھینچا تانی کو ختم کئے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ تم نے بھی ایک طرح سے صاف صاف واضح کر دیا ہے اور میں بھی ایک طرح سے سمجھ گئی ہوں غلطی میری ہی ہے میں اس کو تسلیم کرتی ہوں۔ لیکن۔“

اچانک اسے رکتے دیکھ کر میں نے پوچھا..... ”لیکن، کیا؟“

راج لکشمی بولی..... ”لیکن کچھ بھی نہیں۔ میں جو ایک بے شرم سائل کی طرح التجا کرتی ہوئی

”مرنے پر دیکھ لینا۔ اچھا کمرے میں جا کر ذرا سو جاؤ۔ کھانا تیار ہونے پر اٹھا دوں گی۔ اتنا کہہ کر اور ہاتھ کے اشارہ سے کمرہ دکھا کر وہ زینے سے نیچے اتر گئی۔

میں اسی جگہ کچھ دیر کھڑا رہا یہ بات نہیں کہ آج میں نے اس کے دل کا کوئی نیا تعارف حاصل کیا تھا لیکن خود میرے اپنے دل میں یہ عام اور معمولی کہانی ایک نئے دور کی تخلیق کر گئی۔

رات کو پیاری بولی..... ”میں تمہیں تکلیف دے کر فضول اتنی دور لے آئی۔ گوردیو تیرے ہاتھ پر لے کر نکل گئے ہیں۔ ان سے بھی تمہیں ملانے کی۔“

میں نے کہا..... ”اس کے لئے مجھے کچھ بھی افسوس نہیں ہے اب تو کلکتہ لوٹنا ہوگا؟“

پیاری نے گردن ہلا کر کہا..... ”ہاں۔“

میں نے کہا..... ”کیا میرا ساتھ چلنا ضروری ہے؟ ضروری نہ ہو تو میں ذرا اور کچھ تم کی طرف

گھوم آنا چاہتا ہوں۔“

پیاری نے جواب دیا..... ”بنکو کی شادی میں تو اب بھی کچھ دنوں کی دیر ہے چلو نا میں بھی

پریاگ چل کر اشان کر آؤں۔“

میں کچھ مشکل میں پڑ گیا۔ میرے دور کے ایک چچا وہاں نوکری کرتے تھے سوچا تھا کہ ان کے پاس ہی ٹھہروں گا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی دوست احباب وہاں رہتے ہیں۔ پیاری نے فوراً میرے دل

کا جذبہ بھانپ کر کہا..... ”میں ساتھ رہوں گی تو شاید کوئی دیکھ لے گا۔ یہی نا؟“

بدحواس ہو کر کہا..... ”دراصل کلکتہ چیز ہی ایسی ہے کہ لوگ جھوٹے کلکتہ کا بھی خوف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔“

پیاری نے زبردستی ہنستے ہوئے کہا..... ”یہ ٹھیک ہے گزشتہ سال آ رہے ہیں تو تمہیں ایک طرح گود میں لئے ہی لئے میرے دن رات کئے تھے۔ خوش قسمتی سے اس طرف کسی نے تمہیں نہ دیکھا۔ اس

جگہ شاید تمہاری جان بچانے کا کوئی دوست رشتہ دار نہ تھا۔“

میں نے نہایت ہی شرمسار ہو کر کہا..... ”مجھ پر طعنہ زنی کرنا فضول ہے انسانیت کے لحاظ سے میں تمہاری نسبت بہت ہی حقیر ہوں اور اس بات کو میں نا منظور نہیں کرتا۔“

پیاری تیز لہجہ میں بول اٹھی..... ”طعنہ تمہیں طعنہ زنی کر سکوں یہی سوچ کر شاید میں وہاں گئی تھی کیوں؟ غور کرو جفا کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اس سے تجاوز نہ کرنا۔“

کچھ دیر خاموش رہ کر بولی..... ”بجا، کلکتہ ہی تو ہے لیکن تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو اس کلکتہ کو سر آنکھوں پر لے کر لوگوں کو بلا بلا کر دکھاتی پھرتی لیکن ایسی بات کبھی زبان پر نہ لاتی۔“

راج لکشمی میری خبر لینے کے لئے اسی ساز سنگھار کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ میں اچھل کر اس کی طرف داہنا ہاتھ پسار کر ڈرامائی لہجہ میں بولا..... ”اری دھوکہ باز رہتی! تو گوند لال کو نہیں پہچانتی۔ آہ آج اگر میرے پاس ایک پستول ہوتا یا ایک تلوار ہوتی۔“

راج لکشمی خشک لہجہ میں بولی..... ”تو کیا کرتے؟ خون؟“

ہنس کر بولا..... ”نہیں پیاری مجھے اتنا بڑا نوابی شوق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس بیسویں صدی میں ایسا سنگدل راکشش کون ہے جو دنیا کی اتنی بڑی مسرت کی دکان کو پتھر سے بند کر دے؟ بلکہ دعادیتا ہوں کہ کل کے رتن، تم طویل العمر ہو۔ تمہارا حسین و جمیل چہرہ فاتح عالم ہو۔ تمہارا لب و لہجہ کوئل کو شرمائے۔ تمہارے ان قدموں کا رقص روشنی وغیرہ کا غرور مٹی میں ملا دے..... اور میں دور کھڑا کھڑا تمہاری فتح کے نعروں سے آسمان کو گونجا دوں۔“

پیاری بولی..... ”ان سب باتوں کا مطلب؟“

میں نے کہا..... ”من آئمن کہ من دانم۔ اسے جانے دو۔ میں اسی ایک بجے کی گاڑی سے رخصت ہوتا ہوں۔ ابھی تو اللہ آباد جاؤں گا بعد از جاؤں گا بنگالیوں کے تیرتھ چاکرستان یعنی برما کو۔ اگر وقت اور مہلت ملی تو مل کر جاؤں گا۔“

”میں کہاں گئی تھی یہ سننا بھی ضروری نہیں سمجھتے؟“

”نہیں بالکل نہیں“

”یہ بہانا پا کر کیا تم ایک دم چلے جا رہے ہو؟“

میں نے کہا..... ”اس گنہگار منہ سے اب بھی کچھ نہیں کہہ سکتا اس گورکھ دھندے سے اگر پار

ہو سکوں تو.....“

پیاری کچھ دیر چپ چاپ کھڑی رہی اور بولی..... ”تم کیا مجھ پر جوجی چاہے وہی ظلم کر سکتے ہو؟“

میں نے کہا..... ”جوجی چاہے؟ بالکل نہیں بلکہ نادانستہ بھی اگر کبھی کچھ ظلم کیا گیا ہو تو اس کے

تمہارے پیچھے پیچھے گھومتی پھرتی ہوں.....“ اتنا کہہ کر اس نے یکا یک اپنے چہرے کو نفرت سے سکڑ لیا اور کہا..... ”لڑکا کیا سوچتا ہو گا۔ نوکر چاکر دل میں کیا کہتے ہوں گے۔ رام رام، گویا میں نے اس کو مذاق کا مضمون بنا ڈالا ہو۔“

کچھ دیر ٹھہر کر وہ کہنے لگی..... ”بڑھاپے میں یہ سب کیا مجھے اچھا لگتا ہے؟ تم اللہ آباد جانا چاہتے ہو۔ شوق سے جاؤ۔ پھر بھی اگر ممکن ہو تو بر مارو انہ ہونے سے پہلے ایک دفعہ ملاقات کر جانا۔“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

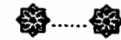
ساتھ ہی ساتھ میری بھوک بھی غائب ہو گئی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر آج پہلے ہی پہل مجھے معلوم ہوا کہ یہ سب دلجوئی کا معاملہ نہیں ہے سچ کچ اس نے کچھ نہ کچھ سوچ کر فیصلہ کر رکھا ہے۔ شام کے وقت آج ایک ہندوستانی خادمہ ناشتہ وغیرہ کا سامان لے کر آئی تو اس سے کچھ تعجب کے ساتھ پیاری کا حال دریافت کیا۔ جواب سن کر میں نے اور بھی زیادہ حیرت کے ساتھ جانا کہ پیاری گھر پر نہیں ہے۔ وہ ساز سنگھار کر کے فشن پر گئی ہے۔ فشن کہاں سے آئی۔ اسے ساز سنگھار کر کے جانے کی کیا ضرورت پڑی۔ کچھ بھی نہ سمجھا تو خود اس کی وہ بات یاد آ گئی کہ وہ کاشی میں ہی ایک دن مری تھی۔

یہ سچ ہے کہ کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا پھر بھی اس خبر سے دل پھیکا سا ہو گیا۔

شام ہوئی گھر گھر میں دیئے جلے لیکن راج لکشمی نہ لوٹی۔

کندھے پر چادر ڈال کر ڈراگھوم آنے کے لئے باہر نکل پڑا۔ راستے راستے چکر کاٹتا ہوا بہت کچھ دیکھتا سنتا رات کے دس بجے کے بعد مکان پر لوٹا تو سنا کہ پیاری ابھی تک لوٹ کر نہیں آئی۔ معاملہ کیا ہے؟ کچھ خوف سا معلوم ہونے لگا۔ سوچ ہی رہا تھا کہ رتن کو بلا کر پریشانی دور کرنے کے لئے کچھ پوچھوں یا نہ پوچھوں کہ ایک بھاری جوڑی کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ کھڑکی میں سے جھانکا تو دیکھا ہوں ایک بڑی بھاری فشن مکان کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی ہے۔

پیاری اتر کر آئی۔ چاند کی روشنی میں اس کے جسم کے جراؤں پر زور جھملا اٹھے جو دشریف آدی فشن میں بیٹھے تھے جیسی آواز سے معلوم ہوا کہ پیاری کو مخاطب کر کے کچھ کہہ رہے تھے جس کو میں سن نہ سکا۔ وہ بنگالی ہیں یا بھاری یہ بھی جان نہ سکا۔ چاکر کھا کر گھوڑے چشم زدن میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔



لئے معافی چاہتا ہوں۔“

اس کا مطلب، آج رات کو ہی تم چلے جاؤ گے؟“

”ہاں“

”کیا بلا تصور ہی مجھے سزا دینے کا تمہیں حق حاصل ہے؟“

”نہیں رتی بھر بھی نہیں لیکن میرے جانے کو ہی تم سزا دینا، سمجھتی ہو تو وہ حق مجھے ضرور حاصل ہے۔“

پیاری نے فوراً کوئی جواب نہ دیا میرے منہ کی طرف چند لمحے چپ چاپ دیکھتے رہ کر کہا۔

”میں کہاں گئی تھی؟ کیوں گئی تھی، نہیں سنو گے؟“

”نہیں میری رائے لے کر تو تم وہاں گئی نہیں تھیں جو واپس آ کر اس کا حال سناؤ گی۔ اس کے

علاوہ ان باتوں کے لئے نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ خواہش۔“

پیاری زخم خوردہ ناگن کی طرح یکا یک پھٹکارا بھی۔۔۔۔۔ ”میری بھی سنانے کی خواہش نہیں ہے۔ میں

کسی کی زر خرید لوٹنی نہیں ہوں کہ کہاں جاؤں اور کہاں نہ جاؤں۔ اس کی اجازت لیتی پھروں۔ جاتے ہو

جاؤ۔“ یوں کہہ کر اپنے حسن اور غمزوں کا ایک طوفان اٹھا کر وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر ہو گئی۔

نوکر گاڑی بلانے گیا۔ کوئی گھنٹہ بعد صدر دروازے پر ایک گاڑی کے کھڑے ہونے کی آواز

سن کر بیگ ہاتھ میں لے کر جا ہی رہا تھا کہ پیاری آ کر پیچھے کھڑی ہو گئی بولی۔۔۔۔۔ ”اسے کیا تم بچوں کا

کھیل ہی سمجھتے ہو؟ اکیلی چھوڑ کر چلے جاؤ گے تو نوکر چا کر کیا خیال کریں گے۔ تم کیا ان لوگوں کے سامنے

بھی مجھے منہ دکھانے کے قابل نہ رہنے دو گے؟“

مڑ کر کھڑے ہو کر کہا۔۔۔۔۔ ”اپنے نوکروں کے ساتھ خود ہنسی رہنا۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔“

”نہ ہونہ سہی لیکن لوٹ کر میں بنکو کو ہی کیا جواب دوں گی؟“

”یہی جواب دے دینا کہ وہ پچھتم کی طرف گھومنے چلے گئے ہیں۔“

”اس پر کیا کوئی اعتبار کرے گا؟“

”جس پر اعتبار کیا جاسکے ایسی ہی کوئی بات بنا کر کہہ دینا۔“

پیاری دم بھر خاموش رہ کر بولی۔۔۔۔۔ ”اگر کوئی بے انصافی ہی کر بیٹھی ہوں تو کیا وہ معاف نہیں

ہو سکتی۔ تم معاف نہ کرو گے تو اور کون کرے گا؟“

میں بولا۔۔۔۔۔ ”پیاری یہ تو ایک زر خرید لوٹنی کی سی بات ہوئی۔ تمہاری زبان سے تو یہ زیب

نہیں دیتی۔“

اس طنز کا پیاری کا ایک کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ چپ چاپ کھڑی

رہی۔ یہ صاف معلوم ہو گیا کہ وہ انتہائی کوشش سے اپنے آپ کو سنبھال رہی ہے۔ باہر سے گاڑی بان

نے چلا کر تاخیری وجہ پوچھی میرے چپ چاپ بیگ ہاتھ میں لیتے ہی پیاری دھم سے میرے پاؤں کے

قریب بیٹھ گئی اور بھاری لہجہ میں بولی۔۔۔۔۔ ”میں سچ مچ کا تصور کبھی کر ہی نہیں سکتی۔ یہ جانتے ہوئے بھی

اگر تم سزا دینا چاہتے ہو تو اپنے ہاتھ سے دو لیکن گھر بھر کے لوگوں کے سامنے میرا سر نیچا نہ کرو۔ اگر آج تم

اس طرح چلے جاؤ گے تو میں اب کسی کے سامنے اپنا سر اونچا کر کے کھڑی نہ ہو سکو گی۔“

ہاتھ کا بیگ نیچے رکھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔۔۔۔۔ ”اچھا آج ہمارے تمہارے درمیان

آخری فیصلہ ہو جائے۔ تمہارا آج کا سلوک میں نے معاف کر دیا۔ لیکن میں نے خوب سوچ کر دیکھ لیا

ہے کہ ہم دونوں کا ملنا جلنا اب ممکن نہیں۔“

پیاری نے اپنا افسردہ چہرہ میرے منہ کی طرف اٹھا کر ڈرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیوں؟“

میں نے کہا۔۔۔۔۔ ”تلخ حقیقت کو برداشت کر سکو گی؟“

لیکن کسی انسان کی روحانی آزار برداشت کرنے کے لئے تیار ہوتے دیکھ کر آزار پہنچانے کا

کام نہیں ہو جاتا۔ مجھے بہت دیر تک چپ چاپ بیٹھ کر سوچنا پڑا پھر بھی میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج کسی بھی

طرح اپنا ارادہ نہیں بدلوں گا اور اسی لئے بالآخر میں نے آہستہ سے کہا۔۔۔۔۔ ”لکشمی تمہارا آج کا برتاؤ

معاف کرنا خواہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو میں نے معاف کر دیا۔ لیکن تم خود اس لالچ کو کسی طرح بھی چھوڑ

نہ سکو گی۔ تمہارے پاس بہت سادھن دولت ہے۔ بہت زیادہ حسن اور اعلیٰ پایہ کافن ہے۔ کافی لوگوں پر

تمہارا اثر اور رسوخ ہے۔ دنیا میں اس سے بڑھ کر لالچ کی شے اور کیا ہو سکتی ہے؟ تم مجھے پیار کر سکتی ہو۔

مجھ سے عقیدت بھی کر سکتی ہو۔ میرے لئے کئی تکالیف بھی برداشت کر سکتی ہو لیکن اس لالچ کو کسی طرح

بھی کاٹ نہیں سکو گی؟“

راج لکشمی نے شیریں گلے سے کہا۔۔۔۔۔ ”یعنی اس طرح کا سلوک میں درمیان میں گاہے

بگا ہے کیا کروں گی۔“

جواب میں میں صرف خاموش رہا۔ وہ خود بھی کچھ دیر چپ رہ کر بولی۔۔۔۔۔ ”اس کے بعد؟“

”اس کے بعد تاش کے مکان کی طرح ایک دن سب گر جائے گا۔ اس دن کی بربادی سے تو

یہ بہتر ہے کہ آج ہی مجھے ہمیشہ کے لئے رہائی دے دو۔ میری یہی التجا ہے۔“

پیاری بہت دیر تک منہ نیچا کئے چپ چاپ بیٹھی رہی اس کے بعد جب اس نے منہ اٹھایا تو

دیکھا اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ اسے آنچل سے پوچھ کر پوچھا۔

”کیا میں نے کبھی تمہیں حقیر کام کرنے کے لئے مجبور کیا ہے؟“

بہتے ہوئے ان آنسوؤں نے میرے ضبط پر ایک کاری چوٹ کی۔ لیکن میں نے اس کو ظاہر ہونے نہ دیا۔ اطمینان سے مستحکم لہجہ میں کہا..... نہیں کسی دن نہیں۔ تم خود حقیر نہیں ہو کوئی حقیر کام خود بھی نہیں کر سکتیں اور دوسرے کو بھی کرنے نہیں دے سکتیں۔“

پھر کچھ ٹھہر کر کہا..... ”مگر دنیا تو منا پڈٹ کی پاٹھ شالا کی اس راج لکشمی کو پہچانے کی نہیں۔ وہ تو پہچانے کی صرف بیٹے کی مشہور و معروف پیاری بانی کو۔ اس وقت دنیا کی نظروں میں کتنا چھوٹا اور حقیر ہو جاؤں گا کیا تم اس کا تصور کر سکتی ہو؟ بتاؤ تم اس کو کس طرح روکو گی؟“

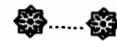
راج لکشمی نے ایک طویل آہ بھر کر کہا..... ”لیکن اسے تو فی الحقیقت چھوٹا ہونا نہیں کہتے۔“ میں نے کہا..... ”بھگوان کی نظر میں نہ ہو لیکن دنیا کی نظروں کو بھی تو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لکشمی۔“ راج لکشمی نے کہا..... ”ایک طرح سے تو یہ بات سچ ہے لیکن ان کی نظر تو ہمیشہ نظر نہیں آتی اور پھر جو نظر دنیا میں دس انسانوں کے اندر سے دیکھتی ہے وہ بھی تو بھگوان کی نظر ہے۔“

”راج لکشمی اس بات سے انکار کرنا بھی تو ظلم ہے۔“ اسی ڈر سے تم مجھے زندگی بھر کے لئے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟“ میں نے کہا..... ”پھر ملوں گا تم کہیں بھی کیوں نہ ہو۔ بر ما جانے سے پیشتر میں ایک دفعہ اور بھی تم سے مل جاؤں گا۔“

راج لکشمی تیزی کے ساتھ سر ہلا کر گریہ آمیز لہجہ میں کہہ اٹھی..... ”جاتے ہو تو جاؤ لیکن مجھے خواہ کچھ بھی کیوں نہ سمجھو مجھ سے بڑھ کر تمہارا اپنا کوئی نہیں ہے۔ مجھ کو چھوڑ کر چلے جانا دس آدمیوں کی نگاہوں میں دھرم ہے اس بات کو میں کسی بھی حالت میں تسلیم نہ کروں گی۔“ اتنا کہہ کر وہ تیزی سے کمرہ چھوڑ کر چلی گئی۔

گھڑی نکال کر دیکھا اب بھی وقت تھا۔ اب بھی شاید ایک بجے کی گاڑی مل جائے چپ چاپ بیٹھ کر آہستہ سے اتر کر میں گاڑی میں جا بیٹھا۔ لالچ کے انعام سے گاڑی نے پوری رفتار کے ساتھ دوڑ کر اسٹیشن پہنچا دیا۔ لیکن اسی لمحہ گاڑی نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آدھ گھنٹہ بعد ہی ایک ٹرین کلکتے کی طرف جائے گی۔ سوچا چلو یہی اچھا ہے۔ بہت دنوں سے گاؤں کی شکل نہیں دیکھی..... اس سنان جنگل میں ہی جا کر باقی کے کچھ دن کاٹ دوں۔

اس لئے مغرب کی بجائے مشرق کا ٹکٹ خرید کر آدھ گھنٹے بعد ایک مخالف سمت کو جانے والی دھوئیں کی گاڑی میں بیٹھ کر کاشی سے چل دیا۔



بہت دنوں بعد پھر ایک دن شام کے وقت گاؤں میں داخل ہوا میرا مکان اس وقت حقیقی رشتہ داروں اور ان کے رشتہ داروں سے بھرا تھا۔ بڑے مزے سے تمام گھر کو گھیرا کر انہوں نے اپنی گھر گستی پھیلا رکھی تھی۔ کہیں سوئی رکھنے کے لئے بھی جگہ نہ تھی۔

میرے یکا یک آ جانے سے اور وہاں کچھ دن قیام کرنے کے ارادے کو سن کر خوشی کے مارے ان کا چہرہ سیاہ پڑ گیا کہنے لگے..... آہا یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ اس بار شادی کر کے دنیا دار بن جاؤ شری کانت! ہم لوگ دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لیں۔“

میں نے کہا..... ”اسی لئے تو آیا ہوں۔ اس وقت کم از کم میری ماں کا کمرہ خالی کر دو میں اپنے پاؤں پسار گزرالیت رہوں۔“

میرے پتا کی موسیری بہن کچھ دنوں سے اپنے شوہر اور اپنے بیٹے کے ساتھ یہاں رہ رہی تھی آ کر بولی..... ”ٹھیک تو کہتے ہو۔“

میں نے کہا..... ”اچھا اچھا نہ ہو تو میں باہر کے کمرے میں ہی پڑ رہوں گا۔“ جا کر دیکھا ایک کونے میں سرخی اور ایک کونے میں چونے کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اس کے بھی مالک بولے..... ”ٹھیک تو ہے دیکھتا ہوں کہ یہ سب چیزیں تو ذرا دیکھ سن کر ہنسی پڑیں گی لیکن کمرہ تو چھوٹا نہیں ہے۔ تب تک نہ ہو تو اس کنارے ایک تختہ پوش بچھا کر..... کیا کہتے ہو شری کانت!“

میں نے کہا..... ”اچھا، رات بھر کے لئے نہ ہو تو یہی سہی۔“ درحقیقت میں اتنا سمجھا..... گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا جہاں بھی ہو ذرا سی جگہ سونے کے لئے مل جائے تو جان میں جان آ جائے۔ برما کی اس بیماری کے بعد اب تک جسم مکمل طور پر صحت یاب اور طاقتور نہیں ہو سکا تھا۔ اندر ہی اندر ایک طرح کی کمزوری محسوس ہوتی تھی اس لئے شام کے بعد جب سر درد کرنے لگا تو کوئی خاص توجہ نہ ہوا۔

نئی بنی ہوئی بہن نے آکر کہا..... ”ارے یہ تو ذرا گرمی سی چڑھ گئی ہے۔ بھات کھا کر سونے سے ہی چلی جائے گی۔“

یہی ہوگا۔ وہی ہوا۔ بزرگوں کا حکم مان کر گرمی دور کرنے کے لئے بھات کھا کر لیٹ گیا لیکن صبح نیند ٹوٹی خوب اچھی طرح بخار لئے ہوئے۔

دیدہ نے جسم پر ہاتھ رکھ کر کہا..... ”کچھ نہیں یہ تو میرا ہے اس بخار میں کھانا کھایا جاسکتا ہے۔“
اب ہاں میں ہاں نہ ملا سکا بولا..... ”نہیں جیجی میں اب تک تمہارے میسر یا راجا کی رعایا نہیں بنا ہوں۔ ان کی دوہائی دے کر ظلم کیا جانا شاید میں برداشت نہ کر سکوں۔ آج میرا اتفاق ہے۔ تمام رات گزری، دوسرا دن گزرا اس کے بعد دن بھی کٹ گیا۔ لیکن بخار نے پیچھا نہ چھوڑا بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ بڑھتے دیکھ کر دل میں پریشان ہوا تھا۔ گوند ڈاکٹر دونوں وقت دیکھنے آئے نبض پکڑ کر زبان دیکھ کر پیٹ ٹٹول کر خوش ذاتقہ دوائیاں تجویز کر کے صرف لاگت کے دام لینے لگے لیکن ایک ایک دن کر کے پورا ہفتہ اسی طرح گزر گیا۔ میرے پتا کے ماما..... میرے بابا آ کر بولے..... ”اسی لئے تو بھیا میں کہتا ہوں کہ وہاں خبر بھیج دو۔ تمہاری بو اکو آ جانے دو۔ بخار تو گویا.....“

بات پوری نہ ہونے پر بھی میں سمجھ گیا کہ بابا کچھ مشکل میں پڑ گئے ہیں اسی طرح اور بھی چار پانچ دن گزر گئے لیکن بخار کو کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اس دن صبح گوند ڈاکٹر نے آ کر حسب معمول دوائی دے کر تین دن کے بقایا ”لاگت کے دام، مانگے بستر میں لیٹے لیٹے کسی طرح ہاتھ بڑھا کر اپنا بیگ کھولا دیکھا تو منی بیگ غائب ہے۔ نہایت ہی متفکر ہو کر میں اٹھ بیٹھا۔ بیگ الٹا کر ہر ایک شے الگ الگ کر کے تلاش کی۔ لیکن جو نہیں تھا وہ نہ ملا۔“

گوند ڈاکٹر معاملہ تازہ کر اور فکر مند ہو کر بار بار سوال کرنے لگے..... ”کچھ کھو گیا ہے کیا؟“

میں نے کہا..... ”نہیں کچھ بھی نہیں گیا۔“
لیکن جب ان کی دوائی کی قیمت میں ادا نہ کر سکا تو وہ سمجھ گئے حیران ہو کر کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد انہوں نے پوچھا..... ”تھے کتنے؟“

”کچھ تھوڑے سے“

”چابی کو ذرا احتیاط سے رکھنا چاہئے بھیا! خیر کوئی مضائقہ نہیں تم غیر نہیں ہو۔ فکر نہ کرنا۔ اچھا ہو جاؤ گے اس کے بعد جب سہولت ہو بھیج دینا۔ علاج میں کوئی کمی نہ ہوگی۔“ اتنا کہہ کر ڈاکٹر غیر ہوتے ہوئے بھی یگانوں سے بڑھ کر تشفی دے کر چلے گئے ان سے کہہ دیا کہ..... ”یہ بات کوئی سن نہ پائے۔“
ڈاکٹر صاحب بولے..... ”اچھا اچھا دیکھا جائے گا۔“

دیہات میں یقین پر روپے قرض دینے کا رواج نہیں ہے۔ روپیہ ہی کیوں ایک چونی بھی خالی ہاتھ قرض مانگ لینے پر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ آدمی خالص مذاق کر رہا ہے کیونکہ اس بات کا دیہاتی لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ دنیا میں اتنا کم عقل بھی کوئی ہے جو خالی ہاتھ قرض طلب کرتا ہے۔ اس لئے میں نے یہ کوشش ہی نہ کی۔ پہلے ہی فیصلہ کر رکھا تھا کہ اس کی اطلاع راج لکشی کو نہیں دوں گا۔ ذرا تندست ہو جاؤں تو جو ہو سکے گا کروں گا۔ دل میں یہی ارادہ تھا کہ بھیا کو خط لکھ کر روپے منگوا لوں گا لیکن اس کے لئے موقع نہ ملا۔ اچانک علاج معالجہ اور تیماری داری کا سر بھی دھیمہ پڑتے ہی میں سمجھ گیا کہ میری مصیبت کی بات گھر میں پوشیدہ نہیں رہی۔

حالات کا ایک مختصر سا ذکر کر کے راج لکشی کو خط تو ضرور لکھا لیکن اس سے میں اپنے آپ کو حقیر و ذلیل ہوتا ہوا محسوس کرنے لگا اور اسے بھیج نہ سکا۔ پھاڑ کر پھینک دیا۔ دوسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا لیکن اس کے بعد کے دن نے کسی طرح بھی کٹنا نہ چاہا۔ اس دن کسی طرف سے کوئی راستہ نہ دیکھ کر بالآخر جان پر کھیل کر ہی کچھ روپوں کے لیے راج لکشی کو خط لکھ کر پٹنہ اور کلکتہ کے پتوں پر بھیج دیا۔

وہ روپے بھیجے گی۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں تھا تاہم اس دن صبح سے ہی ایک قسم کے تشویش آمیز شے سے ڈاکیئہ کی آمد کے انتظار میں سامنے کی کھلی کھڑکی کی راہ اوپر نظر جمائے خود پڑا رہا۔

وقت نکل گیا۔ آج اب اس کی امید نہ رہی۔ یہ سوچ کر کروٹ بدلنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اسی وقت دور ایک گاڑی کی آواز سے حیران ہو کر تکیے پر بارڈال کر اٹھ بیٹھا۔ گاڑی آ کر عین سامنے ہی کھڑی ہو گئی دیکھتا ہوں کہ جوان کی بغل میں رتن بیٹھا ہے۔ اس کے نیچے اتر کر گاڑی کے دروازہ کھولتے ہی جو نظر آیا اس کو سچ سمجھ کر یقین کرنا مشکل ہو گیا۔

دن کے وقت بہ نفس نفیس گاؤں کے راستہ پر راج لکشی آ کر کھڑی ہو سکتی ہے۔ یہ میرے تصور سے بھی بعید تر تھا۔

راج لکشی نے ایک بار صرف میرے من کی طرف دیکھا۔ گاڑی بان بولا..... ”ماں! کیا گھوڑا کھول دوں؟ دیر لگے گی؟“

”ذرا ٹھہرو“ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ پر نام کر کے قدموں کی خاک پیشانی پر لگا کر اور ہاتھ سے پیشانی اور سینے کا بخار دیکھ کر کہا..... ”اس وقت تو اب بخار نہیں ہے۔ شام سات بجے کی گاڑی سے جانا ہو سکے گا؟ گھوڑے کھول دینے کو کہہ دوں؟“

”نہیں پٹنہ سے۔ وہیں تمہارا خط ملا تھا۔“

”مجھے کہاں لے جاؤ گی..... پٹنہ؟“

راج لکشمی نے کچھ سوچ کر کہا..... ”ایک بار تو وہاں تمہیں جانا ہی پڑے گا پہلے کلتے چلے چلیں..... وہاں تمہیں دکھالوں اس کے بعد تندرست ہونے پر.....“

راج لکشمی بولی..... ”وصیت کی تو وہیں رجسٹری کرانی پڑے گی لکھا پڑھی ایک طرح سے سب مکمل کر آئی ہوں۔ لیکن تمہارے حکم کے بغیر تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا؟“

نہایت حیرت کے ساتھ پوچھا ”کس بات کی وصیت؟ کس کے نام؟“

راج لکشمی بولی..... ”مکان تو دونوں بنکو کو دیئے ہیں۔ صرف کاشی کا مکان گورو دیو کو دینے کا ارادہ ہے اور کمپنی کے کاغذات، زیورات وغیرہ کا حصہ بخر ا ابھی اپنی عقل کے مطابق کر آئی ہوں۔ اب صرف تمہارے حکم کی.....“

میری حیرت کی حد نہ رہی بولا..... ”اس حالت میں تمہارا خود کا کیا رہا؟ بنکو اگر تمہارا بار اٹھانا نہ چاہے؟ اب اس کی اپنی خانداری ہو گئی ہے اس لئے آخر کار وہ بھی تمہیں کھانے کو نہ دے تو؟“

”کیا میں یہ چاہتی ہوں؟..... اپنا سب کچھ دے کر کیا اس کے ہاتھ کا دیا کھاؤں گی؟ تم بھی خوب ہو؟“

اب اور صبر نہ رہا اٹھ کر اور خفا ہو کر بولا..... ”ہر شے دیکھ کر یہ بری صلاح تمہیں کس نے دی؟ روؤ گی کیا؟ بڑھاپے میں کس کے گلے کا ہار بننے جاؤ گی؟“

راج لکشمی بولی..... ”تمہیں خفا ہونے کی ضرورت نہیں ہے تم لیٹ جاؤ جس نے مجھے یہ عقل دی ہے وہی مجھے کھانے کو دے گا۔ میں ہزار بوڑھی ہو جاؤں گی وہ مجھے کبھی بوجھ نہ سمجھے گا۔ تم فضول سروردی مت کرو..... آرام سے لیٹے رہو۔“

میں آرام سے لیٹ رہا۔ مقابل کی کھلی کھڑکی سے غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنوں سے رنگین آسمان عجیب و غریب سا منظر آیا کسی جو خواب کی طرح اسی کی طرف دیکھتے دیکھتے ایسا محسوس ہوا گویا ایک بے مثال حسن اور کیف کے چشمہ میں تمام دنیا ہی جا رہی ہے۔ تمام دنیا کے رنج والام دکھ درد، بغض اور حسد اب مٹ چکے ہیں۔

اس خاموشی میں مجھ دونوں نے کتنا وقت گزار دیا سمجھتا ہوں کہ اس کا کسی نے حساب نہیں رکھا۔ ذہن دروازے کے باہر انسانی لب و لہجہ سن کر ہم دونوں بھی چونک پڑے اور راج لکشمی کے کھات سے اٹھنے کے پہلے

میں دم بخود اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا بولا..... ”دودن بے بخار آنا تو بند ہے لیکن کیا مجھے آج ہی لے جانا چاہتی ہو؟“

راج لکشمی بولی..... ”نہ ہو تو آج رہنے دو۔ رات چلنے کی ضرورت نہیں۔ سردی لگ سکتی ہے۔ کل صبح ہی چلیں گے۔“

اتنی دیر میں گویا ہوش میں آ گیا بولا..... ”اس گاؤں میں اس محلے کے درمیان تم آئیں کس حوصلہ پر؟ کیا تم یہ سوچتی ہو کہ یہاں تمہیں کوئی بھی پہچان نہ سکے گا؟“

راج لکشمی نے بلا تردد کہا..... ”پہچان لیں یہیں تو میں پیدا ہوئی۔ بڑی ہوئی اور یہیں لوگ مجھے پہچان نہ سکیں گے؟ جو دیکھے گا وہی پہچان لے گا۔“

”تو“

”کیا کروں بتاؤ؟ میری تقدیر اور نہ تم یہاں آ کر بیمار کیوں پڑتے۔“

”آئیں کیوں؟ روپے منگائے تھے۔ روپے بھیج دینے سے ہی کام چل جاتا۔“

”یہ کیا کبھی ممکن ہے؟ ایسی بیماری کی خبر سن کر کیا صرف روپے بھیج کر ہی خاموش رہ سکتی ہوں؟“

میں نے کہا..... ”تمہیں تو شاید اطمینان نصیب ہو گیا لیکن مجھے تو پریشان کر دیا۔ ابھی جب سب لوگ یہاں آئیں گے تو تم اپنا منہ کس طرح دکھاؤ گی اور میں ہی کیا جواب دوں گا؟“

راج لکشمی نے جواب میں صرف ایک بار اور اپنی پیشانی کو چھو کر کہا..... ”جواب اور کیا دو گے؟ میری تقدیر!“

اس کی لاپرواہی اور بے فکری سے متاثر ہو کر بولا..... ”تقدیر تو ٹھیک ہے لیکن لاج اور شرم کیا ایک بار ہی چاٹ گئی ہو؟ یہاں منہ دکھاتے بھی تمہیں ہچکچاہٹ نہ ہوئی۔“

راج لکشمی نے ویسے ہی اداس لہجہ میں جواب دیا..... ”میری لاج شرم جو کچھ ہے وہ اس وقت صرف تم ہی ہو۔“

اس کے بعد اب میں اور کہوں ہی کیا..... سنوں بھی کیا۔ آنکھیں موند کر چپ چاپ لیٹ رہا۔

کچھ دیر بعد پوچھا..... ”بنکو کی شادی بخیریت ہو گئی؟“

راج لکشمی بولی..... ”ہاں“

”اب کہاں سے آ رہی ہو؟ کلتے سے؟“

ہی ڈاکٹر صاحب سرور بابا کے ساتھ اندر داخل ہوئے لیکن اس پر نگاہ پڑتے ہی وہ رک کر کھڑے ہو گئے۔ بابا دوپہر کے وقت جب دن کی نیند سے لطف اندوز ہو رہے تھے اس وقت یہ خیران کے کانوں میں ضرور پڑی تھی کہ کوئی عزیز کلکتے سے گاڑی لے کر میرے پاس آیا ہے لیکن وہ کوئی عورت ہو سکتی ہے یہ شاید کسی کے تصور میں بھی نہیں آیا تھا۔ اسی لیے شاید ابھی تک گھر کی مستورات بھی باہر نہیں آئی تھیں۔

بابا جی نہایت تیز فہم تھے۔ انہوں نے کچھ دیر راج لکشمی کے جھکے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا..... ”یہ لڑکی کون ہے شری کانت! کچھ پہچانی ہوئی سی معلوم ہوتی ہے۔“

ڈاکٹر صاحب بھی ان کی تائید میں کہہ اٹھے..... چھوٹے کا کا، مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انہیں کہیں دیکھا ہے۔“..... میں نے ترجمہی نظر سے دیکھا۔ راج لکشمی کا تمام چہرہ مردے کی مانند فق ہو گیا۔ اسی لمحہ کوئی میرے دل کے اندر سے بول اٹھا شری کانت! اس مجسم ایثار عورت نے محض تمہارے لئے ہی یہ رضا و رغبت یہ مصیبت اپنے سر پر اٹھا رکھی ہے۔ یکبارگی میرے تمام جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے دل ہی دل میں کہا مجھے سچائی سے غرض نہیں میں آج حق و باطل کی تمیز بالائے طاق رکھ کر اسے سر آنکھوں پر لوں گا اور دوسرے ہی لمحہ اس کے ہاتھوں کو ذرا دبا کر کہہ بیٹھا..... ”تم اپنے شوہر کی خدمت کرنے آئی ہو تمہیں شرم کس بات کی ہے۔ راج لکشمی! یہ بابا اور ڈاکٹر صاحب ہیں۔ ان کو پر نام کرو۔“ چشم زدن میں دونوں آنکھیں چارہ ہوئیں اس کے بعد اس نے اٹھ کر زمین پر سر ٹیک کر دونوں کو پر نام کیا۔

